کتاب کے متعلق

--- اگر آپ اس کتاب کو درمیان سے پڑھیں گے تو شروع سے آخر تک پڑھیں گے' اگر آخر سے پڑھیں گے تو شروع سے پڑھیں گے' اگر شروع سے پڑھیں گے' تو پھر آخر تک پڑھیں گے ایسا نہیں ہوگا کہ آپ نہیں پڑھیں گے - تعلیم ایک خشک عنوان ہے - ان مضامین کو اتنا دلچسپ بنانا اور اتنی شگفتہ اردو میں لکھنا مصنف کے بے پناہ جذبہ اخلاص کا نتیجہ ہے - بے شک یہہ کتاب اردو داں طبقہ میں تعلیمی انقلاب لا کر رہے گی- (پروفیسر عبدالسلیم اور دوسرے)

--- تعلیم پر بلاشبہ یہہ پہلی کتاب ہے جو عمل پر اس حد تک آمادہ کرتی ہے کہ پڑھنے والے کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی- (ایڈیٹر ''آموزگار'' مہاراشٹرا)

--- یہہ مضامین تعلیم کے میدان میں مصنف کے پچاس سالہ تجربات کا نچوڑ ہیں- تعلیم کے عملی پہلوؤں پر ایسے دلچسپ مضامین کبھی دیکھنے میں نہیں آئے - اس میدان میں ان کا کوئی رقیب نظر نہیں آتا- (محمود بن محمد - سابق سفیر ہند برائے سعودی عرب)

--- مصنف نے اپنے لئے ایک ممتاز ماہر تعلیم اور دانشور کا مقام حاصل کرلیا ہے- تعلیم اور اردو زبان کی خدمت کا سہرا آپ کے سر ہے-
(سید ہاشم علی اختر - سابق وائس چانسلر عثمانیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

--- سوا سو برس قبل ہندوستان میں سر سیدؒ کے تعلیمی مشن کو حالیؒ اور ذاکر حسین نے جاری رکھا- موجودہ دور میں سید حامد میر کارواں کی سرکردگی میں سارے ملک میں ''تعلیمی کاروان'' چل پڑا جس کا مشن ، تعلیم ، صحت ' اصلاح معاشرہ اور ملک میں بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنا ہے- یہہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے - اس کی پکار جہاد کی سی للکار ہے (مختلف دانشور)

--- ٹیچرس ' پرنسپل ، تعلیمی انتظامیہ کے اراکین ' دانشوران اور قائدین قوم ٹریننگ کالجس کے طلبہ ماں باپ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ تعلیمی فکر میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے - اگر آپ اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے خواہاں ہیں تو یہ کتاب ایک مرتبہ ضرور دیکھ ڈالئے طلبہ کو انعامات میں دینے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں-

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے
کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

حالیؔ

تعلیم - ایک تحریک، ایک چیلنج

(تعلیم کے عملی پہلوئوں پر ۵۷ مضامین)

مصنف

محمد اسحاق

Education A Movement And A Challenge

(57 Articles Closely Related to Pratical Aspects of Education)

Author

Mohammed Ishaq

All-India Educational Movement

New Delhi - 110025

Taleem Ek Threek, Ek Challenge

Author

Mohammed Ishaq

کتاب کا نام........... تعلیم-ایک تحریک ایک چیلنج

مصنف............. محمد اسحاق

تاریخ اشاعت........... جنوری ۱۹۹۹ء

تعداد............. ایک ہزار

صفحات............. ۳۷۰

قیمت............. اندرون ملک Rs. 150/-

.... بیرون ملک $ 5/-

.... SR 20/-

مطبع: بھارت آفسیٹ، دہلی-٦

شائع کردہ :-

All - India Educational Movement

E3 - Abdul Fazal Enclave

New Delhi - 110025 (India)

Phone : 6927004 Fax : 011 - 3282834

Author's Address

Mohammed Ishaq

11-4-614/6, Bazar Guard Hydrabad-500004 India

Phone : 3391733

انتساب

ہر اُس درد مند کے نام جو قوم کے بچّوں
کی تعلیم و تربیت اور روشن مستقبل کے
لئے فکر مند ہے۔

الف۔ ابتدائی باتیں۔ مصنف

ب۔ تمہید۔ سکریٹری جنرل۔ آل انڈیا ایجوکیشن موومنٹ۔ نئی دہلی

ج۔ پیش لفظ۔ جناب سید حامد

ابتدائی باتیں

سنہ ۱۹۸۸ء میں میرے ۱۶ مضامین پر مشتمل ایک کتاب "تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں" شائع ہوئی۔ سنہ ۱۹۹۳ء میں دوسری کتاب "تعلیمی مسائل" اور تیسری کتاب "تعلیم۔ ایک تحریک"۔ سنہ ۱۹۹۵ء میں مصنف نے اس وقت شائع کروائی جبکہ میر کارواں جناب سید حامد کی قیادت میں "کل ہند تعلیمی کارواں" (نومبر سنہ ۱۹۹۵ء میں) علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے چل پڑا۔ مقصد یہ تھا کہ "کارواں" کی تعلیمی تحریک کی روح سے ان مضامین کا رشتہ قائم ہو جائے۔ اس تاریخی کارواں میں یونیورسٹی کے پروفیسر، ڈاکٹر، انجینیر، ماہرین تعلیم، دانشور اور .I.A.S میں منتخب نوجوان شریک رہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مجھے اس کارواں میں شریک رہنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

پندرہ بیس برس کے عرصے میں "تعلیم" کے ایک ہی عنوان کے مختلف عملی پہلوؤں (PRACTICAL ASPECTS OF EDUCATION) پر کوئی ایک سو مضامین حیدرآباد کے روزنامہ "سیاست" اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے باوقار ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے۔ ان ہی سے نقل ہو کر اکثر مضامین اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ایک ایک درجن رسالوں اور اخبار میں شائع ہوتے رہے۔ یہ تینوں کتابیں ایک ایک ہزار کی تعداد میں مصنف نے اپنے خرچ سے شائع کیے۔ اب ان سب کا اسٹاک ختم ہو چکا ہے۔ اکثر حضرات کی شکایت ہے کہ انھیں پچھلے برسوں میں شائع شدہ

مضامین کو دیکھنے اور پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ بعض احباب کا مشورہ تھا کہ ان سارے مضامین کی عملی دنیا میں اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر ایک ہی مجلد کتاب میں محفوظ کر دیں تو اردو داں طبقہ کو استفادہ کا موقع ملے گا۔ چنانچہ اس کتاب میں جس کا نام "تعلیم ۔ ایک تحریک، ایک چیلنج" (تعلیم کے میدان میں ہمیں کیا کرنا ہے؟) رکھا گیا ہے۔ اس میں ستاون منتخب مضامین کو شامل کر لیا گیا ہے۔

چونکہ یہ مضامین تعلیم سے متعلق عام تجربات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس لیئے سرپرست، اساتذہ، طلبہ، زیرِ ٹریننگ اساتذہ، تعلیمی انتظامیہ کے ذمہ دار، قائدین و دانشورانِ قوم کے کام کے ہیں۔ یہ سب مضامین اپنے پچاس سالہ تعلیمی وابستگی کا نتیجہ ہیں۔ اس قسم کے مضامین پر بہت کم ماہرینِ تعلیم نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب کے صفحات پر کہیں فلسفہ، اصولِ تعلیم یا نظری بحثوں کا بوجھ نہیں ہے۔

"تعلیم" کے ایک ہی عنوان سے متعلق وقفہ وقفہ سے پندرہ بیس برسوں میں مضامین لکھتے رہنے کی وجہ بعض مضامین میں چند ایک واقعات، تجربات، مشاہدات یا مثالوں کی تکرار آگئی ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ اس کو مصنف کی مجبوری سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ اسی طرح ۲۵، ۳۰ برس قبل کے اعداد و شمار آج کام کے نہیں ہیں۔ حکومت کی جانب سے اقلیتوں کی آبادی اور تعلیم کے فیصد سے متعلق اعداد و شمار دو دہوں میں آج تک شائع نہیں کیے گئے یہ دشواریاں بھی آپ کے پیشِ نظر رہیں۔

اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ وہ "پیش لفظ" شامل کر دیا گیا ہے جو موصوف نے میری پہلی کتاب پر ۱۹۸۸ء میں تحریر کیا تھا۔ یہ خود ایک نادر مضمون ہے۔ آپ کا ایک خط بھی شامل ہے۔

جناب محمود بن محمد، سابق سفیر ہند برائے سعودی عرب، پروفیسر جعفر نظام، سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی ورنگل ۔ جناب سید ہاشم علی اختر (مقیم شکاگو) I.A.S. سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے تبصرے اور تاثرات شامل ہیں۔ ناظرین سے گذارش ہے کہ وہ ان تاثرات پر ایک نظر ڈالیں کیونکہ تعلیم کی دنیا میں انکی حیثیت جوہری سے کم نہیں۔

کل ہند تعلیمی تحریک۔ نئی دہلی۔ (ALL INDIA EDUCATIONAL -
MOVEMENT NEW DELHI.) - کے صدر جناب سید حامد اور سکریٹری جنرل
جناب امان اللہ خاں کا مشکور ہوں کہ وہ اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں عملی تعاون
کا پیشکش کیا۔

دس برس قبل ایک قاری کا ایک جملہ یہاں درج کرنے کے قابل ہے :

"کاش یہ مضامین (کتاب) آپ ۲۵ برس قبل شائع
کرواتے ـــــ افسوس میرے بچوں کی تعلیم و تربیت کا زمانہ گذر چکا۔
یہ محض مصنف کی غفلت اور ہم پر ظلم ہے"

خود مصنف کو اتنا عرصہ قبل کب اتنا ہوش تھا۔

محمد اسحاق

۹ ر اگست ۱۹۹۸ء

تمہید

دسمبر ۱۹۹۵ء میں کل ہند تعلیمی کاروان مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے چل کر قریب دو ہفتہ بعد دہلی واپس ہوا۔ اس کاروان میں ڈاکٹر، پروفیسر، انجینیر، آئی اے ایس کامیاب امیدوار، ماہرین تعلیم شریک رہے۔ اس کے میر کاروان جناب سید حامد تھے۔ ایسا کاروان اپنی نوعیت کا پہلا تھا، اس لئے بعض مقامات پر یہ تجویز رکھی گئی کہ مسلمانوں کی تعلیم، صحت اور اصلاح معاشرہ کے کاموں کی ممکنہ حد تک رہنمائی اور بہبودی کے لئے اس حرکت کو مستقل تحریک کی شکل دے دی جائے۔ چنانچہ "کل ہند تعلیمی تحریک" نئی دہلی "All India Educational Movement" New Delhi کے نام سے ایک سوسائٹی اس زمانہ میں قائم کی گئی جس کے اراکین کی فہرست میں ملک کے مشہور و معروف دانشور اور ہمدردان قوم شامل ہیں۔

اس تحریک کا اہم مقصد ملک کے مختلف گوشوں میں تعلیمی سرگرمیوں کو تقویت پہونچانا اور ساتھ ہی تعلیم سے متعلق لٹریچر اور کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔ چنانچہ ایک سال سے ایک News Letter ماہنامہ شائع کیا جارہا ہے۔ اس میں کل ہند اساس پر تعلیمی اداروں اور تعلیم سے متعلق مختلف عنوانات کے تحت خبریں شائع کی جاتی ہیں۔

جناب محمد اسحاق تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے تعلیم سے متعلق مضامین ملک کے اکثر اخبار اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" میں پندرہ برس کے عرصہ میں آپ کے کوئی ۷۰ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ تعلیم کے عملی پہلوؤں سے متعلق ان مضامین کی افادیت کے پیش نظر "کل ہند تعلیمی تحریک" نئی دہلی نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے جو ۵۷ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا نام بھی "تعلیم - ایک تحریک، ایک چیلنج" رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے ادارے اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

امان اللہ خاں

سیکریٹری جنرل - آل انڈیا ایجوکیشنل مومنٹ، نئی دہلی

پیش لفظ

میں محمد اسحاق صاحب کے مضامین کو قدر اور انہماک سے پڑھتا ہوں
لائق مصنّف نے مسلمانوں کی تعلیم کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ ان کے مضامین کو مقبولیت کا اندازہ ان اخبارات و رسائل کی فہرست سے کیا جاتا ہے، جن میں وہ چھپتے رہے ہیں میرے لئے یہ بات سرمایۂ افتخار ہے کہ محترم اسحاق صاحب کے مضامین کے مجموعہ میں میری سطور کو جگہ مل رہی ہے۔

فاضل مصنف کے سارے مضامین تعلیم کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے لفظ لفظ سے وہ تڑپ ٹپکتی ہے جو اس کے دل میں اپنی ملت کے لئے اٹھتی ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ آسمان سے تارے توڑ لائے اور اس کو ملّت کی کلاہ میں ٹانک دے یہ ان دانشوروں میں سے نہیں ہے جو اس تاریکی میں جس نے ملّت کو گھیر رکھا ہے چمکتے ہیں جو پرایوں کی خوشنودی کی قربان گاہ پر اپنوں کی خیر خواہی کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ان کے مضامین اندھیرے میں روشنی کی کرنوں کا سا کام کرتے ہیں۔ ان کا ذہن اس جستجو میں رہتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی کو کس طرح دور کیا جائے یہ بات بھی قابلِ داد ہے کہ موضوع سے گہری جذباتی وابستگی کے باوجود مصنف نے اپنا قلم جذبات کے ہاتھوں میں نہیں دیا ہے۔ اس کا اندازہ کسوٹی پر کسنے اور پرکھنے، دانش و بینش، تحلیل و تجزیہ کا ہے۔ تعلیم جیسے خشک مضمون کو موصوف نے شگفتہ نگاری کے ذریعہ دلکش بنا دیا ہے۔

موضوع پر پوری گرفت کی وجہ ان کے طرزِ بیان میں فصاحت، صفائی اور روانی ہے، وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں صراحت اور تاثیر کے ساتھ کہتے ہیں. صراحت تو خیر مضمون پر قدرت کا ثمرہ ہے لیکن تاثیر کے لئے کوئی اور شئے درکار ہوتی ہے وہ ہے خونِ جگر یا اخلاص۔ ان کے ہاں نہ تو خونِ جگر کی کمی ہے نہ اخلاص کی۔

یہ ان لوگوں میں سے نہیں جو اُمّت کی پسماندگی پر فریاد کر کے مطمئن ہو جائیں کہ انہوں نے بیداری اور ہمدردی کا فرض ادا کر دیا۔ ان سطور کا راقم یہ سمجھتا ہے کہ جو لوگ ملّت کی درماندگی کے تعلق سے بے خبر یا بے حس ہیں، ان پر الزام اس قدر عائد نہیں ہوتا جتنا ان لوگوں پر جو باخبر ہونے کے باوجود جگانے سدھارنے اور سنوارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ملت کے سنبھالنے اور آگے بڑھانے کا فرض اس کے ہر فرد پر ہے۔ اور ان لوگوں پر زیادہ نہیں ہے جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ جو باخبر نہیں خوشحال ہیں انہیں اپنی بے دلی اور تن آسانی کے لئے ایک دن جواب دینا ہوگا۔ بعض ایسے حضرات بھی ہماری نظر میں ہیں جو اصلاح اور آگاہی کا کام شروع کرتے ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ جماعت بے سدھ پڑی کروٹ تک نہیں لیتی ہے تو یہ مایوس ہو کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور عافیت اسی میں دیکھتے ہیں کہ زندگی کے جو دن باقی رہ گئے ہیں انہیں گھر میں سر چھپا کر یا اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت میں صرف کر دیں۔ وہ شاید نہیں جانتے کہ خدا کی مخلوق کی خدمت بڑی عبادت ہے اور انہیں غالباً اس رمز کی آہٹ بھی نہیں ملی کہ کوشش کو بے حسی کے بقدر تیز کرنا چاہیئے۔

فاضل مضمون نگار نے مذکورہ بالا اسلوب احساس اور طرزِ عمل سے بالکل الگ اپنی راہ نکالی ہے۔ اس نے موضوع کے چننے میں حسنِ انتخاب کا ثبوت دیا ہے۔ موضوع کی وحدت کے باوجود تنوع ہے پہلے مضمون کا عنوان ہے "تعلیم قسمت کی بات نہیں۔ یعنی اس سے بڑی محرومی کوئی نہ ہوگی کہ انسان خود کو یا اپنے بچوں کو جاہل رکھ کر خود کو یہ جھوٹی تسلی دے کہ علم ہمارے مقدر ہی میں نہ تھا۔ مسلم طلباء کا معیارِ تعلیم ایک تلخ اور تاریک حقیقت کو غایت اظہار سے سرچشمہ عمل بنانے کے لئے قلم بند ہوا ہے۔ بچوں کی تعلیم پر سزا کے اثرات میں مصنف نے بچوں کی نفسیات میں جھانک کر دیکھا ہے

اور تعلیم و تربیت کی ایک سہو کو طشت از بام کیا ہے "لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ" میں مضمون نگار نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ راقم سطور کا عقیدہ ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں نے جرات اور سرعت کے ساتھ اس مسئلہ کو حل نہیں کیا تو ان پر تعلیمی پیش رفت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ وہ ہمیشہ کاروانِ زندگی کے پیچھے پیچھے گھسٹتے رہ جائیں گے۔ تعلیم میں ہوم ورک کی اہمیت، یہ پہلو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سرمایۂ عبرت ہے۔ ان کے بچوں کو ہوم ورک ملتا ہے تو ان میں بیشتر الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ باپ یا تو ان پڑھ یا نیم خواندہ ہے اور اگر پڑھا لکھا بھی ہے تو اس کے پاس بچوں کے لئے وقت کہاں کام سے تھکا ہارا آیا ہے سمجھتا ہے دن بھر محنت کر کے اس نے بیوی بچوں پر بڑا احسان کیا ہے اور ماں بے چاری دن بھر مصالحے پیسنے، چولہا جھونکنے، شوہر اور بچوں کی خدمت کرنے میں مصروف رہی ہے۔ وہ ان پڑھ عورت بچوں کو اور کیا خاک پڑھائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے بچے ہوم ورک ٹھیک سے کر نہیں پاتے۔ ان میں اعتماد ختم ہو گیا تو باقی کیا رہ گیا، ساری صلاحیتیں مرجھانے لگتے ہیں۔ دل زندہ کے بغیر کس نے زندگی کی دوڑ جیتی ہے جو یہ غریب جیت پائیں گے۔

الغرض میں نے فاضل مصنف کی تحریر میں صالح جذبہ اور دانش کا موثر اور کارگر امتزاج دیکھا ہے۔ اس نے بظاہر خشک مضامین پر اپنی توجہ مامور کی ہے لیکن جذبہ کی حرارت نے اس کی نثر کو شگفتہ اور دل پذیر بنا دیا ہے۔ دوسرے سب ہی مضامین پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں۔ خصوصاً ملت کے اہل فکر و دانش اور رہنمایان قوم کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

غور کیجئے تو یہ کام کرنے کا ہے کاش ہمارے اہل قلم اور اہل دانش میں **محمد اسحاق** جیسے اور کچھ لوگ پیدا ہو جائیں جو اس کم نصیب اور زوال آمادہ ملت کا وہ قرض ادا کرنے پر کمر باندھ لیں جو ان پر واجب ہے عام تعلیم اور بالخصوص مسلم طلباء کے بارے میں مصنف نے بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں اور موثر تجاویز پیش کئے ہیں ان کے سوالات اور تجاویز غور و فکر کے مستحق ہیں۔ ایسے

غور و فکر کی جس کی آسودگی صرف موثر عمل سے حل ہو سکتی ہے۔

اچھا ہو، اگر ان مضامین کا ترجمہ ہندوستان کی دوسری زبانوں خصوصاً تلگو انگریزی اور ہندی میں ہو جائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اہل نظر اور اہل درد کی طرف سے زیر نظر کتاب کو اعتراف اور اثر پذیری کا وہ خراج ملے گا جس کی وہ نمایاں طور پر مستحق ہے۔

۱۶ مارچ ۱۹۸۹ء

سیّد حامد

ہمدرد نگر، دہلی۔

سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

چانسلر ہمدرد یونیورسٹی۔ دہلی

ہمدرد نگر، نئی دہلی۔
۲۲؍اگست ۱۹۹۳ء

محترمی و مخدومی!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کیا جائے۔ آپ کے مکتوب کے سائے میں آپ کی گراں قدر تصنیف "تعلیمی مسائل" دستیاب ہوئی۔

آپ کا اندازِ بیان بہت سادہ، سلجھا ہوا اور دل پذیر ہے۔ آپ جو مثالیں دیتے ہیں وہ پڑھنے والے کو مسحور اور مقید کر لیتی ہیں۔ اِس بار آپ کی کتاب دیکھ کر زیادہ شدّت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ تعلیم کی مہم کو سر کرنے اور تعلیم کے شوق کو پیدا کرنے کا ہنر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ودیعت کیا ہے۔

اُمید ہے اس اثنا میں اس نہایت کارآمد کتاب کا ہندی ترجمہ بھی منظرِ عام پر آگیا ہوگا۔ انگریزی میں بھی شائع کیجیے۔ ترجمہ آپ خود کیجیے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہوں کہ ترجمہ دیکھ کر میں کوئی مفید مشورہ دے سکتا ہوں تو ازراہِ کرم مسودہ کی بابت مجھے ہدایت کیجیے۔

مذکورہ اوروں کو میں بھی لکھ رہا ہوں۔

اللہ جذبِ دروں اور زورِ قلم کو اور زیادہ کرے۔

والسلام

خیر اندیش

سید حامد

تعلیم قسمت کی بات نہیں

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا، ہم بالکل ابتدائی جماعتوں میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسی سال اس قصبہ سے محبوب نگر ہائی اسکول سے تین طلبہ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور صرف ایک صاحب درجہ سوم سے کامیاب ہوگئے۔ اخبار میں نام آیا، سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی، سارے گاؤں کے بڑے لوگوں کی ضیافت کی گئی اور ہر ایک کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا:۔

"تعلیم قسمت کی بات ہے"

۱۹۵۳ء کی بات ہے ایک ریونیو انسپکٹر میرے پاس آئے اور اپنے لڑکے کو انجنیر بنانے کے سلسلہ میں مشورے کے طلب گار ہوئے۔ یہ لڑکا میٹرک میں دو سال فیل ہو کر تیسرے درجہ میں کامیاب ہو چکا تھا میرا مشورہ تھا۔ بہتر ہے اسے کوئی دوکان لگا کر دیجیے، باپ بیٹے دونوں سخت مایوس ہوگئے. لڑکے کی یہ ضد کہ وہ انجنیر بن کر رہے گا اور باپ کی یہ تمنا کہ وہ اپنے لڑکے کو انجنیر بنا کر ہی رہیں گے۔ کچھ منّت کرنے پر میں نے انھیں مشورہ دیا کہ لڑکے کو حیدرآباد کے کسی کالج میں شریک کروادیجیے، ماہانہ سو روپے ۱۰۰ بھیجیے اور دوسرا کام دعا کرتے رہیئے۔ یہ صاحبزادے انٹرمیڈیٹ کے دو سال کے بعد آخری امتحان میں مسلسل پانچ سال ناکام ہوتے رہے۔ مال کے انسپکٹر آخر کار ہار گئے اور وظیفہ پر ہٹتے وقت اس لڑکے کو تحصیل میں کسی خدمت پر تقرر کروا سکے مجھ سے ملاقات ہوئی۔ شرمندہ ہوئے کہنے لگے "تعلیم قسمت کی بات ہے"

ان دو مثالوں سے ہٹ کر تیسری مثال ان ذہین، غریب اور متوسط گھرانوں کے طلباء کی ہے جن کے والدین نے کبھی اپنے لڑکوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی۔ لیکن

اور تعلیم و تربیت کی ایک سہو کو طشت از بام کیا ہے " لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ " میں مضمون نگار نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے ۔ راقم سطور کا عقیدہ ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں نے جرأت اور سرعت کے ساتھ اس مسئلہ کو حل نہیں کیا تو ان پر تعلیمی پیش رفت کے دروازے بند ہو جائیں گے ۔ وہ ہمیشہ کاروانِ زندگی کے پیچھے پیچھے گھسٹتے رہ جائیں گے ۔ تعلیم میں ہوم ورک کی اہمیت ، یہ پہلو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سرمایۂ عبرت ہے ۔ ان کے بچوں کو ہوم ورک ملتا ہے تو ان میں بیشتر الجھن میں پڑ جاتے ہیں ۔ باپ یا تو ان پڑھ یا نیم خواندہ ہے اور اگر پڑھا لکھا بھی ہے تو اس کے پاس بچوں کے لئے وقت کہاں کام سے تھکا ہارا آیا ہے سمجھتا ہے دن بھر محنت کر کے اس نے بیوی بچوں پر بڑا احسان کیا ہے اور ماں بے چاری دن بھر مصالحے پیسنے ، چولھا جھونکنے ، شوہر اور بچوں کی خدمت کرنے میں مصروف رہی ہے ۔ وہ ان پڑھ عورت بچوں کو اور کیا خاک پڑھائے گی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے بچے ہوم ورک ٹھیک سے کر نہیں پاتے ۔ ان میں اعتماد ختم ہو گیا تو باقی کیا رہ گیا ، ساری صلاحیتیں مرجھانے لگتے ہیں ۔ دل زندہ کے بغیر کس نے زندگی کی دوڑ جیتی ہے جو یہ غریب جیت پائیں گے ۔

الغرض میں نے فاضل مصنف کی تحریر میں صالح جذبہ اور دانش کا موثر اور کارگر امتزاج دیکھا ہے ۔ اس نے بظاہر خشک مضامین پر اپنی توجہ مامور کی ہے لیکن جذبہ کی حرارت نے اس کی نثر کو شگفتہ اور دل پذیر بنا دیا ہے ۔ دوسرے سب ہی مضامین پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں ۔ خصوصاً ملت کے اہل فکر و دانش اور رہنمایان قوم کو دعوتِ فکر دیتے ہیں ۔

غور کیجئے تو یہ کام کرنے کا ہے کاش ہمارے اہل قلم اور اہل دانش میں **محمد اسحاق** جیسے اور کچھ لوگ پیدا ہو جائیں جو اس کم نصیب اور زوال آمادہ ملت کا وہ قرض ادا کرنے پر کمر باندھ لیں جو ان پر واجب ہے عام تعلیم اور بالخصوص مسلم طلباء کے بارے میں مصنف نے بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں اور موثر تجاویز پیش کئے ہیں ان کے سوالات اور تجاویز غور و فکر کے مستحق ہیں ۔ ایسے

غور و فکر کی جس کی آسودگی صرف موثر عمل سے حل ہوسکتی ہے۔

اچھا ہو، اگر ان مضامین کا ترجمہ ہندوستان کی دوسری زبانوں خصوصاً تلگو انگریزی اور ہندی میں ہو جائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اہل نظر اور اہل درد کی طرف سے زیر نظر کتاب کو اعتراف اور اثر پذیری کا وہ خراج ملے گا جس کی وہ نمایاں طور پر مستحق ہے۔

۱۶ / مارچ ۱۹۸۹ء

سید حامد
ہمدرد نگر، دہلی۔
سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
چانسلر ہمدرد یونیورسٹی - دہلی

ہمدرد نگر، نئی دہلی۔
۲۲ راگست ۱۹۹۳ء

محترمی و مخدومی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کیا جائے۔ آپ کے مکتوب کے سائے میں آپ کی گراں قدر تصنیف "تعلیمی مسائل" دستیاب ہوئی۔

آپ کا اندازِ بیان بہت سادہ، سلجھا ہوا اور دل پذیر ہے۔ آپ جو مثالیں دیتے ہیں وہ پڑھنے والے کو مسحور اور مستفید کر دیتی ہیں۔ اس بار آپ کی کتاب دیکھ کر زیادہ شدّت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ تعلیم کی مہم کو سر کرنے اور تعلیم کے شوق کو پیدا کرنے کا ہنر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ودیعت کیا ہے۔

اُمید ہے اس اثنا میں اس نہایت کارآمد کتاب کا ہندی ترجمہ بھی منظرِ عام پر آگیا ہوگا۔ انگریزی میں بھی شائع کیجیے۔ ترجمہ آپ خود کیجیے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہوں کہ ترجمہ دیکھ کر میں کوئی مفید مشورہ دے سکتا ہوں تو ازراہِ کرم مسودہ کی بابت مجھے ہدایت کیجیے۔ مذکورہ اوروں کو میں بھی لکھ رہا ہوں۔

اللہ جذبِ دروں اور زورِ قلم کو اور زیادہ کرے۔

والسلام

خیر اندیش

سید حامد

تعلیم قسمت کی بات نہیں

۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا، ہم بالکل ابتدائی جماعتوں میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسی سال اس قصبہ سے محبوب نگر ہائی اسکول سے تین طلبہ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور صرف ایک صاحب درجہ سوم سے کامیاب ہوگئے۔ اخبار میں نام آیا، سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی، سارے گاؤں کے بڑے لوگوں کی ضیافت کی گئی اور ہر ایک کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا:۔

"تعلیم قسمت کی بات ہے"

۱۹۵۳ء کی بات ہے ایک ریونیو انسپکٹر میرے پاس آئے اور اپنے لڑکے کو انجنیر بنانے کے سلسلہ میں مشورے کے طلب گار ہوئے۔ یہ لڑکا میٹرک میں دو سال فیل ہو کر تیسرے درجہ میں کامیاب ہو چکا تھا میرا مشورہ تھا۔ بہتر ہے اسے کوئی دوکان لگا کر دیجیے، باپ بیٹے دونوں سخت مایوس ہوگئے. لڑکے کی یہ ضد کہ وہ انجنیر بن کر رہے گا اور باپ کی یہ تمنا کہ وہ اپنے لڑکے کو انجنیر بنا کر ہی رہیں گے۔ کچھ منّت کرنے پر میں نے انھیں مشورہ دیا کہ لڑکے کو حیدرآباد کے کسی کالج میں شریک کروا دیجیے، ماہانہ سو روپے ۱۰۰ بھیجیے اور دوسرا کام دعا کرتے رہیئے۔ یہ صاحبزادے انٹرمیڈیٹ کے دو سال کے بعد آخری امتحان میں مسلسل پانچ سال ناکام ہوتے رہے۔ سال کے انسپکٹر آخر کار ہار گئے اور وظیفہ پر ہٹتے وقت اس لڑکے کو تحصیل میں کسی خدمت پر تقرر کروا سکے مجھ سے ملاقات ہوئی۔ شرمندہ ہوئے کہنے لگے "تعلیم قسمت کی بات ہے"

ان دو مثالوں سے ہٹ کر تیسری مثال ان ذہین، غریب اور متوسط گھرانوں کے طلباء کی ہے جن کے والدین نے کبھی اپنے لڑکوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی۔ لیکن

انھوں نے خود ہی محنت و مشقت کر کے مندر و مسجد کے چراغوں کے نیچے پڑھ کر تعلیم کے اعلیٰ معیار تک پہنچے۔ آج بھی شہر حیدر آباد اور اضلاع میں ڈاکٹر، انجینیر، وکیل اور پروفیسر مل جایں گے جن کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار رہا ہے اور جن کی جدو جہد بھی حیرت ناک ہوگی اور یہ بات بھی قریب قریب ہر ایک کے تجربہ میں ہوگی کہ ان ہی کے خاندان کے قریبی رشتہ دار ان کی تعلیم کے سخت مخالف رہے ہوں گے۔ جہاں تک وہ پست ہمت کر سکتے تھے کر چکے ہوں گے۔ اور یہ بھی مشورہ دے چکے ہوں گے کہ زیادہ پڑھنے سے دماغ پگھل جاتا ہے اور آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ اور جب ان کی بات نہیں چلی تو وہ دل میں شرمندہ ہوں گے اور بالاخر کہیں گے "تعلیم قسمت کی بات ہے" گزشتہ پچاس برس سے ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ تعلیم قسمت کی بات ہے۔ اور آج بھی یہی خیال خام عام ہے۔ اتنے برسوں پہلے سچ مچ تعلیم اتنی پھیلی ہوئی نہیں تھی۔ غربت و جہالت کی وجہ۔ ایک ہزار بچے اسکول میں شریک ہوتے تو بس دس پانچ میٹرک تک پہنچ پاتے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ بچے کو جتنی سزا ملتی رہے گی، اتنا ہی وہ تعلیم میں اوپر آے گا۔ جو استاد سزا دینے میں استاد ہوتا اس کی گاؤں میں اتنی ہی زیادہ قدر ہوتی۔ مگر ان اساتذہ نے کتنے معصوم طلبہ کی زندگی اجاڑ دی، اس کی شاید انکو خبر نہ ہوگی جو مار کے خوف سے اسکول چھوڑ بیٹھے، ان حالات میں کوئی سخت جان طالب علم آگے نکل جاتا تو ظاہر ہے یہ قسمت ہی کی بات ہو سکتی تھی۔

تعلیم منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے

تعلیم قسمت کی بات ہرگز نہیں۔ بچوں کی تعلیم ایک سوچے سمجھے دور رس واضح منصوبہ کا نام ہے جو بچہ کی ۴، ۵ سال کی عمر سے شروع ہو کر پندرہ، سولہ سال کی عمر تک جاری رہتا ہے۔۔۔ جب کہ یہ لڑکا میٹرک کا امتحان کامیاب کر لیتا ہے۔ اس

منصوبہ کی تکمیل کے لئے تھوڑے بہت سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔سب سے زیادہ اہم بات سرمایہ نہیں بلکہ یہ بات ہے آپ نے اپنے بچے کی تعلیم پر کتنی توجہ دی، کتنی دلچسپی لی، اور اپنا کتنا وقت اس کی تعلیم پر دیا یہی تو اصل سرمایہ ہے جو بچہ کی تعلیم کے لیے مشغول کرنا ضروری ہے۔کم از کم یہ منصوبہ بند جد و جہد دس برس یا دو پنجسالہ منصوبوں پر محیط ہے۔

یہاں پر تعلیمی منصوبہ بندی اور عام منصوبہ بندی کے بنیادی فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔کوئی مکان بنانا، ڈیم برج بنانا ہو تو یہ منصوبہ پہلے کاغذ پر تیار کیا جاتا ہے کاغذی نقشہ کی تکمیل کے لئے ضروری سرمایہ کی فراہمی اور پھر اصل کام نقشہ کے مطابق شروع ہو جاتا ہے۔آخر میں یہ جانچ کی جاتی ہے کہ جو منصوبہ ہم نے بنایا تھا وہ کہاں تک کامیاب رہا اور ہم نے جو نشان مقرر کیے تھے کس حد تک کس مدت تک تشفی بخش طریقہ پر حاصل کرنے میں کامیاب رہے آپ کے بچہ کی تعلیمی منصوبہ بندی بالکل الگ چیز ہے۔وہاں کاغذی پلان یا نقشہ کی طرح بچہ بے حس و بے جان نہیں ہے، وہ خود ذی روح اچھلتا کودتا اور زندگی کی ساری توانائیوں کا مرکز ہوتا ہے۔

ذاکر حسین تعلیمی فارمولا

ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے ملک کے بڑے ماہر تعلیم ہوئے ہیں کوئی ساٹھ برس پہلے ایک کالج کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انھیں ایک تعلیمی فارمولا دیا تھا، جو کامیابی کا ضامن ہے۔ڈر ہے یہ فارمولا یوں ہی ضائع نہ ہو جائے کیونکہ ذاکر صاحب پر جو کتابیں انگریزی یا اردو میں ہیں کہیں پر اس تقریر کا ذکر نہیں ہے۔

فارمولا یہ ہے

شدت * مدت = مقصد

شدت سے مراد مقصد کو حاصل کرنے کا جوش، ولولہ، لگن اور دھن کا پیمانہ ہے۔اس کو ہم یہاں ۱۰۰ درجوں یا ڈگریوں میں ظاہر کریں گے

مدت اس مقصد کو حاصل کرنے کا جوش یا جذبہ کتنے دن باقی رہا کیونکہ مقصد کے حصول کے لئے جتنی مدت درکار ہے وہ دلچسپی باقی رہی یا اسمیں اتار چڑھاؤ آتے رہے، کیا یہ دلچسپی درکار مدت تک ایک ہی سطح اور ڈگری پر قائم رہی یا نہیں۔

مقصد اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے کئی ایک مقاصد قلیل مدتی اور طویل مدتی اسی فارمولے کے تابع ہیں، اس کا اطلاق آسانی سے تعلیمی منصوبہ بندی پر ہوتا ہے۔

ایک بات یہاں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ جو مقصد جتنا اونچا ہوگا، اس کے حصول کا جذبہ (شدت) بھی انتہائی زیادہ ہوگا اور پھر درکار مدت بھی اتنی ہی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ہم یہاں تین طلبہ کا ایک فرضی جدول پیش کرتے ہیں جو اس سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہیں۔ان کے نتائج اسی فارمولا کے تحت دیکھیئے۔

شدت * مدت = مقصد | (نتیجہ امتحان) پہلا طالب علم ۹۰ * ۳ ماہ = ۲۷۰ نشانات۔ناکام

دوسرا طالب علم ۶۰ * ۸ ماہ = ۴۸۰" ۔کامیاب

تیلسرا طالب علم ۸۰ * ۱۲ ماہ = ۹۶۰" ۔درجہ اول

• پہلا طالب علم امتحان کے سر پر آجانے سے شدت کا پارہ بہت زیادہ ہے لیکن درکار مدت بہت کم ہے ۔۔۔۔۔۔۔

• دوسرے طالب علم میں کامیابی کا جذبہ ٹھیک ہے اور مدت بھی اوسط ہے۔درجہ سوم یا دوم بہرحال کامیاب ہے۔

لیکن تیسرا طالب علم وہ ہے جس نے شدّت کے پارہ کو ایک برس تک اعلیٰ سطح کی

ڈگری پر قائم رکھا اسی لئے درجہ اول میں کامیاب ہوا۔ اس کا مقصد بھی اونچا تھا اور جذبہ بھی بہت تھا اور طویل مدت تک قائم رہا۔

وہ آئندہ زندگی میں کوئی معتبر مقام حاصل کر کے رہے گا۔۔ اس مثال میں ذہانت کے اعتبار سے ہم تینوں کو مساوی سمجھتے ہیں۔

آپ کے سامنے ایسی بہت سی مثالیں ہوں گی۔ ہمیں یہاں ایک بات پورے وثوق سے کہنا ہے کہ ":۔ **تعلیم قسمت کی بات نہیں**"

آپ اس وہم سے نکل آئیے کہ تعلیم قسمت کی بات ہے۔ تعلیم ایک منصوبہ بند جد و جہد کا نتیجہ ہے جو اس دلچسپی اور ولولہ کو ایک طویل مدت تک برقرار رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ہماری آرزو ہے کہ ذاکر حسین تعلیمی فارمولا ہر گھر میں آویزاں ہو،

22

معیار تعلیم

(پست معیار کی وجوہات تجاویز اور حل)

معیار تعلیم کے متعلق نجی محفلوں میں گفتگو اور اخباری مراسلوں کے دیکھنے سے یہ تاثر عام ہو چلا ہے کہ جہاں تک مسلم طلبہ کا تعلق ہے ان کا معیار پست ہے۔ اس کا مطلب ہے مسلم طلبہ عام طور پر غبی، کند ذہن اور لاپرواہ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر امتحان میں ناکام ہونے والے امیدواروں کی فہرست میں ان کی تعداد سرفہرست ہوتی ہے۔ لیکن یہ سارا نظریہ تباہ کن اور غلط ہے۔ جہاں تک طلبہ کے تعلیمی معیار کا تعلق ہے اس میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔ البتہ ہندوستان میں برسہابرس کی پچھلی تاریخ دیکھی جائے تو چند ذاتیں رہی ہیں۔ جنھوں نے علم کو پھیلنے نہ دیا۔ وہی خاص طبقہ عام طور پر ہوشیار، ذہین اور حکومت کے لائق سمجھ لیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ جسمانی وجاہت کی طرح ذہانت بھی توارثاً یا ماں باپ کا عطیہ ہے۔ اچھے پڑھے لکھے، ذہین اور فطین والدین کے بچے عام طور پر ذہین اور پڑھنے لکھنے میں تیز ہوتے ہیں لیکن وہ غریب ماں باپ جو معمولی شد بد سے بھی محروم رہ جاتے ہیں وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کے بچے جنگلی پودوں کی طرح اگ آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہریجن، اچھوت اور قبائلی لوگ جنھیں گزشتہ چار ہزار برس تک تعلیم سے دور رکھا گیا وہ ذہنی اعتبار سے پست اور تعلیم کے معیار کو چھونے میں سست ہیں۔ تعلیم کی وجہ سے چند برسوں میں ان کے اندر آگے آنے اور دوسروں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائیگی یہ خود ذاتی قابلیت و صلاحیت سے

محروم نہیں ہیں لیکن انھیں صیقل کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا گیا اسی مفروضہ پر اگر یہ کہہ دیا جائے کہ پست اقوام کے طلبہ کا معیار بھی پست ہوتا ہے۔ تو بات سچ ہے لیکن ایسا کیوں ہے یہی اصل سوال ہے۔

بھیڑیا بچہ راموکی مثال : RAMU THE WOLF BOY

1951 ء کی بات ہے انگریزی اخباروں میں ایک " بھیڑیا بچہ " کا ذکر بہت دنوں تک آتا رہا ہوا یہ کہ اترپردیش کے کسی جنگل میں شکاریوں نے دیکھا کہ بھیڑیا جھنڈ میں انسان کا بچہ بھی شامل ہے وہ اس گلّہ میں دوڑ رہا ہے بڑی ہوشیاری سے اسے زندہ پکڑ لیا گیا۔ اس کو لکھنؤ میڈیکل کالج میں رکھا گیا۔ اس کا فرضی نام رامو رکھا گیا یہ بچہ تقسیم ہند کے زمانہ میں کسی طرح جنگل میں چھوٹ گیا۔ نہیں معلوم یہ بچہ ہندو تھا یا مسلمان، کسی مادہ بھیڑیا نے اس شیر خوار کو سایہ دیا اور یہ بڑا ہو کر بھیڑیا بچہ بن گیا۔ اس کے جسم کے بال اور ناخن بڑھ چکے تھے۔ یہ دودھ پلیٹ میں چاٹ کر پیتا تھا۔ چھ ماہ تک اس کو دودھ چمچہ سے پلانے کی مشق کرائی گئی تو اتنا کر سکا کہ چمچہ میں دودھ لے کر منھ تک پہونچانے تک آدھا اوپر گرا لیتا اس کی عمر ۸، ۹ برس کی ہو چکی تھی۔ بات کرنے کی کوشش کی گئی تو " غوں غوں کی آواز نکالتا " چھ ماہ کے اندر ہی یہ انسان کا بچہ میڈیکل کالج کے " غیر فطری ماحول " کو برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ اگر رامو کچھ نہ سیکھ سکا تو اس میں قصور کس کا ہے۔ رامو تو انسان کا بچہ تھا، لیکن شیر خوارگی کے زمانہ ہی سے وہ کسی گھر کے ماحول، تہذیب و تمدن، زبان و بیان، اوصاف انسانی سے واقف نہ ہو سکا۔ اگر رامو ہمارے درمیان ہوتا اس کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کی جاتی تو شاید وہ ہمارے ملک کا بڑا آدمی ہوتا۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں تک

توارث کا تعلق ہے وہ تو فیصلہ کن ہے، بچہ کا ناک نقشہ، رنگ وقد وغیرہ وغیرہ سب کچھ استقرار حمل ہی کے وقت طے ہو جاتا ہے۔اب جو کچھ ہمارے قابو میں ہے وہ اس کی تعلیم وتربیت یا ماحول۔

چند تجربے:

۱۹۶۱ء میں مردم شماری کے سلسلہ میں مجھے محلہ چنچل گوڑہ میں گھر گھر جانے کا اتفاق ہوا۔یہاں پر دو حضرات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ایک جناب امیر علی خاں صاحب، مرحوم صوبہ دار تھے۔موصوف نے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔اور میرے سر ہو گئے کہ آپ نے ایم، اے کیوں ادھورا چھوڑ دیا ایم، اے، پی ایچ ڈی کرو، وغیرہ۔اس گفتگو سے مجھ میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور میں اپنے خول سے نکل آیا۔اب احساس ہوتا ہے کہ بڑے آدمی اگر طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں تو ان کی زندگی کا رخ تبدیل کر سکتے ہیں۔

دوسرے بزرگ جن کا نام یاد نہیں "اتالیق منزل" کے قریب ہی ایک چھوٹے سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے اور حضور نظام کے صرفخاص سے پندرہ روپے وظیفہ پاتے تھے۔ان کے گیارہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ان میں دو لیڈی ڈاکٹر، ایک لڑکی بنک افیسر، سب لڑکے انجینئر، ڈاکٹر، سائنٹسٹ اور ایک اعلیٰ عہدے پر دہلی، بمبئی، لکھنؤ اور حیدرآباد میں ملازم احد عشر کوکبا کی مثال گیارہ بچے سب کے سب آسمان کے ستارے، میں حیرت میں رہ گیا۔پوچھا کیا آپ کے سب بچے اتنے ذہین تھے۔آخر راز کیا ہے جواب دیا کہ کوئی غیر معمولی ذہین تو نہ تھے البتہ میں گذشتہ (۲۰) برس سے ہر روز ان بچوں کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھ کر پڑھاتا۔ان کا ہوم ورک دیکھتا۔میں خود میٹرک کامیاب تھا۔چند دن میں ان کے سب مضامین کو اچھی طرح پڑھنے کے قابل

ہو گیا۔ وہ سب ایک کے بعد ایک میٹرک کامیاب ہوتے گئے۔ پھر اس کے بعد خود ہی اڑنے لگے۔

ایک اور مثال محبوب نگر کے مولوی شمس الدین صاحب مرحوم کے بچوں کی ہے یہ مولوی صاحب ۳۵ برس تک محبوب نگر ہائی اسکول پر ابتدائی مشاہرہ (۳۰) روپے ماہانہ سے کام کرتے رہے۔ ان کے ۴ لڑکے اور ۵ لڑکیاں ہیں۔ لڑکے، ایک مائننگ انجینئر، پی۔ایچ ڈی، (سائنٹسٹ) اور ایک ایم بی اے (عثمانیہ یونیورسٹی میں فرسٹ) لڑکیاں ایک بایو کمیسٹری میں پی۔ایچ ڈی، ایک یم ایس سی، جیالوجی، ایم ایس سی (کیمسٹری) ایم کام۔ ایم اے۔ یہ سب کے سب اس وقت حیدر آباد، دہلی مدراس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

مولوی صاحب ہی کے مکان میں لب سڑک آٹے کی گرنی تھی، موصوف کے ایک صاحبزادہ صبح سے شام تک اس گرنی پر متعین تھے ایک روز ایک کرسچین جوڑا آٹا پسوانے آیا۔ مولوی صاحب اپنی مذہبیت، اصول کردار کے لئے ساری بستی میں مشہور تھے۔ انھوں نے کہا! مولوی صاحب اس لڑکے کو آپ نے کم از کم میٹرک تک پڑھا دیئے ہوتے۔ آپ نے اس کی مٹی پلید کر دی۔ اس وقت اس لڑکے کا چہرہ اور بال آٹے کے پوڈر سے سفید ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا یہ میٹرک سے بھی آگے ہے۔ کیا انٹر میڈیٹ پاس ہے اس سے بھی آگے۔ کیا بی ایس سی ہے؟ اس سے بھی آگے، کیا ایم ایس سی ہے؟ اس سے بھی آگے، کیا پی ایچ ڈی ہے؟ ہاں یہ علی گڈھ سے بایو کمسٹری میں پی۔ ایچ ڈی کر چکا ہے ابھی اس کو ملازمت نہیں ملی۔ آج کل یہ صاحبزادہ مدراس میں سائنٹسٹ کے عہدہ پر ہیں گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں دو سال کے لئے وظیفہ پر جاپان بھیجا ان کے مقالہ پر ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں نے

اعزاز بخشا۔ اور بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ مولوی صاحب نے ابتداء ہی سے ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی۔ اور پلان کے تحت ان سب کو اعلیٰ ترین ڈگریوں تک پڑھایا۔

ان چند مثالوں سے دو باتیں واضح ہو چکی ہوں گی، ایک تو یہ کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں کوئی بڑے گھرانوں کی نہیں تھیں۔ والدین معمولی درجہ کے تھے۔ دوسری اہم بات والدین کی دوراندیشی تھی۔ بچے ہی ان کی زندگی کا اصل سرمایہ تھے۔ اس کے لئے وہ بہت پہلے ہی سے ان کے لئے اپنا عزیز وقت نکالا اور ان کے ساتھ گھنٹہ دو گھنٹہ محنت کی۔

> وہ اس راز کو پا گئے تھے کہ ابتدائی دس برس کی تعلیم ہی اہم ہوتی ہے یہ محنت اور وقت کا مشغول کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے بنک میں تھوڑا تھوڑا سرمایہ دس برس تک جمع کرتا رہا اور ساری عمر نفع حاصل کرتا رہا۔ بس انھوں نے یہی کیا تاکہ ان کے بچے زندگی میں معتبر اور عزت کا مقام حاصل کر سکیں۔

پست معیار تعلیم کی وجوہات۔

اسکول کا انتظامیہ، سرمایہ کی فراہمی صدر مدرسہ کی عدم کارکردگی اساتذہ کی عدم دلچسپی، اسکول کا غیر تعلیمی ماحول، اسکولوں میں بنیادی ضرورتوں کی عدم فراہمی، جماعتوں میں طلبہ کا ہجوم، بچوں کی لاپروائی اور والدین کی عدم توجہ اور دلچسپی، پست معیار تعلیم کی وجوہات ہیں ان سب عوامل میں ہم صرف یہاں ایک سبب پر روشنی ڈالیں گے کہ والدین کی توجہ سے کیا انقلاب آسکتا ہے۔

بنیادی بات

تعلیم کے معیار کی بات دور کی ہے اس سے قبل جو سب سے زیادہ اہم بنیادی بات ہے وہ یہ کہ بچوں میں تعلیم کا شوق اور دلچسپی پیدا کی جائے۔ یہ دلچسپی صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ طالب علم سیکھنے لگتا ہے بچوں میں لکھنے پڑھنے کا جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے، وہ کاغذ، سلیٹ، کتابوں دیوار اور فرش پر چاک پیں، کوئلہ سے لکھتے ہی جاتے ہیں، یا لکیریں ہی گھسیٹتے رہتے ہیں، جیسے جیسے وہ سیکھنے لگتا ہے اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ تعلیم کا اصل مسئلہ تعلیم کے زمانہ میں اس ذوق و شوق کو مسلسل برقرار رکھنے کا ہے۔ یہ کام چند دن یا ہفتوں کا نہیں بلکہ مسلسل دس بارہ برس کا ہے۔

۱۹۸۴ء کی بات ہے کہ جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ دہلی کی مرکزی سرکار میں کوئی ۶۴ سکریٹریز ہیں، جن پر سارے ہندوستان کی حکومت کا دارومدار ہے اور جن سے ۵ منٹ کی ملاقات کے لئے اچھے اچھے لوگوں کو پندرہ پندرہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ شام ہوئی میاں بیوی دونوں اپنے بچوں کی تعلیم اور ہوم ورک میں مدد دینے کے لئے گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہم میں ایسے کتنے ماں باپ ہیں جو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مہینوں اور برسوں میں ایک دو گھنٹہ ہی سہی بیٹھ گئے ہوں۔

اس سارے مضمون کا ماحصل یہی ہے کہ آپ آج ہی سے طے کر لیں کہ اپنے عزیز وقت کا حصہ جیسا دوسرے کاموں پر صرف ہوتا ہے لازماً اپنے بچوں کے ساتھ گھنٹہ دو گھنٹہ روزانہ بیٹھ جائیے، چاہے آپ پڑھے لکھے ہوں یا نہ ہوں۔ آپ کی نگرانی بہت

کافی ہے جو پڑھا سکتے ہوں وہ تو بہت اچھا ہے۔اس میں نہ تو بڑے منصوبے کی ضرورت ہے نہ سرمایہ کی۔

اس مضمون کو شائع ہوئے کوئی دس ماہ گذر گئے۔یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بعض حضرات نے اس تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ایسے چند خاندانوں سے یہ مضمون نگار شخصی طور پر واقف ہے اور ایک جدہ میں رہنے والے صاحب نے بتلایا کہ وہ خود اور ان کی بیوی باری باری سے ایک ایک گھنٹہ اپنے دو بچوں کے ساتھ شام میں بیٹھ جاتے ہیں۔یہ دونوں جماعت میں ہمیشہ ناکام رہتے، لیکن اب یہ نہ صرف کامیابی کے نمبر لا رہے ہیں۔بلکہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے اور کبھی کبھی تو وہ اپنے ساتھیوں سے مقابلہ اور سبقت لے جانے کی باتیں بھی کرنے لگے ہیں۔اس قسم کے خیالات اکثر والدین ظاہر کرتے رہے ہیں۔اگر اتنا بھی عملی اقدام اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کرلیا ہے تو یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔یہہ پیغام عمل ہے جہاں تک پہنچے۔

اچھا استاد

ایک پرانا لیکن سچا قصہ یوں ہے کہ کوئی مہتمم تعلیمات ایک تحتانیہ مدرسہ کے معائنہ کے لئے تشریف لے گئے، بچے ہیں کہ شور و شغب اور کھیل کود میں مصروف ہیں ۔ استاد ہیں کہ بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہیں ۔ مہتمم صاحب کو غصہ آنا ضروری تھا کہ مولوی صاحب میں چاہتا ہوں کہ مدرسہ میں " PIN - DROP SILENCE" ہو استاد نے جواب دیا کہ ایسی خاموشی آپ کو صرف قبرستان میں مل سکتی ہے ۔ یہ بچوں کا اور زندگی کا مدرسہ ہے ۔

استاد کو دو فائدے ایسے حاصل ہیں جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کو حاصل نہیں ، ایک تو اس کا تعلق راست چلتی پھرتی اچھلتی کودتی زندگی سے ہوتا ہے ۔ طلبہ چاہے بچے ہوں کہ بڑے ، ان کی بے پناہ توانائیاں ، جذبات ، شوخیاں اور شرارتیں اسکول کی فضا کو بے حد حسین بنائے رکھتی ہیں ، استاد کا تعلق راست اسی بجلی کے تار سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل و دماغ کی روشنی تیز ہوتی جاتی ہے ۔ اس کی روح اور جذبات کو ایسی غذا ملتی ہے جس سے وہ سرشار رہتا ہے ۔ بہت سے قابل ترین لوگ ہیں ، جو کسی دفتری کام یا کاروبار میں لگ گئے ہیں ، انھیں اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا شاید ہی کبھی موقع ملتا ہو ۔ ان کی باتیں ان کے دل ہی میں رہ جاتی ہیں وہ ایک قسم کی گھٹن محسوس کرنے لگتے ہیں ۔ شخصیت کی نشو و نما کے لئے اظہار ضروری ہے اور استاد کو یہ موقع ساری عمر نصیب رہتا ہے ۔ وہ اپنی جماعت میں سبق ہی نہیں پڑھاتا بلکہ سبق کے دوران میں اپنے دل کی بات کچھ اس طرح پہنچا دیتا ہے جو طلبہ کی شخصیت کے نکھار اور ابھار کے لئے وہی بات ان کی زندگی کا اثاثہ بن جاتی ہے اس کی ایک اچھی مثال شیر کشمیر شیخ عبداللہ نے اپنی سوانح حیات "آتش چنار" میں دی

ہے وہ اپنے قیام علی گڑھ کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"وہ واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔جو ہمارے استاد فلسفہ یم یم شریف کی ذات سے وابستہ ہے، انھوں نے ایک بار طلبہ سے خطاب کیا انھوں نے نصیحت کی کہ اپنے جائز حقوق کے لئے کسی سے ڈرنا نہیں چاہے ان کی زبان میں ایک رعد کی کیفیت تھی اور یہ بات ان کی زبان سے نکلی اور میرے دل میں ترازو ہو گئی ۔۔۔۔۔۔۔میں نے زندگی کے مشکل مرحلوں میں اسے یاد کیا ہے" ۔۔۔۔

اچھا استاد پڑھانے میں بھی استاد ہوتا ہے۔وہ اپنے مضمون میں نہ صرف کمال پیدا کرتا ہے۔بلکہ مختلف طریقہ ہائے تعلیم سے وہ اچھی طرح واقف رہتا ہے وہ اچھے اساتذہ سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور پڑھانے میں اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے۔

ماہرین تعلیم جانتے ہیں کہ پڑھانا بھی ایک فن ہے بلکہ ہر اچھا سبق آرٹ کا نمونہ ہوتا ہے۔پڑھانا یہ نہیں کہ "کوئی شخص ایک بکٹ پانی دوسری بکٹ میں انڈیل دے (ہمایوں کبیر) اور نہ ذاکر صاحب کی زبان میں "استاد کی نوٹ بک سے طالب علم کی نوٹ بک میں منتقل کر دے" ۔۔۔۔۔

تعلیم کا ذریعہ ذہن و دماغ اور روح کے راستوں سے ہے۔استاد کے ذہن کی رسائی طلباء کے ذہن تک ضروری ہے جو ظاہر بہت پیچیدہ ہے۔جس کا بیان الفاظ میں آسان نہیں، یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ استاد کو اپنے پیشہ سے عشق ہو، اخلاص ہو، خون جگر دیا ہو۔ورنہ:۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

آخر استاد طلباء کو کیا دیتا ہے؟ وہ سب اسباق جو اس نے پڑھائے ہیں، وہ تو

سب چند دن کے اندر اندر امتحان کے ساتھ ہی دل و دماغ سے غبار خاطر کی طرح اڑ جاتے ہیں صرف چند باتیں اور یادیں رہ جاتی ہیں۔ اچھا استاد طلبہ میں غیر محسوس طریقہ سے رواداری، دوسروں کے ساتھ رہنے بسنے اچھے شہری بننے اور چند بنیادی اقدار سے واقف کرادیتا ہے جیسے حسن و خوبی کی پرکھ، سچائی کی تلاش کا جذبہ اور نیکی پر عمل کرنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ یہی وہ سب اجزا ہیں جو شخصیت کا حصہ بن جائیں تو ہم کلچر کہتے ہیں۔ اسی کو غلام السدین "روح تہذیب" کہتے ہیں۔ اسی کو رادھا کرشن FRAGRANCE OF THE SOUL روح کی خوشبو کہتے ہیں۔

اچھے استاد کی پہچان کسی صدر ادارہ یا ماہر تعلیم کے لئے بھی مشکل ہے۔ اس کی کسوٹی چھوٹے معصوم بچوں سے لے کر یونیورسٹی سطح کے طلبہ ہی ہو سکتے ہیں کسی چھوٹے بچے سے پوچھیئے تمہارے ہاں کون سب سے اچھے ٹیچر ہیں؟ وہ فوراً نام بتادے گا اب پوچھیئے ان میں کیا خاص بات ہے؟ وہ کچھ سوچے گا، سر ہلائے گا، لیکن کچھ کہہ نہ سکے گا بچوں میں اپنے ٹیچر کو جانچنے اور پرکھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے وہ ٹیچر کی ذات میں وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ جو شاید ٹیچر بھی اپنے متعلق نہ جانتا ہو۔ ان کے نزدیک جو اچھا ہے وہی اچھا استاد ہے طلبہ اس کی عظمت سے واقف نہیں لیکن اس کی عزت و محبت ان کے دل میں گھر کر جاتی ہے اچھے استاد کے لیے دنیا کا کوئی انعام اس سے بڑا نہیں استاد کو یہ عزت و شہرت بس یونہی حاصل نہیں ہو جاتی وہ خاموش اپنے پیشہ میں کوئی تہائی صدی تک مصروف رہتا ہے۔

اس کا کام کوئی دو چار دن دو چار مہینوں میں ختم نہیں ہوتا
اس کے مزاج کو طوفانی ہواؤں سے کوئی نسبت نہیں وہ
ایک نسیم سحری ہے جو بہت خراماں چلتی رہتی ہے، نہ

اس کا نام اخباروں میں آتا ہے اور نہ اسے کوئی پھولوں کے
ہار پہناتا ہے۔ وہ ایک گمنام اور نیک نام شخصیت کا مینار ہے
اس کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ برسوں کی عرق ریزی کے بعد
بے ہنگم پتھروں کو تراش کر وہ ہیروں میں تبدیل کرتا رہتا
ہے

اس کی ذات ہمدردی اور محبت کا جیتا جاگتا سرچشمہ ہوتی ہے مشہور زمانہ ماہر تعلیم پستالوزی کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ کلاس روم میں داخل ہوتا تو چھوٹے بچوں کو پہلے سلام کرتا۔ کسی نے وجہ پوچھی جواب دیا مجھے معلوم نہیں کہ ان بچوں میں کون بڑا فلسفی کون بڑا آدمی یا معلم انسانیت بیٹھا ہوا ہے میں شاید اس وقت ان کی تعظیم کے لیے زندہ نہ رہوں گا۔

"جب سب لوگ کسی بچہ کی تعلیم و تربیت سے مایوس ہو
جاتے ہیں تو پھر بھی دنیا میں دو آدمی ایسے ہیں جو اس بچہ سے
مایوس نہیں ہوتے ایک اس کی ماں اور دوسرا شفیق استاد"

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ

کوئی تیس برس قبل کی بات ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر ایک آل انڈیا سمینار حیدرآباد جوبلی ہال میں ہوا تھا۔ اس میں ملک کی مشہور سوشیل ورکر شریمتی درگا بائی دیس مکھ نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔ سالانہ امتحان میں بھائی فیل ہوگیا اور بہن کامیاب ہوگئی۔ دوسرے دن ان کے ماں اور باپ دونوں ایک درخواست کے ساتھ اپنی لڑکی کو لے کر ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچے اور خواہش کی کہ بہن کو فیل کر کے بھائی کو ترقی دی جائے۔ اس کے لیئے بہن راضی ہو چکی تھی۔

صالحہ عابد حسین نے مولانا الطاف حسین حالی کی مختصر سوانح حیات بچوں کے لئے لکھی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ مولانا حالی اپنی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ کو بہت چاہتے تھے۔ جب وہ چھوٹی سی تھیں تو اس وقت پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ انھیں بس قرآن شریف پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ لکھنا سیکھنا تو لڑکیوں کے لئے بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہ لکھنے پڑھنے کی بہت شوقین تھیں۔ یہ توے کی کالک کی سیاہی اور لکڑی کا قلم بنا کر چھپ کر آسان اردو کی کتاب سے نقل کر کے لکھنا سیکھ گئیں۔ ایک دن ان کی دادی (حالی کی بھاوج) نے دیکھ لیا۔ خفا ہوئیں۔ اور حالی سے کہنے لگیں۔ "مبارک ہو اب تمھاری لڑکی خط پتر لکھا کرے گی خوب خاندان کا نام روشن ہوگا"۔ حالی نے سنا تو ہنس پڑے اس لڑکی کو خود لکھنا سکھایا۔ پھر اس کے بعد خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ہوا۔ یہ بات کوئی ایک سو برس پہلے کی ہے۔ "نئی تعلیم پھیلانے کا کام سرسید نے کیا لیکن مسلمان لڑکیوں میں تعلیم پھیلانے کا کام ڈپٹی نذیر احمد اور حالی نے شروع کیا"۔ اسی زمانے میں اکبر الہ آبادی آزادئ نسواں اور تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ ان کے اکثر اشعار میں لڑکیوں کی تعلیم و ترقی پر گہرا

اطنز موجود ہے۔

حامدہ چمکی نہ تھی ، تعلیم سے بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی بارہ تا پندرہ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ان کی نصف آبادی (۴۹) فی صد عورتوں پر مشتمل ہے۔ان میں پڑھی لکھی عورتیں صرف ایک فی صد ہیں۔اور مسلمان مردوں میں ۱۹فی صد پڑھے لکھے ہیں۔اس طرح جملہ ۲۰ فی صد آبادی پڑھی لکھی ہے۔اور ۸۰ فیصد ناخواندہ ہیں۔دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں علم و عقل کا (۸۰) فی صد خطہ ابھی تک بنجر ہی رہ گیا ہے یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ ہماری نصف آبادی کو پڑھنے لکھنے سے دور رکھا گیا ہے۔لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ سینکڑوں برس سے ہماری بے دلی، بے توجہی اور وبے حسی کا شکار رہا ہے۔

آج بھی اگر آپ اکثر ماں باپ سے لڑکیوں کی تعلیم پر گفتگو کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے لئے تعلیم کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

ہم کیوں نہیں پڑھاتے

اوپر کی دو مثالوں سے یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ ہی نرالا ہے اور پھر زمانہ قدیم سے جو روایات چلی آرہی ہیں وہ تو لڑکیوں کی تعلیم میں زبردست رکاوٹ ہیں۔جس طرح ہم لڑکوں کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں اور ان پر جو کچھ روپیہ خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں ویسے ہی بیٹی کے لئے نہ تیار ہیں اور نہ ضروری سمجھتے ہیں۔چند ایک وجوہات تو ہم سب جانتے ہیں۔

(۱) لڑکی کے روز پیدائش ہی سے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس پر جو کچھ خرچ ہوگا وہ سب

پرایا ہے۔ اصل کام تو اس کی پرورش ہے اور بڑی ہو جائے تو شادی ہو کر دوسرے گھر چلی جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

(۲) چند لڑکیوں کا حال ہمیں معلوم ہے۔ وہ چھٹی اور ساتویں جماعت تک تو بہت تیزی سے پڑھتی گئیں اس کے بعد اسکول سے غائب رہنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ گھر میں چھوٹے بھائی بہنوں کا اضافہ ہو گیا ہے ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ان بڑی بہنوں کو لگ گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اسکول چھوٹ گیا۔ خاندان میں افراد کی زیادتی سے گھر بار اور چولہے کا کام بڑھ گیا۔ ماں کا ہاتھ بٹانے کے لئے بڑی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ بس ان کی تعلیم پر بریک لگنا شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بہت کم میٹرک کی سطح تک پہنچ پاتی ہیں۔

(۳) ساتویں آٹھویں جماعت میں پہنچنے تک لڑکیاں سیانی ہو جاتی ہیں۔ مائیں گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔ یہ زمانہ تعلیم کے ترک کرنے یا جاری رکھنے کے لئے فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے۔

(۴) آج کل تعلیم پر اخرجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ اسکول کی فیس سواری کا خرچ مہنگی کاپیاں کتابیں یونیفارم پر کافی خرچ آتا ہے جن خاندانوں میں چار پانچ بچے ہوں تو ترجیح لڑکوں کی تعلیم پر دی جاتی ہے۔ غریب خاندانوں میں لڑکیاں کچھ نہ کچھ محنت مزدوری کر کے سات آٹھ سال کی عمر ہی سے آمدنی میں اضافہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ متوسط طبقہ میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ لڑکی کی تعلیم کے اخراجات کس حد تک برداشت کئے جائیں۔ اگر زیادہ قابل بھی بنا دیں تو پھر سسرال ہی کا فائدہ ہے۔

(۵) جن گھروں میں کچھ فراغت ہے وہاں پر بھر میٹرک انٹر کے بعد لڑکیوں کی تعلیم پر بریک لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب فکر ان کے ہاتھ لال پیلے کرنے کی ہوتی ہے۔ اگر

کہیں پیام طے نہیں ہوا ہے تو ان کی تعلیم ویٹنگ روم میں انتظار کرنے کی ہوتی ہے۔ کسی وقت دولہا آیا اور دوسری ٹرین سے انہیں ساتھ لیتا گیا چاہے گریجویشن کا امتحان مہینہ دو مہینہ ہی رہ گیا ہو یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا سچ تو یہہ ہے کہ پھر کبھی نہیں دیکھا جائے گا۔

لڑکیوں کی تعلیم کیوں ضروری ہے

جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم اور ذہانت کا تعلق ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ فطرتاً لڑکیاں زیادہ محنتی اور دلچسپی سے پڑھنے والی ہوتی ہیں تعلیم میں انہماک قابل داد ہوتا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے بہت رشک کرتی ہیں اس لئے شاید مقابلہ کی اسپرٹ بہت کام کر جاتی ہے وہ اکثر لڑکوں کے مقابلہ میں تعلیم میں بہت آگے رہتی ہیں حال ہی میں تعلیم نسواں کے سلسلہ کے سمینار میں وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے بتایا کہ یونیورسٹی میں (۲۰) فی صد طالبات ہیں لیکن گولڈ میڈل پانے والوں کی فہرست میں (۸۰) فی صد لڑکیاں ہوتی ہیں۔

لڑکیوں کو جاہل اور ان پڑھ رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پر بہار درخت ساری عمر پھول اور پھل سے محروم رہ گیا ہو ایک لڑکی کی تعلیم سے پورا خاندان روشن ہو جاتا ہے۔وہ جس گھر میں جائے گی عزت پائے گی ہمارے تجربہ میں یہہ بات آئی ہے کہ جو لڑکیاں بی ایڈ کامیاب ہو گئیں ان کے جلد جلد بیاہ ہو گئے ان کی وجہ سے خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہو یا نہ ہو اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ نئے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی صلاحیت اپنے میں پاتی ہیں۔ بہت جلد اس گھر میں باعزت مقام پیدا کر لیتی ہیں پڑھی لکھی بہو سارے خاندان میں ایک جگمگاتا چراغ ہے صورت شکل کے ساتھ پڑھی لکھی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں بات کرنے کا سلیقہ تہذیب و شائستگی اور خود

اعتمادی ان کی شخصیت کو چار چاند لگاتی ہیں ۔ جو لڑکیاں پڑھی لکھی نہیں ہوتیں گو خوبصورت ہی کیوں نہ ہوں اکثر انہیں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے ۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ابھی تک کسی سنجیدگی کے ساتھ ملک میں تحریک کا مقام حاصل نہ کر سکا ۔ اس سلسلہ میں ہمارے ذمہ دار لیڈر رہنما دانش ور اور درمند حضرات کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے لڑکیوں کو کم از کم ساتویں جماعت تک تعلیم دلوانا ضروری سمجھا جائے جو میٹرک تک پڑھالیں تو بہت اچھا ہے ۔

عورت کی عظمت کا راز اقبال نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے سوز دروں پیدا

جب عورت پڑھی لکھی نہ ہو تو تصویر کائنات میں رنگ بے رنگ رہ سکتا ہے ساز کے تاروں سے زندگی کے وہ سب راگ پیدا نہ ہو سکیں گے جو ایک اچھی تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہیں ۔ اکبر الہ آبادی جو تعلیم نسواں کے مخالف ہونے کے باوجود وہ اس بات کے قائل ہیں ۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے
ایسی معاشرت میں سرا سر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

بچوں کی تعلیم پر سزا کے اثرات

کوئی تین دہوں قبل کی بات ہے کہ مہاراشٹرا کے ایک مڈل اسکول میں چھٹی جماعت کی ایک لڑکی نے کسی ہم جماعت لڑکے کو پریم پتر لکھا، کسی طرح یہ پتر اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ لگا، ہیڈ ماسٹر غصہ میں آپے سے باہر ہوگئے اور لڑکی کو بید سے بے تحاشہ مارنے لگے، یہاں تک کہ لڑکی اسکول ہی میں دم توڑ دی، عدالت میں مقدمہ چلا ہیڈ ماسٹر کو بارہ سال کی قید بامشقت سزا سنائی گئی۔

ایک مولوی صاحب بچے کو حفظ کروارہے تھے بچہ اپنی ٹانگ پلنگ کی نوار میں چھوڑ بیٹھا تھا، کہیں پر غلطی ہوئی حافظ جی نے اس زور سے طمانچہ رسید کیا کہ بچہ پلنگ سے الٹ گیا۔ٹانگ نوار میں پھنسی ہوئی تھی ران سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ماں باپ بچہ کی تڑپ پر دم بخود اور حافظ جی پسینہ میں شرابور۔

کھمم میں پر ایک مولوی صاحب سربازار ایک دکان میں ۲۵، ۳۰ بچوں کو عربی پڑھا رہے تھے میری ایک لڑکی ساتھ تھی جس کی عمر چار سال تھی۔وہاں سے گذر ہوا تو مولوی صاحب ایک بچی کو مارتے جاتے تھے اور پڑھنے کے لئے مجبور کرتے جاتے ہچکیوں کے درمیان الفاظ عجیب طرح ٹوٹتے جاتے میں نے اپنی بچی سے کہا دیکھو قرآن پڑھنے کے لئے تمہیں بھی کل سے اس مولوی صاحب کے پاس بھیجتا ہے لڑکی بول اٹھی میں ہرگز قرآن نہیں پڑھوں گی۔

جن کی عمریں آج پچاس ساٹھ سال سے متجاوز کر چکی ہیں وہ جانتے ہیں کہ قدیم اسکولوں میں سخت سزاؤں کا رواج عام تھا، ہر مدرسہ میں ایک یا دو استاد ایسے ہوتے جو پوری آبادی میں بچوں کو مارنے میں مشہور تھے حساب کا گھنٹہ مار کھانے کے لئے

پروفیسر چیچوف ایک بلی کا بچہ پالا، ایک دن ایک چوہا اس بلی کے بچے کے سامنے سے گذرا، بلی کے بچہ کے لئے یہ تجربہ نیا تھا گھبرا گیا اور کچھ سوچ میں پڑ گیا اس پر اس پروفیسر کو اس بزدل بچہ پر بڑا غصہ آیا اور اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ بلّی کا بچہ بڑا ہو کر بلاوڑ بن گیا۔ جب بھی کوئی چوہا اس کے سامنے سے گزرتا تو بجائے جھپٹ کر اس کو دبوچ لینے کے وہ تھر تھر کانپنے لگتا " اس کو نفسیات " میں مشروط اضطراری فعل " کہتے ہیں ۔جب کسی واقعہ سے تلخ تکلیف وہ تجربہ منسلک ہو جائے تو بعد کے ہر تجربہ کے ساتھ وہی احساس لوٹ کر آجاتا ہے ۔اس مثال میں آپ کو کام کی بات مل گئی ہوگی بلاوڑ اس تلخ تجربہ کی وجہ اپنی فطری جبلّت سے محروم ہو گیا۔ جب بھی چوہا نظر آتا اس کی فطری قوت برف کی طرح رگوں میں منجمّد ہو جاتی انگریزی حساب یا کسی اور مضمون کے ساتھ ہی جسمانی سزاؤں کا تجربہ ہو تو اس مضمون سے عدم دلچسپی کا نتیجہ ہو جاتا ہے ۔بلکہ ان مضامین سے نفرت ہو جاتی ہے جو ساری زندگی قائم رہتی ہے۔

اوپر کی چند مثالوں کی روشنی میں ہمیں چند کام کی باتیں نظر آتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ اسکولوں میں جسمانی سزاؤں کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔

جدید تعلیمی پالیسی کے عملی پروگرام میں یہ بات
واضح کر دی گئی ہے کہ ملک کے تمام اسکولوں میں جسمانی
سزاؤں کا رواج بند کر دیا جائے گا اب کوئی ٹیچر بچوں پر ہاتھ
نہیں اٹھا سکے گا۔ (لیکن دیہات کے اسکولوں میں اس پر شاید
ہی کسی دن عمل ہوتا ہے)

بچے عام طور پر معصوم ہوتے ہیں انہیں اتنی عقل نہیں کہ وہ سب کچھ سمجھ

جائیں جو بڑے برسوں کے تجربہ کے بعد سمجھ چکے ہیں ۔اس لئے ان کی بہت سی باتوں اور شرارتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے ۔لیکن اس کے باوجود انہیں وقتاً فوقتاً سزا دینی ضروری ہے تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کی حرکت نہ کرسکیں لیکن اس کی سزا بروقت دینا مناسب ہے، سزا کو ملتوی رکھا جائے تو سارا وقت ذہنی پریشانی میں گزرتا ہے ۔

ہر بچہ کی ایک بھرپور ابھرتی شخصیت اور انا ہوتی ہے لیکن وہ بڑوں کے سامنے لاچار و مجبور ہوتا ہے ۔اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاکر بڑے اس کو سزائیں دیئے جاتے ہیں ۔اس کی انا کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے آئے دن سزا ملتی رہے تو اس کی شخصیت ابھر نہیں سکتی، اور ٹھٹھر کر رہ جاتی یہ ۔تو جسمانی سزا کے علاوہ دوسری قسم کی سزائیں جیسے کھانا بند کردینا گھر سے نکال دینا، کمرہ میں بند کردینا، اپنے ہی بچوں سے ایک کو الگ کردینا سوشل بائیکاٹ، خاندان کے افراد اور دوست احباب کے سامنے اپنے بچوں کی شکایت و حکایت بیان کرنا یہ سب باتیں بچوں کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالتی ہیں، بعض مائیں بچوں کو خود تو نہیں مارتی ہیں بلکہ بچوں کے باپ شام میں آئیں یا دوسرے مقام سے ہفتہ عشرہ میں آئیں، بچوں کے جرائم کی فہرست تیار رکھتی ہیں، آتے ہی اباّجان نے بچوں کی وہ مرمت کی کہ دوسرے دورہ تک حالات قابو میں رہے، لیکن یہ محض خیال ہے ۔

بعض اسکولوں میں طلبہ کو سخت ڈسپلن کا پابند بنایا جاتا ہے اور بعض گھروں میں عجیب تناؤ (TENSION) قائم رہتا ہے ۔بعض والدین چڑچڑے مزاج کے ہو تے ہیں کچھ عرصہ قبل کسی صاحبزادی نے اپنے والد کے انتقال پر ایک مضمون لکھا تھا جو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں پروفیسر تھے ۔جیسے ہی اباجان گھر میں داخل ہوتے سارے افراد خاندان کو سانپ سونگھ جاتا، سارے گھر پر تناؤ کی فضا قائم رہتی

آپس میں

باتیں بھی اشاروں میں ہوتیں ۔ جب وہ گھر سے جاتے تو سب کے چہروں پر بشاشت آتی ہے ۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد سارے گھر والوں کو امن چین نصیب ہوا اس صاحبزادی کو یہ مضمون لکھنے کے لیئے کئی برس انتظار کرنا پڑا ہو گا

تعلیم کے دوران سزائے جسمانی ہو یا غصہ ڈانٹ ڈپٹ گالی گلوچ یہ سب کچھ بچہ کا موڈ (MOOD) خراب کر دیتی ہیں ۔ تعلیم کے لئے سکون و اطمینان قلب اور بشاشت نہایت ضروری ہیں ۔

سزائے جسمانی کی تکلیف ، دماغی اور روحانی کوفت میں تعلیم کا کام صفر سے گذر کر منفی ہو جاتا ہے ۔

اس مضمون سے نفرت ہو جاتی ہے یہ ایک ایسا عظیم نقصان ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے ، بعض اساتذہ بچوں کو کلاس میں بالکل خاموش رہنے کی سزا دیتے ہیں ۔ بچوں میں چیخنے چلانے ، کھیل کود ، لڑنے جھگڑنے ۔ رونے پیٹنے تماشہ بننے اور دیکھنے کے جذبات بہت زیادہ ہوتے ہیں ۔ خاموش بٹھانا سزائے جسمانی سے زیادہ روحانی عذاب ہے ۔ اگر آپ نے کسی لیڈر کے مرنے پر دو منٹ کی خاموشی منائی ہو تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ دو منٹ بھی ہم پر کیسے گزرتے ہیں ۔

تعلیمی ماحول ، خاص محبت ، شفقت اور ہمدردی کا ہے ۔ تعلیم کا عمل صرف گھر یا مدرسہ کی خوشگوار فضا میں ہی جاری رہ سکتا ہے ۔ جہاں یہ فضا کسی نہ کسی وجہ سے خراب ہو جائے اور تناؤ پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہاں تعلیم کا کام بند ہے گو پڑھائی جاری ہے ۔ "بچوں کو ماں باپ سے فطری

محبت ہوتی ہے اور یہ سچی محبت ماں باپ کے لئے ایک گراں بہا خزانہ ہے لیکن بچوں کو سزا دے کر انھیں اس محبت کو بچوں کے کام کو فرض اور ذمہ داری میں تبدیل کرنے کی کوشش لاحاصل ہے۔"

کوچنگ سنٹرس کے قیام کی اہمیت

مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر چند دنوں سے اخباروں میں کچھ لکھا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پستی کے اسباب کا اعداد و شمار کی روشنی میں تجزیہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عملاً اس وقت کیا کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ تعلیم کا مسئلہ، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی زبان میں سیاست کی طرح کوئی پہاڑی نالا نہیں ہے، جو اچھلتا کودتا کہیں وادی میں جا گرتا ہے۔ تعلیم تو ایک خاموش دریا ہے، جو اطراف و اکناف کی وادیوں کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مگر اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تعلیم کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے اور برسوں کی مسلسل کوشش کے بعد اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس میں بعض حضرات جتنی جلد بازی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تعلیم نہیں وہاں جہالت و غربت، افلاس و نکبت، بے روزگاری و بے کاری بد قسمتی اور فاقہ مستی، وقت گزاری اور نامرادی، تنگ نظری و تعصب ایک ہی مقام سے وابستگی و پابہ زنجیری عام روگ ہیں جو کئی ایک معاشی و معاشرتی اور سیاسی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ ان کا مداوا حکومت اور لیڈران قوم وقتی مسائل کے طور پر حل کرنے میں بہت وقت اور توانائی ضائع کرتے ہیں۔ لیکن مسائل جوں کے توں رہ جاتے ہیں۔ ان سب کا علاج ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ وہ ہے تعلیم کو عام کرنا۔ تعلیم ہی ایک ایسا پارس ہے جو خود انسان کو بدل دیتا ہے اور ایسا کمال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ جوہر قابل دوسروں کو بھی پارس بنا سکتا ہے۔ کچھ دنوں پہلے جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ، حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ مدینہ پبلک اسکول میں "مسلمانوں کے تعلیمی مسائل" پر ایک نہایت جامع اور پر مغز تقریر کی تھی۔ جس میں ایک بات تو لکھنے کی یہ ہے کہ سرسید کے انتقال کو آج ۸۸ برس ہوگے۔ لیکن سرسیدؒ کے بعد پھر کسی مسلم دانشور یا لیڈر نے کبھی مسلمانوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی آپ نے بتلایا کہ ایک عرصہ سے تعلیم کے شعبہ سے وابستگی کی وجہ اور سارے ہندوستان کی سیر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کے اس وقت ہندوستان کے اہم تعلیمی مسائل کیا ہیں۔ موصوف نے مندرجہ ذیل مسائل کی نشاندہی کی۔

(۱) طلباء کے لئے کوچنگ سنٹرس کا قیام۔ (۲) لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دینا۔ (۳) ماں باب کا اپنے بچوں کو گھر پر پڑھانے کے لئے اپنی دوسری مصروفیات کو کاٹ کر کم از کم ایک گھنٹہ کا وقت روز دینا۔ (۴) پرائمری اسٹیج پر طلبا کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کرنا۔ دوسرے الفاظ میں جتنا BASE یا بنیادی تعلیم کا پھیلاؤ وسیع ہوگا اتنا ہی اوپر اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی امیدواروں کی تعداد بڑھے گی اور بھی بہت سی کام کی باتوں کے ساتھ یہ کہا کہ اس وقت سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں وہ "کوچنگ سنٹرس" کے قیام کو نمبر ایک مسئلہ قرار دیتے ہیں یہ بات ذرا چونکا دینے والی تھی کیونکہ عام طور پر اس طرف کبھی ذہن گیا نہیں تھا۔ غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس دانشور کی نظر اس بنیادی مسئلہ پر گئی۔ آپ نے یہ بھی بتلایا کہ ای، اے، ایس۔ ای، پی، ایس بنکنگ وغیرہ کے لئے کوچنگ کا انتظام گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ انٹر میڈیٹ کے بعد ہی سے شروع ہونا چاہیئے۔ یہاں پر سید حامد صاحب کی پرزور تائید کے ساتھ کوچنگ سنٹرس کی بات کو ذرا پھیلا کر پیش کرنا مقصد ہے تاکہ مسلم ادارے اور بااثر شخصیتیں جن میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل

سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے وہ اس پہلو پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ "کوچنگ سنٹرس" دراصل متوازی تعلیمی نظام کی ایک شکل ہے۔ حکومت اور مختلف اداروں کی طرف سے جن اسکولوں میں فارمل یا روایاتی تعلیم دی جاتی ہے وہاں پر طالب علم پر انفرادی توجہ جتنی دی جانی چاہیئے وہ کسی حال ممکن نہیں۔ سبق کے بعد سبق آگے بڑھتے جاتے ہیں، چند بنیادی کمزوریاں ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں کچھ ایسی رہ جاتی ہیں کہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر پہنچنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں خصوصاً ریاضی، انگریزی سائنس یہ تینوں مضامین کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اگر ابتدائی جماعتوں میں خاص طور پر پرائمری اور سکنڈری درجوں میں ان مضامین کی خاطر خواہ تعلیم اور کمزوریاں دور نہ ہوں تو پھر آگے کی تعلیم کی ہر منزل پر یہ نقص کسی نہ کسی طرح سامنے آتا رہتا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ جو خلاء یا نقص بنیادی تعلیم کے زمانے میں ایک معمولی نقطہ معلوم ہوتا ہے، وہ پھیل کر رفتہ رفتہ ایک دائرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ساری تعلیمی ترقی کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ سب کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کو"چنگ سنٹرس دراصل ساتویں جماعت ہی سے شروع کرنا ضروری ہے۔ جب کہ طلباء کی عمر ۱۲/ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ انھیں اہم مضامین میں کوچنگ دینے کا یہی مناسب زمانہ ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ میٹرک کا نہایت اہم امتحان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ طلبہ اپنی چند ایک کمزوریوں کی اصلاح ہوتے ہی اپنی ہم جماعت طلبہ کے مقابل میں تیز ہو جاتے ہیں جو انھیں کلاس میں ممتاز بنا دیتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو طالب علم کو آگے بڑھانے میں بجلی کے کرنٹ کے طور پر کام کرتا ہے ماہرین تعلیم جانتے ہیں یہ شوق اور جذبہ کا پیدا کرنا ہی تعلیم کی اصل روح ہے۔ یہ پیدا ہو گیا تو پھر آگے کا کام آسان ہے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے، جب کہ طالب علم کی کمزوریاں

ابتدائی جماعتوں ہی میں دور کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ بعض مائیں باپ سے
زیادہ بچوں کی تعلیم پر توجہہ دیتی ہیں اور وہ خود پڑھاتی ہیںتا کہ ان میں وہ خود اعتمادی
پیدا ہو جو ایک اچھے طالب علم کا طرہء امتیاز ہے۔اسکولوں میں اتنا وقت کہاں وہاں تو
مقررہ نصاب پورا کرنے کی دھن رہتی ہے اوسط طالب علم اس دوڑ میں پیچھے رہ
جاتے ہیں، کمزور تو کبھی کی ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ذہین طالب علم بھی اپنی تشنہ کامی سے
کچھ مایوس سا ہو جاتا ہے۔بہر حال اسکول کی تعلیم سے کوئی بھی خوش نہیں رہتا۔
دیکھتے ہی دیکھتے امتحان آجاتا ہے۔جس کے نام سے ہمارے طلبہ کے اوسان خطا ہو
جاتے ہیں۔ان حالات میں جب تک گھر پر روزآنہ دو گھنٹے طلبہ کی تعلیم پر خاص توجہ نہ
دی جائے۔خاطر حواہ نتائج نکلنے کی توقع رکھنا عبث ہے۔لیکن یہاں یہ عرض کرنا
ضروری ہے کہ جو ماں باپ خود تعلیم یافتہ ہیں۔ٹیوشن کا انتظام کرتے ہیں۔لیکن
ہمارے یہاں اکثر ماں باپ خود پڑھے لکھے نہیں ہیں۔گھر کا تنگ و تاریک ماحول
سکون سے پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔غربت اور جہالت کا سایہ غریب مگر ذہین
طلبہ پر کچھ ایسا منڈلاتا رہتا ہے کہ ان کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ایسے طلبہ کے لئے اچھے
کوچنگ سنٹرس ہی کچھ کر سکتے ہیں۔اس سلسلہ میں مدینہ ایجوکیشنل سوسائٹی محبوب نگر
کے کوچنگ سنٹر کی مثال قابل تقلید ہے۔کوئی چھ سال قبل تک مستقر محبوب نگر
کے ۱۳ فوقانی اسکولوں سے بس دو چار مسلمان طلبہ مشکل سے میٹرک کامیاب ہوتے
تھے بلکہ بعض اوقات ان کا نتیجہ صفر تک جاتا تھا۔اس سوسائٹی نے بڑی دوراندیشی
سے ایک کوچنگ سنٹر قائم کیا جہاں پر ساتویں سے دسویں تک کی جماعتیں طلبہ و
طالبات کے لئے باضابطہ شام میں ۵ تا ۹ بجے رات تک چلائی جاتی ہیں۔کوئی سترہ اساتذہ
جو اپنے مضمون کے ماہر ہیں پڑھاتے ہیں۔طلبہ سے فیس بھی لی جاتی ہے۔اور اساتذہ

کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے چند ہی برسوں میں طلبہ کی تعلیم کا معیار مستقر کے اسکولوں میں بہتر ہو گیا۔ گزشتہ سال ۳۰ طلبہ میں ۱۳ درجہ اول اور کوئی ۱۵ درجہ دوم اور طالبات میں ۵ درجہ اول اور نصف کے قریب درجہ دوم رہے۔ اردو ماڈل اسکول کی ساتویں جماعت کا نتیجہ ڈسٹرکٹ میں اول رہا۔ اور صدفی صد رہا۔ مخفی مباد کہ اس اسکول کی تعلیم مثالی ہے۔ اور نقل کرنے کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا لیکن اس سوسائٹی نے خاموش کام کو ترجیح دی ہے۔ اس کی مثال دینا ضروری تھا، کہ دوسرے کام کرنے والوں کی مناسب رہنمائی ہو۔ اس طرح کا کام محترم عائشہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں چند سال قبل "محفل علم و فن" کی جانب سے شروع کیا گیا ہے لیکن اس کام کو بہت تیزی سے مختلف سنٹرس پر ایک ساتھ پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ میٹرک کے طلبہ کے لئے چار چھ مہینوں کی کوچنگ سے اس پتھر میں جونک لگنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں کوشش قابل داد ہے اور قدم صحیح سمت پر ہے لیکن نتائج صرف اسی وقت بہتر ہو سکتے ہیں، جب کہ سنٹرس کی تعداد محدود کر کے کام میں باضابطگی پیدا کی جائے۔ مسابقتی امتحانات میں اکثر نوجوان باوجود تعلیمی شاندار ریکارڈ رکھنے کے وہ اپنی کمزریوں سے واقف رہتے ہیں اس لئے شریک ہونے سے ہی گریز کرتے ہیں۔ ان میں دوسری کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ زبانی انٹرویو سے گھبراتے ہیں، انھیں اس کی ٹریننگ نہ تو اسکول یا کالج میں دی جاتی ہے اور اسکول کی تعلیم ہر بات کی گہرائی اور گیرائی کا احاطہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اطراف واکناف جو کچھ دیکھتے ہیں ان کے متعلق بھی معلومات بہت مایوس کن ہوتی ہیں۔ اعلیٰ امتحانات میں انٹرویوز میں امیدواروں کو اتنا کھنگالا جاتا ہے کہ کوئی جوہر آبدار ہو تو تہہ سے اوپر آجاتا ہے۔ اور کہیں کنکر پتھر رہ گئے ہیں تو وہ تو سب سے پہلے

اچھل کود کر سامنے آجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے اچھے طالب علم بھی جن سے توقعات تھیں مایوس کر دیتے ہیں ۔یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ کوچنگ کے لئے تیار کرنا ہو اس کی پلاننگ انٹرمیڈیٹ یا گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ آٹھویں جماعت ہی سے شروع ہونا ہے ۔یہ کام ضرور مشکل ہے ۔لیکن جب تک اس کی بنیادی اہمیت کو نہ سمجھا جائے ۔ کوئی زیادہ مفید نتائج کی امید نہیں رکھی جا سکتی ۔جب تک پودوں کی نشو و نما کے وقت جڑوں کو کھاد اور آبیاری کا انتظام نہیں ہوتا وہ محض موسم کے رحم و کرم پر اگ آنے والے پودوں کی چند ہری بھری شاخوں اور پھول پتوں پر توجہ دینے سے یہ کام نہیں ہو سکتا اس کے لئے مندرجہ ذیل چند تجاویز درج ہیں جو عملی کام کرنے والوں کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

ا۔ ہر بڑے شہر اور ضلع کے مستقر پر دو چار چھ محلوں کو ملا کر کسی مرکزی مقام پر ایک کوچنگ سنٹر قائم کیا جائے اور ہر تعلقہ کے مستقر پر کم از کم ایک ایسا کوچنگ سنٹر تو ضرور ہو ۔

۲۔ اس اسکیم کے لئے سرمایہ اور کام کرنے والوں کی ایک فوج درکار ہوگی سرمایہ کے لئے مسلم وقف بورڈ ، فلاحی ادارے اور ایجوکیشن سوسائیٹیز اس طرف توجہ دیں ۔ البتہ کام کرنے والوں کا ملنا مشکل ہے ۔ایسی ہر اسکیم پر ہم نظری حیثیت سے تو بہت کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن اصل کام آکر کرنے والے کے پاس رک جاتا ہے ۔خود کرنے والوں میں ضروری قابلیت صلاحیت ، دیانتداری اور اخلاص کی ضرورت ہے ۔اس کے لئے سب وظیفہ یاب حضرات چاہے ان کا تعلق کسی محکمہ سے رہا ہو ان میں بہت سے قابل ترین لوگ پائے جاتے ہیں انھیں وقت بھی ہے اور فرصت بھی ہے ۔

فراغت بھی ہے۔ اگر وہ بچوں کی تعلیم کے کام کو اپنے ہی مقام پر اپنے ہاتھ میں لیں۔ تو یہ ملت پر بڑا احسان ہوگا۔ دیکھنے میں بظاہر یہ کام چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یقین مانیئے بنیادی طور پر اس سے زیادہ عظیم الشان کام اس وقت کچھ اور نہیں ہے اب ہم میں کوئی سرسید کے پیدا ہونے کی توقع بھی بہت کم ہے۔ لیکن اس عظیم دانش ور "سید" کے کام سے اپنا نام وابستہ کیا جا سکتا ہے۔

رزیڈنشیل اسکولوں کی اہمیت وافادیت

آندھرا پردیش ملک میں واحد ریاست ہے، جہاں پہلے پہل ۱۹۷۱ء میں تلگو میڈیم رہائشی اسکول ضلع نلگنڈہ کے ایک موضع "سرویل" میں قائم کیا گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ دیہات کے وہ ذہین طلبہ جو معاشی نکبت کی وجہ سے بہتر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے، انھیں اچھی تعلیم کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ملک کا یہ زرخیز سرمایہ یوں ہی ضائع ہونے نہ پائے۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ ذہین طلبہ کی تلاش میٹرک کے بعد نہیں بلکہ ابتدائی عمر ہی میں کرلی جائے تاکہ ان کی تعلیم ابتدائی جماعتوں ہی سے مظبوط بنیادوں پر قائم ہوجائے۔

پبلک نظام تعلیم میں یہ تبدیلی ایک انقلاب سے کم نہ تھی، حکومت کا کام اب تک صرف یہ تھا کہ دیہاتوں اور شہروں میں اسکول کھول دیئے جائیں، جو طلبہ چاہیں شریک ہوں۔ آزادی کے بعد اسکولوں اور طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ کمیت میں اضافے کے ساتھ کیفیت کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے طلبہ کی تعداد کے ساتھ ساتھ معیار تعلیم کا بہتر ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ حکومت کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔

شہری علاقوں میں صاحب ثروت لوگ اپنے بچوں کو اعلیٰ معیار کے انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، دوسرے الفاظ میں وہ تعلیم کو خریدتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم جتنی مہنگی ہوگی، اتنی ہی بہتر ہوگی، سستی تعلیم اتنی ہی غیر معیاری ہوگی۔ آج کل تعلیم خود ایک انڈسٹری میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ "سرویل کا تجربہ کامیاب رہا، اس کی اہمیت و افادیت کو رفتہ رفتہ تسلیم کرلیا گیا ملک کا وہ

غریب اور بد قسمت طبقہ جن کے بچے نہایت ذہین اور ملک کے لئے اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں، وہ بن کھلے مرجھا نہ جائیں۔ وہ محض اچھی اور سچی تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے بس یوں ہی کچھ آگے بڑھ کر ٹھہر جاتے ہیں ورنہ تجربے سے یہ ثابت ہے کہ شہری علاقے کے طلبہ کی طرح انھیں مساوی مواقع دیئے جائیں تو وہ بہتر معیار اور مقابلے پر آسکتے ہیں۔

آج رہائشی اسکولوں کی جڑیں اس ریاست کی سرزمین میں بہت گہری اور دور تک پھیل چکی ہیں۔ اس وقت مختلف اضلاع میں ۱۷۰ میٹرک کی سطح کے ۴ انٹرمیڈیٹ کی سطح کے اور ایک ڈگری کالج کے معیار کے تلگو میڈیم اقامتی اسکول قائم ہو چکے ہیں۔ اس اسکیم کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر جدید تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں مرکزی حکومت نے سارے ملک کے ۴۰۰ اضلاع میں اپنے اخراجات سے اس نوعیت کا اقامتی اسکول کھولے گی جنھیں نودیا ودّیالیہ کا نام دیا گیا ہے۔ اب تک سارے ملک میں مرکزی حکومت وزارت فروغ لسانی وسائل کی جانب سے اس قسم کے ۱۸۰ اسکول کھول چکی ہے۔ خود آندھرا پردیش میں ۱۶ اسکول قائم ہو چکے ہیں۔

داخلہ کا طریقہ کار:۔

ان اقامتی اسکولوں میں داخلہ میرٹ کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ میٹرک کی سطح کے رہائشی اسکولوں میں سمیتی کی سطح پر ابتدائی ٹسٹ لے کر ہر سمیتی سے ۱۰ طلبہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر ان سب کا دوسرا ٹسٹ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر ضلع کی سطح پر ٹسٹ لیتے ہیں۔ داخلہ امتحان کے تین پرچے ہوتے ہیں۔ عام معلومات، تلگو اور حساب، ہر پرچے کے ۵۰ نشانات ہوتے ہیں، کامیابی کے لئے کم از کم ۱۵ فی صد یا ساڑھے سات نمبر لینا ضروری ہیں۔ اس طرح ۱۵۰ میں جملہ نشانات ۲۲،۵ ضروری ہیں۔ یہ ٹسٹ پانچویں جماعت میں شرکت کے لئے چوتھی جماعت کا کورس اور آٹھویں جماعت میں شرکت

کے لئے چھٹی اور ساتویں جماعت کا کورس پیش نظر ہوتا ہے ۔ پرچے ان ہی جماعتوں کے نصابی معیار کے ہوتے ہیں جو طلبہ ضلع کی سطح پر امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں میرٹ کے لحاظ سے پہلے ۱۳۶ امیدوار جماعت پنجم اور ۳۶ طلباء جماعت ہشتم میں شریک کر لئے جاتے ہیں ۔ ان طلباء کے والدین کی سالانہ آمدنی ۱۲ ہزار اور ۱۸ ہزار تک آمدنی کی سطح تک طلبہ کا انتخاب کیا جاتا ہے ۔

طلباء کی صبح و شام :۔

تمام طلباء، اسٹاف مدرسہ پرنسپل کی کالج کے احاطہ ہی میں رہائش ضروری ہے ٹیچرس ہی "ہاوز ماسٹرس" ہوتے ہیں ۔ ان کا پروگرام صبح کے ۵ بجے سے رات کے ۹.۳۰ بجے ختم ہوتا ہے ۔ صبح ۷.۳۰ بجے سے جماعتوں میں تعلیم شروع ہو جاتی ہے اور ۱۱.۳۰ بجے ختم ۰ پھر ۲.۳۰ بجے دن سے شام پانچ بجے تک اساتذہ کی زیر نگرانی اسٹڈی کرائی جاتی ہے کوچنگ ٹیوٹوریل لائبریری کلب مصروفیات شام میں کھیل کود اسکوٹنگ اور کلچرل پروگرام وغیرہ وغیرہ ۔ اس طرح صبح سے شام تک منٹ منٹ کا پروگرام نہایت مصروف رہتا ہے ۔

اخراجات :۔

گورنمنٹ فی طالب علم سالانہ کوئی ۱۲ سو روپے صرف کھانے کے اخراجات پر صرف کرتی ہے ۔ اور جونیر اور ڈگری رہائش کالجوں میں سالانہ فی صد طالب علم ۱۸ سو روپے منظور ہیں ۔ مرکزی حکومت کے نو دیا ودّیالیہ میں فی طالب علم ۲۴۰۰ روپے صرف کئے جاتے ہیں ۔

نتائج کا شاندار ریکارڈ:۔

سال ۱۹۸۷ء میں میٹرک کے پبلک امتحان میں ریاست آندھراپردیش کے ۴۸ رہائشی اسکولوں سے جملہ ۱۴۸۰ طلبہ نے شرکت کی، ان میں سے ۱۴۲۳ طلبہ نے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی صرف ۱۴ اسکولوں کے نتائج کے سرسری اعداد معلوم کرنے سے اندازہ ہوا کہ یہاں کامیاب ہونے والے سب طلباء کو ایم۔بی، بی، ایس، انجینیرنگ کالجس، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی زرعی کالج، ایم، بی، اے اور ایم، ایس، سی میں ہر سال داخلہ مل جاتا ہے۔یونیورسٹی کے بعض اساتذہ سے معلوم ہوا کہ رزیڈنشیل اسکول سے آئے ہوئے طلباء کا معیار کافی اونچا ہے اور وہ اپنے اس امتیاز کو ان اعلیٰ کورسس میں بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔یہ وہ اعلیٰ پیشہ وارانہ کورسس ہیں جن میں اسکولوں سے آنے والے طلبہ کو بہ مشکل ایک دو کو داخلہ مل سکتا ہے۔

اردو میڈیم رہائشی اسکول، حیدرآباد:۔

حکومت آندھراپردیش نے گزشتہ سال شہر حیدرآباد سکندرآباد کے طلبہ کے لئے اردو میڈیم رہائشی اسکول، کے قیام کی منظوری دی جو اس وقت شہر کے مصروف ترین بازار "لاڑ بازار" میں واقع ہے۔شہر کی مسلم آبادی کوئی دس لاکھ کے قریب ہوگی اور اردو میڈیم سے پڑھنے والے طلبہ کی تعداد بھی کافی ہو سکتی ہے۔لیکن افسوس ہے کہ پہلے سال داخلہ امتحان میں شرکت کے وقت آخری تاریخ تک صرف ۲ درخواستیں وصول ہوئیں اور اس سال بھی ٹیسٹ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد حوصلہ شکن رہی وہ محفل علم و فن کی کوشش سے ان دو برسوں میں پانچویں اور آٹھویں جماعت میں ۳۶،۳۶ طلبہ کو شریک کروادیا گیا اس سال تو ۱۵ نشستیں خالی ہیں۔ان میں ۷ طلبہ ہیں جو ۱۵ فی صد سے ساڑھے سات نمبرات بھی نہیں لے سکے اور ۸ طلبہ اسکول چھوڑ کر

غائب ہو گئے۔

اہمیت وافادیت:۔

اردو میڈیم رہائشی اسکول جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ہندوستان بھر میں یہ پہلا اسکول ہے اس کا سہرا موجودہ حکومت کے سر ہے۔ ۱۴/ دسمبر ۱۹۸۷ء کو چیف منسٹر نے نظام آباد، گنٹور، اور کرنول میں ایک ایک اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکول کے قیام کا اعلان کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ سارے حضرات جنھوں نے اسکولوں کے قیام اور منظوری کے لئے کوشش کی ہے، وہ سب اردو داں طبقے کے شکریئے کے مستحق ہیں۔

قلی قطب شاہ اربن ڈیولمنٹ اتھاریٹی نے فی طالب علم یونیفارم کتب اور صندوق کے لئے چھ سو روپے منظور کر کے ایک مستحسن اقدام کیا ہے اس اسکول کا قائم ہونا کچھ مبالغہ نہ سمجھو تو ایسا ہی ہے کہ کسی نے میڈیکل کالج یا انجینئرنگ کالج کھول دیا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کے بعد، ٹسٹ پاس کرنے کے بعد ہی ممکن ہے لیکن جو بچہ رہائشی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ کا مستحق ہو گیا وہ ان کالجوں میں آٹھ سال قبل ہی داخلہ پانے کا مستحق بن جاتا ہے، وہ خود آپ اپنی جگہ حاصل کرلے گا۔کیونکہ اس کی تعلیم کی بنیادیں ٹھوس چٹان پر ہوتی ہیں، ریگستان کی ریت پر نہیں۔ہر مسابقتی امتحان میں وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ شریک ہو سکے گا۔

عدم دلچسپی کی وجوہات:۔

زیادہ تفصیل میں گئے بغیر اس اسکیم سے عدم دلچسپی کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو عام اردو داں طبقہ اقامتی اسکولوں کی افادیت سے قطعاً ناواقف ہے۔بلکہ اچھے

پڑھے لکھے لوگ بھی ناواقف ہیں ۔اس سے زیادہ حیرت کا مقام ہے کہ اردو میڈیم کے ہیڈ ماسٹرس کو بھی اس اسکیم سے معلومات برائے نام بھی نہیں ہیں ۔

دوسری بنیادی وجہ عام مسلمانوں کا رجحان رہا ہے کہ حکومت کی ہر نئی اسکیم کو سمجھنے اور پانے میں کئی برس ضائع کر دیتے ہیں ۔ان کی بے حسی اور لاپرواہی فطری بن چکی ہے ۔اس صورت حال کی بڑی حد تک ذمہ داری قیادت کے فقدان پر بھی عائد ہوتی ہے ۔

اردو میڈیم رہائشی اسکول سے متعلق عام تاثرات:۔

گزشتہ ۲۵، ۳۰ برسوں میں ساری ریاست بھر میں کبھی کسی اردو میڈیم اسکول کے نتائج اچھے نہیں رہے ۔شہر کے بعض اردو میڈیم کا نتیجہ کئی برسوں سے میٹرک میں صفر چلا آرہا ہے ۔یہ اسکول آج بھی اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ظاہر ہے اردو میڈیم رہائشی اسکول سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے ۔ حال ہی میں جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر علی گڈھ یونیورسٹی نے میرے نام ایک خط میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اردو میڈیم رہائشی اسکول حیدرآباد کے دوسرے سال بھی طلبہ کی تعداد کم ہونے کی وجہ پہلے سال کا خراب معیار تعلیم ہوسکتا ہے ۔یہاں عرض کرنا ضروری ہے کہ ذریعہ تعلیم ہمیشہ مادری زبان ہی ہونا چاہیئے ۔چاہے وہ اردو ہو یا تلگو ۔ معیار تعلیم سے قطعاً اس کا تعلق نہیں بلکہ مادری زبان ہی اعلیٰ معیار تعلیم کی سو فیصد ضامن ہوسکتی ہے ۔ دنیا کے سارے ماہرین تعلیم کا یہی خیال ہے ۔ تعلیم مادری زبان کے ذریعہ جتنی اچھی اور خالص ہوتی ہے وہ کسی اور زبان کے ذریعے ممکن ہی نہیں ۔ کیونکہ مادری زبان بچہ ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے (ذاکر حسین) زبان بچے کے جسم و جان، رگ و پے، خون و پوست میں جذب ہو کر اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتی

ہے ۔ دوسری کسی زبان میں مہارت تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن وہ جسم و روح کا حصہ نہیں بن سکتی ۔ آخر وقت تک تصنع ، بناوٹ اور غیر فطری پن سے فرار ناممکن ہے

اردو میڈیم اسکولوں کے خراب نتائج اور زبوں حالی کی ذمہ داری بے چاری اردو پر ہرگز نہیں ۔ اس کے بالکل ہی دوسرے وجوہات ہیں ۔ اسکول کا انتظامیہ ، ٹیچرس کی کمی ، ٹیچرس کی عدم دلچسپی ، والدین کی لاپرواہی ان کی غربت و فلاکت ، اسکولوں میں فرنیچر ، پلے گراؤنڈ ، پانی وغیرہ کا عدم انتظام ، ایک ایک جماعت میں ۸۰ ، ۹۰ طلبہ کا ہجوم ، تاریک کمرے وغیرہ ۔ یہ سب اسکول نہیں چھوٹے بچوں کے لئے قید خانہ سے کم نہیں ۔ جہاں پر روحانی و جسمانی اذیت میں کمسن طلباء مبتلا رہتے ہیں وہاں تعلیمی ماحول تو کیا خاک مل سکتا ہے ، بلکہ یہ اسکول تعلیم سے نفرت پیدا کرنے کی فیکٹریاں بن چکی ہیں ۔ مسلم طلباء ابتدائی جماعتوں میں اگر سو ۱۰۰ شریک ہوتے ہیں تو میٹرک تک صرف ۱۰ پہنچ پاتے ہیں (ہمدرد سوسائٹی کا سروے) ۹۰ فی صد ڈراپ آوٹ انسانی وسائل کا کتنا عظیم نقصان ہے ۔ اگر حیدرآباد کے بعض انگلش میڈیم اسکولوں کا اچھا معیار ہے تو " انگریزی زبان " میں کوئی جادو نہیں ہے بلکہ وہاں کا بہترین انتظامیہ ، ٹیچرس کی لگن ، بچوں کے ماں باپ کی غیر معمولی دلچسپی ، خانگی ٹیوشن ، بچے کے نام خارج کر دینے کا خوف خود بچوں کی دلچسپی ، یہ سب باتیں وہاں کے اچھے نتائج کے ذمہ دار ہیں ۔

مسلم طلباء کے داخلے کے لئے "نام" کی اسکیم :۔

نیشنل الیوسی ایشن آف مسلم فاؤنڈیشن (NAM) حیدرآباد نے مسلم طلباء کی شرکت سے متعلق سنجیدگی سے جائزہ لیا جب کہ ۱۷ برس پہلے سے آندھراپردیش کے ۱۰۰ رزیڈنشیل اسکولس میں کوئی ۳۰ ہزار طلباء تعلیم پارہے ہیں اور مسلم طلباء ان میں

بس برائے نام صفر کے برابر ہیں۔ چنانچہ صرف طلباء کے داخلے کو ایک مہم کے طور پر شروع کرنے کے لئے اس سال ۲۵ ہزار روپے اس غرض کے لئے منظور کئے گئے۔ اس اسکیم کے اہم خدوخال یہ ہیں۔

(۱) جہاں تک ممکن ہو اضلاع کے دیہات اور شہری علاقوں میں قائم اسکولوں کا سروے کر کے ایسے غریب اور ذہین طلبہ کے نام اور پتے جمع کئے جائیں جو اس وقت چوتھی پانچویں جماعتوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔

(۲) ان طلبہ کو رہائشی اسکولوں میں داخلے کے لئے جو انٹرنس ٹسٹ ہوتا ہے، اس میں شریک کروایا جائے اور انھیں ٹیسٹ کے نمونے پر کم از کم دو ماہ کوچنگ دی جائے۔

(۳) کوچنگ کے لئے ضروری لٹریچر تیار کیا جائے جو کوچنگ سنٹرس کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے کار آمد ہو۔ اس قسم کے لٹریچر کی تیاری کے لئے ماہرین تعلیم سے مدد لی جائے۔

(۴) رہائشی اسکولوں کی اہمیت و افادیت سے مسلم طبقہ قطعی ناواقف ہے۔ اس کے لئے تشہیری لٹریچر تیار کیا جائے اور یہ لٹریچر تعلقہ، ضلع اور قصبات کی سطح تک مختلف دینی، ملی سماجی اور سیاسی جماعتوں کے ذریعہ پہنچایا جائے۔

(۵) ہر ضلع پر ایک ایسی تعلیمی کمیٹی قائم کی جائے جو ان اسکولوں میں داخلے کے ایک واضح پلان کے تحت کام کرتی رہے۔

(۶) جو طلبہ انٹرنس ٹیسٹ میں کامیاب ہو جائیں ان کے فارموں کی خانہ پری ضروری سرٹیفکٹس کی فراہمی اور جہاں ضرورت ہو تھوڑی بہت ان طلبہ کی داخلہ فیس سے مدد کر کے انھیں رہائشی اسکولوں میں شریک کروایا جائے۔ یہ کام اس لئے ضروری ہے کہ اکثر والدین پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے لاپروائی سے یہ قیمتی موقع کھو دیتے ہیں۔

اس اسکیم پر عمل کرنے سے پہلے ہی فاونڈیشن کے چند اراکین نے اپنی ناسمجھی کی وجہہ مخالفت شروع کی۔ پھر یہہ سارا روپیہ کسی فرضی اسکیم پر خرچ کر کے ضائع کر دیا۔ پھر اس کا حساب کتاب مل نہیں سکا۔ یہہ ہماری انجمنوں کی عام کارگزاری ہے

یہ کام بظاہر چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن آج کرنے کا کام یہی ہے اس کے بڑے دوررس نتائج نکلیں گے۔ آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس کام میں مدد دیں اور اس کو ایک عملی تحریک میں تبدیل کرنے کے لئے وقت دیں۔ اس تحریک کے چلانے کے لئے بہت بڑے سرمایے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ملی ہمدردی رکھنے والے سرگرم کارکن حضرات کی ضرورت ہے۔ دیہات کے غریب اور ذہین طلبہ کے لئے گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی میں اقامتی اسکولوں کا قیام ایک انقلاب سے کم نہیں۔

تعلیم اطفال

قصہ مشہور ہے کہ ایک عورت اپنے بچہ کو لے کر نپولین کے پاس پہنچی ، اور کہا، اسے آپ کے حوالے کرتی ہوں ، آپ اس کی تربیت کیجئے پوچھا عمر کیا ہے ، پانچ سال ، نپولین نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اس کی تعلیم و تربیت کا زمانہ گزر گیا ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بچہ ابتدائی پانچ برسوں میں جو سیکھتا ہے ۔ باقی ساری عمر میں اس کے مساوی سیکھ پاتا ہے ۔ انسان کے بچہ کے سیکھنے کا زمانہ تمام مخلوقات میں بہت طویل ہے ۔

پیدائش سے لے کر ۲۵ سال کی عمر تک بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے اس بچہ کی نشو ونما دس بارہ سال تک بہت تیز ہوتی ہے اور اٹھارہ بیس سال تک جاری رہتی ہے جسمانی نشو ونما کے ساتھ ساتھ ذہنی اور دماغی نشو ونما بھی ضروری ہے ۔ اگر ابتدائی عمر میں تعلیم و تربیت کا انتظام ٹھیک سے نہ ہو تو طبعی عمر کے برخلاف ذہنی اور دماغی عمر پیچھے رہ جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ۴۰، ۵۰ برس کی عمر کے لوگ اگر پڑھنے لکھنے سے جاہل رہ جائیں تو ان کی دماغی عمر ۸ ، ۱۰ سال کے بچہ کی عمر کے برابر رہ جاتی ہے عمر کی بزرگی کس کام کی ، اصل بزرگی دل و دماغ اور عقل و دانش کی ہوتی ہے ۔

افسوس اس بات کا ہے کہ عمر کا یہی زرخیز زمانہ یعنی پیدائش سے ۵ ، ۶ سال تک ہماری غفلت کی وجہ بنجر رہ جاتا ہے ۔ ماں باپ غربت جہالت لاڈ پیار کی وجہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت کم توجہ دیتے ہیں ۔ غریب خاندانوں کے بچے گلی کوچوں میں جنگل کے پودوں کی طرح اگ آتے ہیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ قدآور ہو جا

تے ہیں لیکن اس میں پھل پھول کم آتا ہے۔ جو کھویا وہ ساری عمر کھویا۔ جب یہ بچے ۶ سال کی عمر میں کسی اسکول میں شریک ہو جاتے ہیں تو اکثر تعلیم میں پیچھے رہ جاتے ہیں بعد میں ٹیوشن کی کتنی ہی کھاد دی جائے، وہ اکثر بے کار ہی جاتی ہے۔

سچ پوچھو تو چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اصل میں ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات کی ضرورت ہے۔ لیکن ان سب ماہرین کو ہمارے ملک میں اتنی فرصت کہاں، یہی وجہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے بی ایڈ کے مماثل تعلیم اطفال کا ایک نیا ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ کیونکہ چند ہی برسوں میں (بلکہ آج بھی) ایسی ٹرینڈ گریجویٹ خواتین کی مانگ بہت بڑھ جائے گی، جدید قومی تعلیم پالیسی ۱۹۸۶ء کے تحت اب "عملی پروگرام" حکومت ہند نے شائع کیا ہے۔

اس میں بتلایا ہے کہ سارے ملک میں جو نرسری اسکول پری پرائمری ایجوکیشن سنٹرس، چائلڈ کیر سنٹرس وغیرہ قائم ہیں۔ وہ ملک کے دس فی صد بچوں کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ ۱۹۹۵ء تک بچوں کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت کے سارے ملک میں ۲۰ لاکھ مراکز کھولنے کا پروگرام ہے۔ یہاں کام کرنے کے لئے ٹرینڈ گریجویٹ سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں بھی کم ہوں گے۔ اس نصاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ خود روزگار کے مواقع فراہم کرتا ہے ایسی خواتین خود اپنا چائلڈ کیر سنٹر پری پرائمری اسکول کرش وغیرہ چلا سکتی ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ لڑکے کو تعلیم دینا ایک کو پڑھانا ہے اور لڑکی کو تعلیم دینا سارے کنبہ کو تعلیم دینا ہے ایسی ٹرینڈ خواتین چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے راز سے واقف ہو جاتی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے بچوں کے سارے خاندان کے افراد کی بہترین رہنمائی کر سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان العلوم ایجوکیشن سوسائٹی نے بڑی دور اندیشی سے بی ایڈ کورس کے علاوہ

سال گزشتہ سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما برائے اطفال کا آغاز کیا ہے ۔اس کا پہلا بیاج عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحان میں شریک ہو چکا ہے ۔ دوسرے سال کے کورس میں داخلہ شروع ہو چکا ہے ایک بات یہاں کہنے کی یہ ہے کہ ہماری قوم میں سوچ بچار اور تذبذب کی عادت عام ہے اہل وطن جو زمانہ کی روش اور تیز رفتاری سے واقف ہیں وہ ایسے سنہری مواقع سے فائدہ اٹھانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں ۔ ہمارے یہاں گریجویٹ لڑکیوں کی کمی نہیں وہ یا تو بے کار ہوں گی یا ایم ۔اے ۔ایم فل کی سوچ رہی ہوں گی یا ان کے ماں باپ ان کے ہاتھ لال پیلے کرنے کی فکر میں ہوں گے ۔ یہ تو ضرور کیجئے لیکن اکثر ایسا ہوا کہ دو چار سال یوں ہی گزر گئے ۔ جو وقت اور مواقع نصیب ہیں اس کو یوں ہی ضائع نہ کیجئے ۔

تعلیم میں قناعت پسندی کا رجحان

مایوسی بنیادی خرابی

بہت عرصہ قبل عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک غیر مسلم پروفیسر نے ایک ہونہار پوسٹ گریجویٹ مسلم طالب علم سے کہا کہ آئندہ سال اپنا نام پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹرڈ کروا دو۔ ایک دو سال میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جائے گی طالب علم نے کچھ پشیمانی کا اظہار کیا تم اس کی فکر نہ کرو تمہارے انتخاب کے سب مراحل میں خود دیکھ لوں گا۔ اس قدیم طالب علم سے کچھ عرصہ قبل ملاقات ہوئی اور یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ وہ بیس برس کے عرصہ میں اپنا نام پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹرڈ نہ کر دا سکا۔ ان سے تفصیلی بات ہوئی، تو وہ احساس کمتری میں مبتلا تھے میں نے کہا کہ آپ آئی اے ایس کے لئے ضرور کوشش کر سکتے تھے کہنے لگے امتحان تو پاس کر لیتا انٹرویو کے شکنجہ سے نکلنا ہم مسلم امیدواروں کے لئے آسان نہیں خوب میں نے کہا دیکھئے اولمپک دوڑ میں بہت سے لوگ شریک ہوتے ہیں لیکن ان سب کو ساری عمر یہ اعزاز تو حاصل رہتا ہے کہ اولمپک دوڑ میں وہ شریک رہے کیوں کہ ہر ملک اپنے ہزاروں اسپورٹس مین سے انہیں منتخب کرتا ہے اس کے جیتنے ہارنے اور کچھ پانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

"تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا"

یہ تو صرف ایک مثال تھی آئے دن ہم ایسے حادثات علمی اور حرماں نصیبی سے دو چار ہوتے ہی رہتے ہیں ۔یہاں ہماری بحث عام طلبہ سے نہیں بلکہ ان ذہین و فطین طلبہ سے ہے جو علم کے کسی شعبہ میں کمال حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں

ملک و قوم میں نامور ہو سکتے ہیں زمین کا نمک کہلا سکتے ہیں جن کے وجود پر ساری قوم فخر کر سکتی ہے

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ۔ عام طور پر مسلم طلبہ میں قناعت پسندی کا رجحان عام ہے ۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی مرض ہے ، جس کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔ ساری تعلیم پیشہ وارنہ قابلیت اور ترقی کا انحصار اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کی جدو جہد پر موقوف ہے ۔ خود یہ کوشش نتیجہ ہے طالب علم کے اندرونی جذبہ اور شوق و ذوق پر جو اس جد جہد کے لئے تیار کرتی ہے تعلیم کے میدان میں اس قسم کی قناعت پسندی کا رجحان پرائمری سکنڈری ، اور یونیورسٹی کی اعلیٰ سطح تک مل جائے گا ۔ والدین اور طلباء کو آپ اکثر یہ کہتے سنیں گے ۔ کہ زیادہ پڑھنے سے کیا فائدہ ہے ۔ اس مرض کی جڑیں بہت گہری اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں جن میں انفرادی کمزوریوں کے علاوہ کچھ تو تاریخی سماجی اور مذہبی ہیں ۔

اپنے آپ کی پہچان ایک مشکل کام ہے خود اپنے میں کیا صلاحتیں اور کمالات پوشیدہ ہیں ان سے عام طور پر نوجوان طلبہ ناواقف رہتے ہیں جب تک کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے جانچنے اور پرکھنے کے مواقع سے دوچار نہ ہوں ایسے طلبہ جو اسکول یا کالج میں مختلف غیر نصابی مصروفیات اور مقابلوں میں حصہ نہ لیں ان میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو پاتی ۔ دوسری طرف انھیں ماہرانہ رہنمائی یا گائیڈنس کی ضرورت ہوتی ہے اگر ایسی رہنمائی نہ ملے تو طالب علم شش و پنج میں رہ جاتا ہے اکثر زرین مواقع کھو بیٹھتا ہے ۔

۲ ۔ مختلف تاریخی وجوہات خصوصاً انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں میں مایوسی اور بے حسی کی وجہ وہ تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے ۔ انگریزوں

کے توپ و تفنگ سے زیادہ ریل تار موٹر اور بجلی کی ایجادات نے انہیں سخت حیرت میں ڈال دیا۔یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کے ایک سو برس سے زیادہ کے بعد بھی مسلمانوں کا تعلیمی فی صد ۱۵ ہے جب کہ ملک میں تعلیم کا فی صد ۳۶ سے زائد ہے۔

۳۔حال ہی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدی تقاریب کا دہلی میں افتتاح کرتے ہوئے وزیراعظم راجیوگاندھی نے اس بات کا اعتراف کیا کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ سیاسی حالات نے پلٹا کھایا تو سب سے پہلے مسلمانوں پر معیشت کے دروازے بند ہوگئے۔ان کا سارا انحصار سرکاری ملازمتوں پر تھا اصل ذرائع معیشت زراعت صنعت و حرفت تجارت اہم ترین ہیں لیکن ان شعبوں میں صلاحیت اور جفاکشی کی ضرورت ہے جس سے عام طور پر مسلمان اپنے ایک خاص مزاج کی وجہہ دور ہیں۔

۴۔جمہوری نظام کی کمزوریوں سے یہاں بحث نہیں لیکن اس نظام حکومت میں آج بھی ڈارون کا نظریہ " تنازعہ للبقا " SURVIVAL OF THE FITTEST برابر کام کررہا ہے۔اپنے وجود کو باقی رکھنے اور اوپر آنے کی جدوجہد STRUGGLE FOR EXISTENCE جس طرح نباتات اور حیوانات میں موجود ہے، اسی طرح جمہوری نظام میں نہ صرف فرد بلکہ مختلف سماجی و مذہبی طبقات پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اگر انہیں باعزت زندگی گزارنا ہے تو وہ نہ صرف اپنے اطراف و اکناف کے سماجی معاشی و سیاسی حالات پر گہری نظر رکھیں بلکہ وہ ان حالات اور ماحول میں اپنے کو باقی رکھنے اور اونچا مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں عملاً حصہ لیں جس کے لئے تعلیم نہایت ضروری ہے۔ورنہ کون اس دوڑ میں چھوٹ گیا اور کون مٹ گیا اس کا کسی کو افسوس نہ ہوگا۔

مسلم طلبہ کا یہ عام ذہنی مزاج ہے کہ وہ کسی مسابقتی امتحان میں شریک ہونے سے قبل ہی طے کر لیتے ہیں کہ ان کا انتخاب مشکل ہے یہ ایسا ہی ہے جو کسی مقابلہ میں شریک ہونے سے قبل ہی اپنی شکست تسلیم کر لے جو پہلے ہی سے شکست کے لئے تیار ہے اس کو علم کی سربلند چوٹی کے سر کرنے کا سودا سر میں سما ہی نہیں سکتا کہا جاتا ہے کہ سوار جب خود ہی مرعوب ہے اور خوف زدہ ہو تو گھوڑا اپنے جسم کی رگوں میں سوار کی گھبراہٹ اور پریشانی کو محسوس کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ تھوڑی ہی دیر میں اس کو زمین پر پٹک دیتا ہے آل انڈیا سروسیز کے لئے انٹرویو لینے والے اپنے فن کے ماہرین ہوتے ہیں وہ دو چار منٹ ہی میں سمجھ لیتے ہیں کہ امیدوار کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔

۵۔غالی علمائے دین اور مذہبی حضرات نے مذہبی محفلوں میں دنیوی علوم سے بیزارگی کا اظہار کیا یا پھر ان علوم کا ذکر بڑی حقارت سے کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناپختہ ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ تعلیم شد بد تو حاصل کر لینا ٹھیک ہے لیکن ان میں کمال حاصل کرنے یا تمغہ امتیازی کی ہر کوشش پر پہلے ہی سے بریک لگ جاتا ہے

یہاں پر ہمیں ایک اہم سوال کرنا ہے۔ یہ تو ہر حاجی جانتا ہے کہ حج میں طواف کعبہ کے پہلے تین چکر "رمل" کہلاتے ہیں، جس میں شانے اچھال کر سینہ تان کر چلنے کی ہدایت ہے حضور اکرمؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر ایسا ہی کیا تھا تاکہ کفار مکہ کو یہ خیال نہ آنے پائے کہ مسلمان کمزور اور بد حال ہیں۔ حضورؐ نے صحابہ سے قوت حاصل کرنے کو کہا اور پھر اس کا مطلب یوں سمجھایا کہ قوت سے مراد شمشیر زنی تیر اندازی اور شہسواری میں کمال پیدا کرو۔ ان باتوں سے ایک بات واضح ہے کہ مسلمان دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی نہ گزاریں۔ اسوۂ حسنہ کی وہ اسپرٹ آج بھی

باقی ہے لیکن اعتبارات بدل گئے ہیں آج علم سائنس تحقیق اور ٹکنالوجی میں کمال اور برتری حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔

حضرت آدمؑ کو روئے زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا گیا اور انہیں اشیائے کائنات کا سارا علم دیدیا گیا جن میں آثار و خواص بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے ان اشیا کے آثار و خواص بغیر کسی سائنٹفک تحقیق کے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ سارے مادّی علوم کا حصول بھی دین ہی کا حصہ ہے خلافت حکومت، دولت و عزت بھی انعامات الٰہی ہیں بشرطیکہ ان کا صحیح استعمال ہو

> یہاں پر ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان دنیوی علوم میں کمال پیدا کئے بغیر بھی دوسروں کے مقابلہ میں کسی طرح ہمسری یا برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں کیا مسلمان اس زمین پر دوسروں کے رحم وکرم پر قناعت کر لیں اور قناعت کی زندگی گزار لیں

اے کاش کوئی صاحب علم و یقین اس پہلو پر بصیرت افروز مضمون لکھیں جو مسلمانوں کی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو گیا ہے۔

یہاں پر ہمارا مقصد تعلیم میں قناعت پسندی کے رجحان کے اسباب کو مزید طول دینا نہیں ہے لیکن ہمارا یہ شدید احساس ہے کہ مسلم طلبہ میں غیر محسوس راستوں سے ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ بس کسی حدتک تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے یونیورسٹی سند کام چلانے کے لئے کافی ہے کچھ روز گار مل جائیگا اور معاشرے میں بھی مقام حاصل ہو جائے گا۔ کسی علم میں کمال اور اس کی بلندیوں کے اعلیٰ معیار تک پہنچنے کے لئے جس کاوش اور جدو جہد کی ضرورت ہے۔ وہ اس ذہنی ساخت کی وجہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ہمارے سارے ماہرین تعلیم، دانشور، علمائے کرام، لیڈر اور سماجی کارکن ادیب اور شاعرسب ہی ان بنیادی اسباب پر غور کریں۔اور طلبہ میں تعلیم کا وہ ذوق وشوق پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ علم کے ہر شعبہ میں جو اپنی وسعت اور گہرائی کے لئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے اس میں کمال پیدا کر سکیں۔

سرسید کا کام اور پیام

سرسید احمد خاںؒ کی یاد منانا، سرسید کی روح پر کچھ احسان کرنا نہیں ہے بلکہ اس مرد مجاہد کی یاد خود ہمارے لئے باعث رحمت ہے۔ اس کی یاد میں بھی وہ اثر ہے کہ قوم کے خوابیدہ ذہن و فکر میں آج بھی پڑھنے لکھنے اور جدید علوم سے واقف ہونے کا خیال پیدا ہوا اور ان علوم کے حصول کا کسی حد تک ذوق و شوق بڑھا۔

سرسید کی تعلیمی تحریک کو شروع ہوئے آج ایک سو برس سے زیادہ ہو گئے حالات اب اتنے مایوس کن نہیں ہیں۔ خصوصاً آزادی کے بعد سے کوئی ۲۰، ۳۰ برس تک، تقسیم ہند کی وجہ سے مسلمان کچھ ایسے سیاسی حالات اور تباہی سے دوچار ہوئے کہ انھیں سنبھلنے، اٹھنے، چلنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ گذشتہ کوئی پندرہ، بیس برسوں سے کچھ مخلص بندے مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے رہے ہیں۔ لیکن ابھی اس ملک میں مسلمانوں کی تعلیم کا فی صد ۱۵ سے زیادہ نہیں ہے۔ جدید قومی تعلیمی پالیسی کے ایکشن پلان میں، مسلمانوں اور نیو بدھسٹ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ نیو بدھسٹ وہ ہریجن ہیں جو ڈاکٹر امبیڈکر کے ساتھ بدھ مت قبول کیا تھا۔ (اس وقت ان کی تعداد ۶ لاکھ تھی)۔ اس پستی میں وہ قوم شامل ہو چکی ہے جس کے دین و ایمان کی جان، قرآن کی پہلی آیت ہی پڑھنے اور قلم سے سیکھنے سے متعلق ہے اور ہر وہ علم جاننے کی ہدایت ہے جو وہ نہ جانتا تھا۔ "علم الانسان مالم یعلم" یہاں پر کوئی قید دین و دنیا کے علم کی نہیں ہے اور پھر علم ادم الاسماء کلھا یعنی آدمؑ کو اشیائے کائنات کے تمام اسماء آثار و خواص کا علم دیدیا۔ (تفسیر ماجدی) آثار و خواص کا علم سائنٹفک

کھوج ہی سے ممکن ہے۔اور ساری سائنسی تحقیقات سب کچھ اس دائرے میں آجاتی ہیں

مسلمانوں کے پست تعلیمی معیار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ ہم جہاں سے چلے تھے ابھی وہیں ہیں کیونکہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کا اوسط ۳۶ فی صد ہے۔دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہم ایک سو برس تک تعلیم کی وادی میں چلتے رہنے کے باوجود ابھی صرف ہم نے ۱۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہے اگر ہم پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو ہماری خواتین کوئی دس کلومیٹر دوری پر ہیں۔منزل تو بہت دور کی بات ہے لیکن یہ صورت حال قوم اور ملک کے لئے بڑی تشویش ناک ہے۔

اس صورت حال کی چند بنیادی وجوہات ہیں:

(۱) مسلمان فطرتاً ہر نئی چیز کو سمجھنے، پرکھنے اور اسے قبول کرنے کے معاملے میں متشکّی واقع ہوئے ہیں ۔وہ نوشتہ دیوار پڑھنے کے لئے برسوں لگا دیتے ہیں اور جب جاگتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دوسری قومیں بہت آگے نکل چکی ہیں ۔اس قسم کا فکری ڈھانچہ کوئی برس ہا برس میں تیار ہوا ہے جب کہ مذہبی علماء نے دنیوی اور مادی علوم، معاش، کسب، لیجادات وغیرہ کا کچھ اس طرز سے مضحکہ اڑایا کہ امّت مسلمہ کا ذہن اس طرف سے مفلوج ہوگیا۔اب اس شخص کا لڑ کھڑا کر چلنا ہی محال ہے وہ اس برق رفتار زمانے کی دوڑ میں کیا حصہ لے سکتا ہے۔

(۲) مسلمانوں میں جہاں تک علم و عمل کا تعلق ہے، قناعت

پسندی کا رجحان عام ہے۔ جو تحقیق و تجربہ اور کسی علم میں کمال پیدا کرنے میں سنگ راہ ہے۔

(۳) سرسید کے انتقال کو آج نوے برس ہو گئے لیکن اس سارے عرصہ میں کوئی ایسا دانش ور نہیں پیدا ہوا جس نے مسلمانوں کی تعلیم کے کام کو اپنی زندگی کا واحد مقصد اور اوڑھنا بچھونا ہی بنالیا ہو۔ بے شک مسلمانوں میں کل ہند سطح کے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما پیدا ہوئے لیکن ان کی تقاریر اور تحریریں پڑھ جائیے کسی نے مسلمانوں کی جہالت دور کرنے اور تعلیم حاصل کرنے پر چند جملے بھی نہیں لکھے ہیں۔ ہاں سرسید کے بعد سارے ملک میں کسی نے تعلیمی مشن کو چلانے کے لئے ۲۵ برس تک خاموش کوہ کنی جاری رکھی، تاکہ کوئی چشمہ ہی جاری ہو جائے، وہ اکیلا نام ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا نظر آتا ہے اور پھر ان کے پر خلوص ساتھی پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین نظر آتے ہیں۔

(۴) قوم غریب اور مفلس ہے، اس لئے تعلیم نہیں پاتی اور وہ تعلیم سے نابلد ہے، اسی لئے تو غریب ہے۔ غربت تب ہی دور ہو سکتی ہے جب کہ لوگ تعلیم یافتہ ہوں اور تعلیم کے راستے میں غربت ایک بڑا پتھر ہے، جو ہٹتا نہیں۔ غربت اور جہالت ایک ایسا منحوس چکّر ہے جس کا سرا ملتا نہیں۔

سرسید کی دانش مندی:۔

سرسید ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے اور بعد کے حالات دیکھ رہے تھے شمالی ہند اور بنگال میں مسلمانوں کی حکومت ایک ہزار برس رہی ۔دولت ،افراد کی برائیوں پر اور حکومت کسی قوم کی بہت سی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیتی ہے ۔جیسے ہی حکومت ہاتھ سے گئی مسلمان سورج کی دھوپ میں آگئے ان کی غربت و جہالت کاہلی و لاپرواہی مایوسی و ناامیدی ، زندگی سے فرار ، اپنوں سے حسد و رشک سب عیب ظاہر ہوگئے ۔ سرسید نے محسوس کرلیا کہ اگر مسلمان تعلیم حاصل نہ کریں تو پھر وہ سائیس ، خانساماں ، نوکر چاکر اور گھسیارے رہ جائیں گے ۔"یہاں پر سرسید کے کردار اور بالغ نظری کی چند مثالیں ایسی ہیں جن کی طرف اشارہ کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

(۱) سرسید کو یہ یقین ہوچکا تھا کہ ہندوستانی اب انگریزوں کو کسی طرح شکست نہیں دے سکتے ۔انگریزوں کی فوجی اور عصری طاقت سے زیادہ وہ انگریزوں کے سائنسی علوم میں ترقی انجینئرنگ میں مہارت ، جدید ایجادات ، علمی کمالات ، اور روشن خیالی سے متاثر تھے ۔

(۲) انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کا غم و غصہ بالکل فطری تھا کیوں کہ حکومت ان ہی سے چھینی گئی تھی ۔یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں میں انگریزی زبان اور ہر وہ جدید علم جو سمندر پار سے آیا اس سے سخت نفرت اور بیزارگی پیدا ہوگئی ۔

(۳) سرسید نے حالات کا بغور مطالعہ کر کے چند باتیں طے کرلیں ۔

(i) مسلمانوں کو انگریزوں کی مجہول مخالفت سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا ان سے جب تک کوآپریشن نہ کیا جائے وہ سخت نقصان میں رہیں گے۔

(ii) انگریز حکومت کے ساتھ اسی وقت کوآپریشن کیا جا سکتا تھا جب کہ وہ انگریزی زبان جانتے ہوں، تعلیم یافتہ ہوں، حکومت کے کام کے ہوں، تب ہی وہ انگریز حاکم کے دل میں وقعت کی جگہ بنا سکتے ہیں۔

(iii) تیسرے وہ اردو فارسی کو چھوڑ کر انگریزی ذریعہ تعلیم کے اس لئے دل دادہ تھے کہ ان زبانوں کا دامن جدید علوم سائنس انجینئرنگ، ایجادات اور موجودات کی ماہیت سے خالی تھا۔ تحقیق کا سرمایہ برائے نام بھی نہ تھا۔

سر سیدؒ نے ایک حکیم دانا طبیب مستند کی طرح قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا اور مرض کی صحیح تشخیص کی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم قوم کے سارے امراض کا ایک ہی بنیادی سبب ہے اور وہ ہے تعلیم سے محرومی۔ دوستو تعلیم وہ شاہ کلید ہے جو ایک فرد کی پوشیدہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔ جاہل کا حال کچھ ایسا ہے کہ وہ ساری عمر ایک بند کمرے کے سامنے ایک چوکیدار کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اسے خود نہیں معلوم کہ وہ کن خزانوں کا مالک ہے۔ اس کی محرومیاں اس کی جہالت ہے۔

انگریزوں نے زمین داری اور تعلقہ داری کی پیش کش کی لیکن سر سیدؒ کو بڑی غیرت اور شرم آئی کہ سارے مسلمان تو گردش ایّام کی چکّی میں آٹے کی طرح پسے جا رہے ہیں اور وہ خود عیش و عشرت میں موج کریں۔ وہ یہ کر بھی سکتے تھے لیکن یہی

وہ مقام ہے جہاں کھرے کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ وقت کی کسوٹی بتادیتی ہے کہ کون سونا اور کون کھوٹا سکّہ ہے۔

اپنے تعلیمی مشن کو چلانے کے لئے سرسیدؒ کو اپنے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مسدّس کے دیباچے میں اس مرد مجاہد کی شان اور دوسروں سے کام لینے کے طریقے کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔

"ناگاہ دیکھا ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گذار راستہ میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے، تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں، بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں، مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں دم چڑھ رہا ہے، چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں ہیں لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے وہ اسی طرح تازہ دم ہے نہ اسے راستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پرواہ ہے، نہ منزل کی دوری سے ہراس ہے۔ اس کی چتونوں میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے، خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار رستہ پر پڑ گئے۔ نہ یہ خبر کہ کہاں جاتے ہیں نہ یہ معلوم کہ کیوں جاتے ہیں، نہ طلب صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے نہ عزم ہے نہ

استقلال ، نہ صدق ہے نہ اخلاص ۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لئے جاتا ہے ۔"

اقبالؒ نے یہ شعر سرسید کے لئے ہی کہا ہوگا:

نگہہ بلند ، سخن دلنواز ، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

عذر کے بعد سرسیدؒ کے تاثرات کچھ اس قسم کے تھے:۔

" قوم کی حالت تباہ ہے ، عزیز ذلیل ہو گئے ، شریف خاک میں مل گئے ہیں ، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے ، دین کا صرف نام باقی ہے ، افلاس کی گھر گھر پکار ہے اخلاق بالکل بگڑ چکے ہیں " " تعصب کی گھنگور گھٹا تمام پر چھائی ہوئی ہے ۔ رسم ورواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے ، امرا غافل و بے پرواہ ہیں علماء زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں

خود حالی نے اس کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:۔

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے بھنور میں جہاز جس کے آگے گھرا ہے
کنارا ہے دور اور طوفان بپا ہے گماں ہے یہ ہردم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی
گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے چپ و راست سے یہ صدا آرہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہوگئے ہم
ابھی جاگتے تھے ابھی سوگئے ہم
پر اس قوم غافل کی غفلت وہی ہے تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے
نہ افسوس انھیں اپنی ذلّت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

اب وہ خود ایک تعلیمی کمیٹی کی بنیاد رکھتے ہیں ۔ کمیٹی کا نام بھی دلچسپ ہے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" جو مخلص دوست ہیں وہ اس دیوانہ پن پر ہنستے ہیں ۔ ۲۴/ مئی ۱۸۷۵ء مدرستہ العلوم کی بنیاد رکھی گئی اور اس تقریب کے متعلق خود ہی لکھتے ہیں:

"جب کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم ہوئی تو میں اس کا سکریٹری تھا ۔ خالص احباب جو ممبر تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ مسلمان اور ان کی ترقی تعلیم کا خیال ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چندہ جمع

کرنے کا ذکر ہوا تو ۔۔۔۔۔۔۔۔اس خیال کو جنون اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں نے اپنے ایک دوست کے بازو پر حضرت امام ضامن کی نیاز کا روپیہ بندھا دیکھا تو میں نے سوال کیا کہ کیا مسلمانوں کی قوم سے زیادہ کوئی اور اس روپے کا مستحق ہے ۔وہ سبز کپڑا جس میں نذر بندھی ہوئی تھی انھوں نے مجھ کو دیا ۔جب اس کو کھولا تو ایک روپیہ اور دو منصوری پیسے تھے ۔یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانہ میں ڈالا گیا۔"

چندہ کا کام

چندہ وصول کرنے کا کام آسان نہیں وہ بھی تعلیم کے نام پر "جان حاضر ہے مگر چندہ کس کے پاس ہے" تعلیمی مشن کے چلانے کے لئے سرمایہ کی سخت ضرورت تھی۔ طلبہ کی جانب سے ڈرامہ کا اسٹیج تیار ہے اس اسٹیج پر ناظرین کے سامنے ایک مرد درویش ، گھنی ریش مبارک کے ساتھ فقیروں کا لباس پہنے ہوئے سامنے آتا ہے ۔ تہمد باندھے ہوئے ، پرانے کپڑے پہنے ہوئے سر پر میلی ٹوپی ہے ۔کاندھے سے جھولی لٹکی ہوئی ، ہاتھ میں کشکول ہے ۔اس کی آنکھوں میں وہی مایوسی ہے اور اس کے گالوں میں وہی قحط نمایاں ہے جو فقیروں کی صورت میں عیاں ہوتا ہے ۔زبان پر غالب کا شعر ہے:۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اور صدا لگاتا ہے ۔صاحبو! قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک پیسہ ہی دے دو

آپ اس منظر کو کچھ دیر کے لئے اپنی آنکھوں کے سامنے لائیے عجب نہیں اس منظر کو دیکھ کر کچھ ناظرین کے آنسو نکل پڑے ہوں۔

سرسید کی بذلہ سنجی:۔

علی گڈھ تحریک، سرسیدؒ کے تعلیمی مشن اور اصلاح امّت پر مشتمل ہے اس زمانے کے حالات میں یہ کوئی معمولی کام نہ تھا۔ کفر کے فتوے اور گالیوں کی ڈاک آتی۔ وہ ایک نظر دیکھتے کچرے کی ٹوکری میں پھینکتے پھر اپنے کام میں لگ جاتے اسی زمانے میں "تہذیب الاخلاق" کے نام سے پرچہ جاری کیا جو شاید اردو کا پہلا میگزین تھا جس میں اصلاح تعلیم و ترقی پر مضامین نکلنے لگے۔ اس رسالے نے سارے ملک میں ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ پروفیسر محمد مجیب کا خیال ہے کہ سرسیدؒ کے مخالف بھی ان کے مضامین کی افادیت کے قایل تھے۔ اصلاح مذہب سے متعلق بھی مضامین شائع ہونے لگے۔ یہ ایک ایسی پرخار وادی ہے جس میں قدم رکھنا ملّت کے غیض و غضب کو دعوت دینا تھا۔ اس زمانے میں سرسیدؒ سے ملنے کے لئے بھی لوگ کتراتے تھے۔ اکبرالہ آبادی نے اس رباعی میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

حاضر ہوا میں خدمت سیّد میں ایک رات
افسوس کچھ ہو نہ سکی زیادہ بات
کہنے لگے کہ دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے آداب عرض ہے

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ اسی زمانے میں سرسید کا ایک مضمون خلافت راشدہ پر کسی رسالے میں نکلا۔ اس مضمون کے بین السّطور میں کچھ اس طرح کا مطلب نکلتا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علیؑ کو

خلافت ملنی چاہیے تھی۔ بنارس کے ایک شیعہ عالم اس مضمون کو پڑھ کر بھڑک گئے۔ وہ بنارس سے علی گڈھ کا سفر کر کے پرچہ ہاتھ میں لیے ہوئے سرسیدؒ کے پاس پہنچے۔ اس شیعہ عالم نے مضمون کی بہت تعریف کی اور ایک نازک سوال کر ڈالا۔

" اگر آپ حضور اکرمؐ کی وفات کے وقت موجود ہوتے تو آپ حضرت ابو بکرؓ کی تائید کرتے تا حضرت علیؓ کی۔"

سرسید کہنے لگے:

" لو حضرت میں ان کی ان کی تائید کیوں کرنے چلا میں خود اپنی خلافت کا ڈول ڈالتا۔ کیا ایسا گولڈن چانس دوسروں کے لئے چھوڑ دیتا۔"

سرسید میں اگر یہ حس مزاح نہ ہوتی تو وہ ان نشتروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جو ان کے دل و دماغ پر ہر روز کسی نہ کسی جانب سے لگتے رہتے تھے۔

سرسیدؒ کا پیام ہمارے نام:

سرسید پر آپ جتنا کچھ سن چکے ہیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ دریا کے بہاؤ کا منظر آپ نے کنارے پر بیٹھ کر کر لیا۔ خود دریا میں، اپنی کشتی ڈالنے کے بعد ہی کچھ اس کے تلاطم اور طوفان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے سرسید کی زندگی میں کوئی پیام نہیں ہے جو خود کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں جو اس راہ پر چل نکلا ہے یا وہ چلنے کے لئے تیار ہے اس کے لئے بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی۔

آج وقت کی اہم پکار یہ ہے کہ ہمارے سارے دانش ور ادیب لیڈر، سماجی کارکن جس کسی کے دل میں مسلم قوم کی بھلائی کا ذرا سا بھی اگر جذبہ ہے تو وہ مسلمانوں کی تعلیم کے پروگرام کو سرفہرست رکھیں۔ اٹھتے بیٹھتے ہر مجلس میں بچوں کی تعلیم کے متعلق گفتگو کریں، ہر روز اپنے بچوں کے ساتھ ایک آدھ گھنٹہ ان کے

تعلیمی کام کی نگرانی کے لئے بیٹھ جائیں ۔ گندی بستیوں اور غریب محلوں میں بچے گلی کوچوں میں جنگلی پودوں کی طرح اگ آتے ہیں ۔ان کی تعلیم کا کوئی پرسان حال نہیں انھیں سرکاری اسکولوں میں شریک کروانے کی مہم چلانے کی ضرورت ہے ۔ گو یہ ایک دشوار کام ہے اصل کام دیہات تعلقہ جات سے شروع ہونا ہے ۔شہروں میں تعلیم کا بہت چرچا ہے ۔ ہر ضلع کی سطح پر مذہبی، سیاسی، سماجی جماعتیں کام کر رہی ہیں ان سب حضرات کے تعاون سے ایک مسلم ایجو کیشنل سوسائٹی قائم کریں جو اس ضلع کے دیہات اور تعلقہ جات کے مسلم گھرانوں کا سروے کریں اور بچوں کی تعلیم کے پروگرام کو منظم شکل دیں ۔آل انڈیا مسلم ایجو کیشنل سوسائٹی (آندھرا پردیش) اس کام کو اگر چاہے تو بخوبی انجام دے سکتی ہے ۔وقت کا شدید تقاضا یہ ہے کہ ہر ضلع کی سطح پر اس مرکزی سوسائٹی کی شاخیں قائم کی جائیں ۔

مختصر بات یہ ہے کہ سارے ملک میں مسلمانوں کی تعلیم کا کام ایک بڑی مہم کے طور پر شروع کرنے کی ضرورت ہے ۔ہمارے بااثر لیڈر اور علمائے کرام اس کام کی اہمیت کو آج بھی سمجھ جائیں تو اس ملت کے دن ۲۵، ۵۰ برس میں ضرور پھریں گے ۔ حال ہی میں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیمی، ایجو کیشنل اینڈ کلچرل ایڈوانسمنٹ آف مسلمس آف انڈیا۔

CENTRE FOR PROMOTION OF EDUCATIONAL AND CULTURAL ADVANCEMENT OF MUSLIMS OF INDIA"

قائم کیا گیا ہے۔

سرسید کے اخلاص کی وجہ سے علی گڈھ کے نام میں وہ تاثیر ہے کہ یہاں سے جو

بھی تعلیمی اور اصلاحی تحریک شروع ہوگی وہ سارے ہندوستانی مسلمانوں کے دل کی دھڑکن ہوگی ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی جڑیں اضلاع اور تعلقہ جات تک پہنچ جائیں ۔

تنقید و تعریف، رشک و حسد، ناشکری و احساس فراموشی، غلط فہمیاں وغیرہ ہر اس مرد مومن کا مقدر ہیں جو کوئی بھلائی کا کام کرنا چاہتا ہو ۔ اگر سرسید کی زندگی کا کوئی جیتا جاگتا پیام ہے تو بس یہی ہے کہ ان سب تیر و نشتر کے لئے سیدھا راستہ اختیار کیا ہو تو پھر چل نکلو ۔ اس لئے کہ:

چلنے والے ، نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

(علامہ اقبال)

اکبر الہ آبادی، جو بظاہر انگریزی تعلیم کے مخالف رہے ہیں، سرسید کی وفات پر کہہ اٹھے ع

"ہماری باتیں ہی باتیں تھیں اور سید کام کرتا تھا"

ہر وہ شخص جو اپنے محدود وسائل اور دائرہ ہی میں کوئی تعلیم کا کام کر رہا ہو تو سمجھئے کہ وہ سرسیدؒ کے مشن کا اہم کردار ہے ۔

"اب ہم میں سرسید سا پیدا ہونا مشکل ہے، البتہ ضرورت ہے کہ کئی ایک چھوٹے سرسیدؒ کھڑے ہوجائیں ۔"

(سید حامد)

دینی تعلیمی کونسل کاقابل تقلید کارنامہ

دینی تعلیمی کونسل (اترپردیش) کی ایک شاخ جو حیدرآباد میں گزشتہ دو سال سے کام کررہی ہے اس کا ایک اہم اجلاس حیدرآباد میں ۳۱/ دسمبر کو ہوا۔ کونسل کے کام اور "پیام انسانیت" کی تحریک سے واقف کرانے کے لئے مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، مولانا پاریکھ، اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ایڈیٹر ندائے ملت (لکھنؤ) کی پر مغز تقاریر سننے میں آئیں۔ ان تقاریر سے ان دو تحریکات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوسکا۔ جن تحریکات سے مولانا علی میاں مدظلہ، کا تعلق ہو۔ اس تحریک کے اخلاص اور جذبہ کا وہی اندازہ کرسکتے ہیں جو عالم اسلام کی اس "ہمالیائی شخصیت" سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر قریشی سے بات چیت اور لٹریچر دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ موجودہ دور میں دینی تعلیمی کونسل کا تعلیمی مشن ایک عظیم کارنامہ ہے جو ہندوستان میں۔ مسلمانوں کی ایک ہزار برس کی تاریخ میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتا جس کا اعتراف خود علمائے کرام نے بھی کیا ہے۔

دینی تعلیمی کونسل کے قیام کی بنیادی وجوہات

(۱) ملک کے سیکولر دستور کے تحت کسی سرکاری اسکول میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں سرکار کسی مذہب کی سرپرستی نہیں کرے گی البتہ لسانی اور مذہبی اقلیتیں چاہیں تو اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھ سکتی ہیں اسی طرح اپنے مذہبی عقائد، تہذیب وثقافت کے ورثہ کو محفوظ کرسکتی ہیں۔

(۲) آزادی کے بعد سے علاقائی زبانیں جو اب تک خوابیدہ تھیں وہ ایک دم

سے جاگ اٹھیں ۔ اس انقلابی تبدیلی کی وجہ اردو سوائے جموں و کشمیر کے کسی ریاست کی علاقائی زبان باقی نہیں رہی باوجود اردو عام بول چال کی زبان ہونے کے مسلمانوں کی اکثریت کی مادری زبان اردو ہے ۔ کچھ تو سیاسی انقلاب اور کچھ ریاستی حکومتوں کی سرد مہری کی وجہ اردو کے ساتھ سخت ناانصافیاں روا رکھی گئیں ۔ اردو کے ساتھ ناانصافی کے معنی مسلمانوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہے ۔

ہمارے وزیراعظم راجیو گاندھی نے دہلی میں ابو الکلام آزاد صدی تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ آزادی کے بعد سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا ۔ وزیراعظم کا یہ اعتراف ان کی وسیع القلبی کا ثبوت ہے ۔ ان کی جان ، مال و آبرو کے ساتھ زبان کے ساتھ بھی سخت ناانصافیاں ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے ۔

عربی زبان کے بعد اسلامیات کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو میں ہے اگر اردو سے ہمارے بچے ناواقف رہ جائیں تو وہ یک لخت اپنے مذہب ثقافت ، تمدن ، آرٹ اور ادب کے بیش بہا خزانوں سے ہی محروم رہ جائیں گے اور یہ قیمتی سرمایہ کوئی ایک ہزار برس میں تشکیل پایا ہے ۔ اگر اس ورثہ سے اپنی اولاد کو محروم کر دیا جائے تو آنے والی نسلیں مفلس و نادار ، یتیم رہ جائیں گی ۔ وہ موجودہ بے ہنگم نظام تعلیم سے ضرور آشنا ہوں گی لیکن ماں باپ کو انھیں دیکھ کر شرم آئے گی ۔ کیونکہ انھیں یہ احساس ہوگا کہ ہم اپنے مذہب و ثقافت کا قیمتی سرمایہ ہم اپنے بچوں کو منتقل نہ کرسکے ۔ وہ ایک ایسے ذہنی خلاء میں نشو ونما پائیں گے جن کے پاؤں زمین پر نہ ہوں گے انھیں ہر ہوا کا جھونکا اڑا لے جائے گا ۔

(۳) اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے ۔ پرائمیری اسکول کی نصابی کتابوں میں عام طور پر وہی دیومالائی قصے اور کہانیاں ہوتی ہیں جن کی غالب اکثریت اس علاقہ میں

ہوتی ہے ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ ہر ملک کا یہی حال ہے ابتدائی عمر میں ان قصے کہانیوں کا بڑا اثر ہوتا ہے ۔ اور یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو اسلام کے بنیادی عقیدہ سے ٹکراتا ہے ۔

اہم خدوخال:

۱۹۵۹ ء میں قاضی عدیل عباسی نے مختلف مکاتب خیال کے علماء اور دانشوروں کا ایک اجلاس طلب کیا اور اس تحریک کا یہی نقطہ آغاز ہے ۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ ۴ تا ۱۰ سال کی عمر کے بچوں کی تعلیم کا انتظام خود مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے اگر وہ اپنے بچوں کے دین و مذہب کو سلامت رکھنا چاہتے ہوں دوسرے یہ کہ اپنی مادری زبان ، اردو کو ہی ذریعہ تعلیم بنانا چاہیں ۔ اس طرح اردو زبان حکومت کے رحم وکرم سے آزاد ہوگی اور بچوں کو اسلام سے بیگانہ ہونے کی نوبت نہ آئے گی ۔ یہ ایک انقلابی تجویز تھی جو انقلابی تحریک میں تبدیل ہوگئی ۔ کیونکہ صرف ۳۰ سال کے عرصے میں اترپردیش میں مسلمانوں کے قائم کئے ہوئے ۴۸ اضلاع میں کوئی دس ہزار پرائمری اسکول ہیں جن میں پانچ لاکھ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں ۔ بعض اضلاع میں ۸۰۰ اسکول ہیں جو سرکاری اسکولوں کی تعداد کے برابر ہے ۔ اور کہیں پر زیادہ بھی ہیں ۔ بچوں کو اول تا پنجم اردو میڈیم کے ذریعہ نصابی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ساتھ قرآن خوانی ، دینیات اور مذہب کی عملی تعلیم دی جاتی ہے ۔ صوبہ کی زبان ہندی تیسری جماعت سے پڑھائی جاتی ہے ۔ پانچویں جماعت کے بعد ان طلبہ کو سرکاری اسکولوں کی چھٹی جماعت میں بہ آسانی داخلہ مل جاتا ہے ۔ اس لئے کہ ان اسکولوں سے آئے ہوئے طلباء کا معیار تعلیم سرکاری اسکولوں کے طلبہ سے بہتر ہوتا ہے ۔

ان اسکولوں کو چلانے کے لئے کوئی سرکاری امداد نہیں لی جاتی ۔ ماہانہ ۴ کروڑ

روپے کا سرمایہ خود مسلمانوں کی باہمی امداد، چندہ اور چٹکی فنڈ، سے فراہم ہوجاتا ہے۔ چٹکی فنڈ وہ ہے جو غریب خاندان بھی روز کے کھانے میں سے آٹا، چاول گیہوں کا تھوڑا سا حصہ الگ کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک بہت معمولی ایثار نظر آتا ہے۔ لیکن ہر گھر کو اس اسکیم میں شامل ہونے کا فخر حاصل رہتا ہے اور اپنے بچوں کی تعلیم سے راست دلچسپی کا واسطہ اس اسکیم کی کامیابی کا روشن پہلو ہے ہر فرد، مرد و عورت کا یہ احساس کہ وہ بھی اس اسکیم کا ایک حصہ ہے، یہ احساس ہی اس تنظیم کی اصل روح ہے۔

اس تنظیم نے حکومت سے نہ کچھ طلب کیا ہے اور نہ کچھ پوچھا ہے۔ اور نہ اس چٹان سے سر ٹکرانے میں وقت ضائع کیا ہے۔ اپنے بچوں کی پرائمری ایجوکیشن اپنے حسب مرضی چاہیں تو پھر اس کا نظام بھی اپنے ہاتھوں میں ہونا چاہئیے۔ بے شک ہندوستان میں اس کا عملی کامیاب تجربہ ہمارے تعلیمی نظام کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔

اس اسکیم کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے دستور میں "لازمی جبری تعلیم" کی ذمہ داری مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو سونپی گئی ہے۔ جدید تعلیمی قومی پالیسی کے ایکشن پروگرام میں ۱۹۹۵ء تک ملک کے وہ تمام بچے جن کی عمریں ۶ تا ۱۴ سال ہوں گی اس اسکیم کے تحت اسکولوں میں شریک رہیں گے۔ لیکن آزادی کے بعد سے دو مرتبہ اس ٹارگیٹ کو چھونے میں ناکامی ہوچکی ہے اور یہ ٹارگٹ بھی قابل عمل نہیں ہے۔ اس کی ناکامی کے آثار ابھی سے شروع ہوچکے ہے ایسی صورت میں دینی تعلیمی کونسل ملک کے دستور کی اسپرٹ کو قائم رکھتے ہوئے ایک بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہے۔ وہ ۴ تا ۱۰، ۱۱ سال کی عمر کے بچوں کو پانچویں جماعت تک تعلیم دے کر دستور کی ایک اہم دفعہ کی تکمیل میں ممد و معاون ہے۔

اس تعلیم کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اگر ذوق و شوق دلچسپی سے

دی جائے تو طلبہ کا معیار تعلیم بھی اونچا ہوگا۔ بچوں کو آگے کی تعلیم کے مراحل طے کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہ بچے اونچی جماعتوں میں بھی اپنے معیار کو باقی رکھ سکیں گے اس سے ہٹ کر تربیت کا جو سرمایہ ان کے پاس ہوگا وہ ساری زندگی کام آئے گا۔

یہاں پر ایک عام اور شدید غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ صرف انگلش میڈیم کے طلبہ کا معیار تعلیم اونچا ہوتا ہے۔ اور جب بھی اردو میڈیم طلبہ کا ذکر چلتا ہے تو پست معیار تعلیم ذہن میں آجاتا ہے یہاں پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں دراصل معیار تعلیم کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہے۔ یہ تو مسلمہ ہے کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی میں ہونا چاہئے اس لئے کہ "بچہ مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے (ذاکر حسین) اصل میں انگلش میڈیم مدارس کی مہنگی تعلیم ہے۔ جو تعلیم مہنگی ہوگی وہ معیاری ہوگی۔ اور جو ارزاں ہوگی۔ اس کا معیار بھی کم ہوگا۔ اس کے علاوہ ادارہ کا انتظامیہ، اساتذہ کی لگن، ماں باپ کی غیر معمولی دلچسپی انگریزی کے ساتھ سماج میں مرتبہ کا احساس گھر پر ٹیوشن کا انتظام وغیرہ وغیرہ اسی باتیں ہیں جو تعلیم کے معیار کو بلند کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ورنہ انگریزی زبان میں از خود ایسی کوئی بات نہیں یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریزی داں حضرات بھی ساری عمر اچھی انگلش نہیں لکھ سکتے۔ کام چلاؤ انگریزی بولنا، لکھنا اور بات ہے۔

آندھرا پردیش میں اردو کا مسئلہ:

اترپردیش کی اس دینی کونسل کے کام سے ہمیں بہت کچھ روشنی ملتی ہے جہاں تک ہماری ریاست میں اردو کا مسئلہ ہے آزادی کے بعد سے جوں کا توں قائم ہے۔ وہ زیادہ تر کسی عملی سنجیدگی کاوش کے، سمینار، ادبی کانفرنسوں اور سیاسی پلیٹ فارم کا

موضوع رہا ہے ۔لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے ان سب کا کام ۳۰، ۴۰ برسوں میں صفر سے آگے نہیں بڑھا ہے ۔حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سب ہمارے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہماری حسب مرضی کر دے گی ایک لاحاصل کوشش ہے اور وقت ضائع کرنا ہے ۔اور طویل تجربہ بتلاتا ہے کہ بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے ۔ہاں کسی نے اس میدان میں عملی قدم اٹھایا ہے تو وہ مساجد کے معتمدین ہیں یا دینی تعلیمی درس گاہوں کے سربراہ ہوں گے ۔جنھوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ پرائمیری ایجوکیشن کا انتظام اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ کیا ہے ۔

دینی تعلیمی کونسل کی عملی مثال ہمارے لیے ایک مشعل راہ ہے ۔اچھا ہوتا ہمارے اکابر جنھیں ملت کے بچوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی ہے وہ مل کر بیٹھیں اور کوئی عملی تعلیمی پنج سالہ منصوبہ بنا کر آگے بڑھیں ۔حکومت کے G O s چاہے اردو سے متعلق ہوں یا اقلیتوں سے چاہے وہ کتنے ہی خوش ہوں حکومت کی مشنری اتنی پیچیدہ ہے کہ ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ۔اس کاغذی پیرہن سے اصلی تصویر کے نقوش ابھرنے تک ایک عرصہ گزر جائے گا آج سے دس برس بعد حیدرآباد میں کوئی سمینار ہو گا تو ہر شخص کہے گا کہ

"ہم جہاں سے چلے تھے بس وہیں پر ہیں"

تعلیم میں ہوم ورک کی اہمیت

"ہوم ورک" بظاہر ایک معمولی سا ناقابل اعتنا مضمون معلوم ہوتا ہے لیکن ہمارے تعلیمی نظام میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ٹریننگ کالج کی کتابوں میں اس عنوان پر بہت کچھ مواد مل جاتا ہے ہوم ورک کا تعلق ٹیچر، طالب علم اور والدین سے ہے۔ یہ ایک مثلث ہے جس میں تینوں زاویے اہم ہیں۔ اگر گھر پر والدین، بھائی بہن پڑھے لکھے ہوں تو وہ بچہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ورنہ ساری ذمہ داری خود طالب علم پر عائد ہوتی ہے۔

جہاں تک ہوم ورک کا تعلق ہے، طلبہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ طلبہ جو گھر کے دیئے ہوئے کام کو بہت ذوق و شوق سے کرلیتے ہیں اور جماعت میں یا اپنے گروپ میں ہمیشہ ممتاز رہنا چاہتے ہیں وہ اپنے گروپ کی لیڈر شپ سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے۔ اس لئے اسکول کے کام کو اچھی طرح کرنے اور وقت پر پیش کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسرے وہ طلبہ جو گھر پر نگرانی یا رہنمائی مل جائے تو ہوم ورک پابندی سے لاتے ہیں۔ تیسرے طلبہ کا وہ گروپ ہے۔ جنھیں ہوم ورک کے نام سے ہی چڑ اور بیزار گی ہے۔ یہاں اصل مسئلہ ان طلبہ کا ہے جو ہوم ورک کرنا چاہتے ہیں لیکن عدم رہنمائی کی وجہ پریشان رہتے ہیں۔

ہوم ورک کے فائدے:

(۱) ٹیچر کا اہم کام غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور غلطیوں کو درست کرنا ہے۔ طالب علم اپنی دانست میں جس کو صحیح سمجھتا رہا وہ غلط نکلا تو پھر دوبارہ وہ غلطی نہ کر پائے گا۔ تصحیح کے معنی بہتری اور ترقی کے ہیں۔ جب تک طالب علم کو اپنی غلطیوں کا

علم نہ ہو وہ برابر غلطیاں کرتا جائے گا اس سے نہ صرف اس کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ لکھنے سے قبل یہ سوچ میں پڑجائے گا کہ آیا یہ لفظ، جملہ، یا جواب درست ہے کہ نہیں۔

اس طرح سوچنے، سمجھنے اور لکھنے کی عادت ہی ہوم ورک کی جان ہے اس کی مشق ہوجائے تو پھر وہ ہوم ورک بہت کام کا ہے۔ اس کی کوشش کیجئے کہ طالب علم بہت تیزی سے سیکھ رہا ہے اور ساری تعلیم اسی سیکھنے، سمجھنے اور سوچنے کا نام ہے۔

(۲) جو کچھ سبق پڑھایا جاتا ہے وہ کچھ وقفہ کے بعد اسی سبق پر سوالات دینے کی وجہ بہت سی باتیں ذہن و دماغ میں تازہ ہو جاتی ہیں۔ سبق کا یاد کرنا اور مختلف زاویوں سے اس کے مواد پر عبور حاصل کرنا ممکن ہوجاتا ہے۔ تعلیم اور ہوم ورک کا عمل کچھ ایسا ہی ہے جیسے غذا کے کھانے اور ہضم کرنے کا ہوتا ہے۔

(۳) ہوم ورک ابتدائی جماعتوں سے میٹرک تک ضروری ہے کالج اور اعلیٰ تعلیم کی سطح پر ہوم ورک کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ یہاں پر طلبہ کو خود لائبریری کتب کی مدد سے مضامین تیار کرنے پڑتے ہیں اور نوٹس لکھنے کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ اس قسم کی صلاحیت بنیادی طور پر ابتدائی جماعتوں میں ہوم ورک کی مشق اور عادت پر منحصر ہے۔

(۴) ہوم ورک دیکھنے سے طلبہ کی قابلیت، صلاحیت اور مہارتوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسکول پہنچنے سے قبل ان میں خود اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے اور جو خالی ہاتھ آتے ہیں۔ انھیں بہانے تلاش کرنے میں بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔

سرکاری اسکولوں میں ہوم ورک برائے نام ہی ہوتا ہے ہر جماعت میں طلبہ

کے بے ہنگم ہجوم کی وجہ ٹیچرس کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ طلبہ کا ہوم ورک دیکھیں، درست کریں، پھر مناسب ہدایات دیں بعض ضابطہ کی تکمیل کے لیے سال بھر میں چند صفحات ہوم ورک کے کروادیتے ہیں، اور اکثر بغیر دیکھے دستخط کر دیتے ہیں۔جب طلبہ کو یہ احساس ہوجاتا ہے کہ یہ ایک ضابطہ کا کام ہے اور اصل تعلیمی ترقی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو پھر وہ بھی بد دل ہوجاتے ہیں۔

کسی ٹیچر کے کام کو جانچنے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں:

(۱) ٹیچر نے اسباق کی تیاری میں کس حد تک دلچسپی لی ہے۔

(۲) کلاس روم میں پڑھانے کا انداز کس حد تک موثر اور دلچسپ ہے۔

(۳) ٹیچر نے ہوم ورک کتنا دیا ہے اور کس دلچسپی سے اس کی تصحیح کا کام کیا ہے۔

ایک کالج میں بحثیت پرنسپل مجھے ہر ماہ اسٹاف کونسل کی میٹنگ رکھنا پڑتی۔ ابتدائی تعلیمی سال ہی میں ہوم ورک کا ایک ٹارگٹ مقرر کیا جاتا کہ ہر مضمون میں سال بھر میں کم از کم (۱۵۰) صفحات کا ہوم ورک دیا جائے اور اچھی طرح دیکھا جائے۔ لیکن کسی سال بھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سخت مایوسی ہوئی ایک سائنس کے لکچرار کے متعلق یہ شکایت عام تھی کہ نہ تو وہ پڑھاتے ہیں اور نہ ہوم ورک کراتے ہیں، ایک دو وقت تو توجہ دلانی پڑی۔جب بہت ہی سنجیدگی پر اتر آیا تو لکچرار صاحب نے وعدہ کیا کہ آٹھ دس یوم میں ہوم ورک کی کاپیاں پیش کردوں گا۔ حسب وعدہ موصوف نے ہوم ورک پیش کیا۔ویسے طلبہ کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ ہوم ورک بہت اچھا کروایا گیا تھا،بہت سے خاکے وغیرہ بھی بنے ہوئے تھے۔لکچرار صاحب نے شکایت بے جا کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔چند دن بعد انکا تبادلہ ہو گیا تو

طلبہ نے اعتراف کیا کہ لکچرار موصوف نے ان سب طلبہ کی کاپیاں گھر لے جاکر اپنی بیگم صاحبہ سے جو خوش قسمتی سے کسی اسکول میں ٹیچر تھیں ۔اور ان طالبات سے جو گھر پر ٹیوشن پڑھنے آتی تھیں ، ان سے اپنے کالج کے طلبہ کا ہوم ورک مکمل کرایا ۔ مختلف تواریخ میں دستخط کر کے پرنسپل کے سامنے وقت پر نہایت متانت اور انکساری سے پیش کر دیا لکچرار صاحب کی اس جدّت پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا

جو طلبہ ہوم ورک پابندی سے لاتے ہیں ، اس کے لئے والدین کی دلچسپی اور گھر کے ماحول کو بڑا دخل ہے ۔ گھر میں الگ بیٹھنے کی جگہ نہ ہو ، بڑوں میں گپ شپ جاری ہو ، ٹی ، وی سیریل چل رہا ہو ، کبھی مہمان آچکے ہوں اور ان کے بچے کتابوں پر قبضہ کر لیئے ہوں یا ماں باپ میں کسی بات پر تکرار چل رہی ہو تو پھر ہوم ورک ، ہوم کی نذر ہو جاتا ہے ۔ بچے جھلا کر رہ جاتے ہیں کیوں کہ وہ بڑوں کو کچھ کہہ نہیں سکتے ۔ تعلیم کا کام خوشگوار اور گھر کے پر سکون ماحول ہی میں اچھا ہو سکتا ہے ۔

ہم یہ سوچیں کہ ہم کس حد تک بچوں کے تعلیمی کام کے لئے گھر پر اچھا ماحول پیدا کر سکتے ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ہوم ورک میں کیا کچھ مدد دے سکتے ہیں اس کام میں بچوں کے سامنے بار بار اپنی قابلیت کا ذکر نہ کریں اور نہ اپنے زمانہ طالب علمی کا شاندار تعلیمی ریکارڈ دہراتے جائیں بلکہ ان کی رہنمائی میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہے کہ بچوں کی برابر ہمت افزائی ہو رہی ہے ۔اس دوران بچہ کا مقابلہ کلاس کے دوسرے ساتھیوں سے نہ کریں تو بہتر ہے ۔ جو حضرات ڈانٹ ڈپٹ ضروری سمجھتے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے تعلیم کا اصل مقصد ہی ختم ہوجاتا ہے اور جو مار دھاڑ گالی گلوج پر اتر آتے ہیں اس سے تعلیم کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے اور اسکے بہت گہرے منفی اثرات پڑتے ہیں ۔

بچوں کی تعلیم اور ماحولیات

THE EARTH IS THE HOME OF MAN کرہ ارض انسان کا گھر ہے انسانی یا حیوانی زندگی کے لئے ہوا، پانی، غذا، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا، سر چھپانے اور راحت کی زندگی بسر کرنے کے لئے مکان یا آسرا ضروری ہیں۔ جس چیز کے بغیر حیات زندگی ممکن نہ تھی، قدرت نے اپنی فیاضی سے اسے اتنا ہی عام اور ارزاں کر دیا ہے۔ ہوا اور پانی روشنی اور حرارت کے بغیر زندگی ممکن نہ تھی۔ لیکن قدرت کا فیضان اتنا عام ہے کہ آدمی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی بیش قیمت قدرت کی فیاضوں سے ہر آن استفادہ کر رہا ہے۔

ہمارے ماحول میں کیا ہے۔ یہی ہمارے اطراف و اکناف کے قدرت و فطرت کے نظارے ۔۔۔ زمین، آسمان، چاند، ستارے، جنگل، پہاڑ، ندی، نالے، چشمے، سمندر، بادل کی گرج، بجلی کی چمک، پرند، درند، جنگل میں کوئل کی کوک، مور کی چنگھاڑ، شیر کی ڈکار، ہرن کی چشم، ہری گھاس کا مخملی قالین، بھانت بھانت کے پھول، کنول، گلاب، کلیاں، شہد کی مکھیاں وغیرہ وغیرہ یہی کچھ تو ہے جو انسان کی زندگی کا پیغام دیتی ہیں۔ انھیں دیکھنے سے زندگی میں تازگی اور رہنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں۔۔

آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

زمین روح آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے۔۔

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

ہر بڑا شاعر چاہے وہ کسی زبان کا ہو، اپنے فطری ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شاعر کا دل اسی فطرت کے میخانہ سے شراب طہور کے جام پیتا رہا ٹیگور لکھتے ہیں

" جب میں بچہ تھا تو صبح اٹھ کر باغ میں دوڑ کر جاتا۔ فطرت ایک
خوبصورت لڑکی کے روپ میں میرے سامنے مسکراتی کھڑی ہوجاتی
اور اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر لیتی مجھ سے پوچھتی کہ بتا
اس میں کیا ہے۔ اور میں جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔"

اس میں سچ مچ زندگی یا حسن اور خوبصورتی تھی، جو ہماری زندگی کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ جس سے دل کی گہرائیوں سے نغمے نکلتے ہیں جو لافانی۔ شاعری کا خزانہ ہیں۔ شاعر فطرت ورڈسورتھ جنگل میں پھولوں کے رقص کو دیکھ کر مچل جاتا ہے اور جو لوگ اس حسن کو نہیں دیکھ سکتے اور جو دنیا کے دھندوں ہی میں گرفتار ہیں۔ ان کے متعلق حسرت سے کہتا ہے

THE WORLD IS TOO MUCH WITH US

اسی لیے اقبال کہتے ہیں ۔۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

GOLD-SMITH گولڈ اسمتھ انگلستان کے صنعتی انقلاب کے سیلاب میں اجڑتے گاؤں شہروں اور کارخانوں کے اطراف ابھرتی ہوئی گندی بستیوں کو دکھ بھری نظر سے دیکھتا ہے، گاؤں دیہات کی سیدھی سادی پاک و صاف زندگی سے دور، گندی بستیوں، اخلاقی پستیوں اور سرمایہ داروں کی حرص و آز پر کہتا ہے۔

" WHERE WEALTH ACCUMULATES , MEN DECAY"

(جہاں کہیں دولت جمع ہوتی ہے، آدمی پستیوں میں گر جاتا ہے)

قرآن شریف میں قریب دو سو سے زائد آیتیں ایسی ہوں گی جو ہمیں قدرت و فطرت کی صناعیوں پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد حسن فطرت اور قدرتی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جس قدرت نے ہمیں زندگی دی، اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت یعنی حسن و زیبائش کی بخشش سے مالا مال کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہمیں حسن کا احساس دیا، دوسرے ہاتھ سے دنیا کو جلوہ حسن بنا دیا۔"

(ترجمان القرآن۔ تفسیر سورہ فاتحہ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹)

"انسانی فطرت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا اس کی قدر و قیمت کا ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتا تم گنگا کے کنارے بستے ہو اسی لئے تمہارے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ بے قدر چیز پانی ہے

(ص ۱۱۱)

تم بسا اوقات زندگی کی مصنوعی آسائشات کو ترستے ہو اور خیال کرتے ہو کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت چاندی سونے کا ڈھیر اور جاہ و حشم کی نمائش ہے ۔۔۔۔۔۔ نہیں جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو، دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی ہے اور شام ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہے جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہے جس کی بہار سبزہ گل سے لدی ہوتی اور جس کی فصلیں لہلہاتے کھیتوں سے گراں بار ہوں، جس دنیا میں روشنی چمک، رنگ، اپنی بو قلمونی، خوشبو اپنی عطر بیزی اور موسیقی اپنا نغمہ و آہنگ رکھتی ہو، کیا اس دنیا کا کوئی باشندہ آسائش حیات سے محروم اور نعمت معشیت سے

مفلس ہو سکتا ہے (ص ۔۱۱۱)

ہمارے سنت، صوفی، فقیر درویش، رشی نے فطرت کے گہوارہ ہی میں سکون پایا۔ جنگلوں، پہاڑوں، وادیوں اور ریگ زاروں میں انھیں قدرت کی تجلیاں نظر آئیں ان کی ذات سے روحانی سکون کے چشمے پھوٹے جس سے انسانی آبادیاں سیراب ہو گئیں۔

سائنس نے جہاں قدرت و فطرت کے نظام کائنات کو انسان کی آسائش کے لیے جس طرح کارآمد بنایا ہے وہ انسانی تاریخ کا حیرت انگیز کارنامہ ہے وہیں پر انسان کو اس کرہ ارض سے مٹا دینے کے امکانات بھی پیدا کر کے دل و دماغ پر خوف و دہشت کے بادل پھیلا رکھے ہیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ سائنس کی کھوج اور تشریح کی وجہ انسان کے دل سے وہ حیرت و استعجاب کا عنصر جاتا رہا جو فطرت کے ساتھ ہزاروں برس سے قائم تھا۔

> بچوں کی تعلیم کا بنیادی کام دو قسم کا ہے ایک تو بچہ کی شخصیت ترقی کرے اس کے باطنی یا نفسیاتی نظام جسم دل و دماغ میں توازن پیدا کرے دوسرے اس کی شخصیت ترقی کرے اس کے باطنی یا نفسیاتی نظام جسم دل و دماغ میں توازن پیدا کرے دوسرے اس کی شخصیت کا توازن اپنے اطراف و اکناف کے ماحول، گھر، اسکول سوسائٹی اور فطرت کے ساتھ برقرار ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑ جائے گا وہاں کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم باطنی و ظاہری توازن کو نہ صرف برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ بلکہ اس پر

قابو پانے کا نام ہے۔ ماحولیات کا تعلق اسکول کے سب ہی مضامین، باٹنی،

بیالوجی، فزکس، کیمسٹری، ریاضی، زبان و ادب لٹریچر وغیرہ سے ہے ان مضامین میں سوشل اسٹڈیز سے شاید ماحولیات کا کچھ زیادہ ہی تعلق ہے۔ ۱۹۶۲ میں سارے آندھراپردیش کے ملٹی پرپز ہائی اسکولوں میں پڑھانے والے سوشیل اسٹڈیز ٹیچرس کا ایک سیمینار مرکزی وزارت تعلیم کی جانب سے حیدرآباد میں منعقد ہوا ان میں اکثر اساتذہ ایسے تھے۔ جنھوں نے ہندوستان کے اہم پروجیکٹ دریا، پہاڑ اور سمندر دیکھے ہوئے نہ تھے۔ بھلا ایسے اساتذہ کیا سوشل اسٹڈیز پڑھا سکتے ہیں۔ میں نے ایک تجویز یہ رکھی تھی کہ تمام سوشل اسٹڈیز کے اساتذہ کو لازماً مختلف گروپس میں تعلیمی تفریح کے طور ملک کے تاریخ اور جغرافیائی اہمیت کے مقامات کی سیر کروائی جائے یا انھیں اس قسم کے سفر کی سہولتیں دی جائیں۔ اساتذہ اگر گہری نظر رکھتے ہوں تو اسکولوں اور کالجوں میں دوران سبق یا لیکچر اپنے مضمون کو ماحولیات سے مربوط کر سکتے ہیں۔

ماحول کی قدر و قیمت:

فطری ماحول کے برقرار رکھنے کی اہمیت سے واقف کروانے کا زمانہ پرائمری اسکول سے سکنڈری سطح تک کا ہے۔ کیوں کہ یہی بچے بڑے ہو کر اس کی حفاظت کر سکیں گے۔

ماحولیات کی تعلیم اور ترقی دینے کے سب پروگرام پرائمری اسکول سے شروع ہونے ضروری ہیں اور نصابی مضامین میں ماحولیات کو جگہ دینا ضروری ہے۔ اگر دور رس پروگرام کے نقطہ نظر سے جانچا جائے تو اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ دوسری سب کوشش اس بنیادی کام کے سامنے ثانوی یا دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ماحولیات کی تعلیم کلاس روم ہی میں بلکہ دیہات میں، شہروں کے باہر بہتر طور

پر دی جاسکتی ہے ۔ ہمارے اسکول اور کالجوں میں اسکاوٹنگ گرل گائیڈس ، NSS،
N C C ، جیسی طلبہ کی تنظیمیں طلباء کو ماحول سے قریب لانے کا بہترین
ذریعہ ہیں ۔ تعلیمی تفریح ، HIKING کیمپ فائر میں طلبہ کو غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے
اور ماحول سے انھیں انس پیدا ہوجاتا ہے ۔ گھر ہو کہ اسکول ، طلبہ کو باغبانی اور
پودے لگانے کی ترغیب دی جاتی ہے تو انھیں فطرت سے لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے ۔ تعلیم کا
ایک مقصد ، طلبہ میں حسن وقبح / SENSE OF APPRECIATION کی تمیز
پیدا کرنا بھی ہے ۔ یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے زمانہ سے یہ
مقصد اساتذہ کے سامنے رہے ۔

مختصر یہ کہ آسمان و زمین میں (معرفت حق) کی کتنی ہی
نشانیاں ہیں (لیکن افسوس انسان کی غفلت پر) لوگ ان پر سے گذر
جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے ۔ (سورہ یوسف ۱۲: ۱۰۵)

سرسری تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا ، جہان دیگر تھا

(میر تقی میر)

توارث، ماحول اور تعلیم

HEREDITY , ENVIRONMENT

AND EDUCATION

ایک امریکن خاتون ماہر تعلیم ہیں جنھیں کئی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی گئی ہیں ۔ وہ لکھتی ہیں کہ میاں بیوی کوئی بیس برس تک ساتھ ساتھ زندگی گذارنے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہتے ہیں ۔ان کا حال کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دو معصوم بچے اندھیرے میں سہمے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ۔

آپ اب بہت غصہ میں ہیں ۔سامنے والے سے کہہ رہے ہیں: "تجھ جیسا دنیا میں نہ ہوگا۔ "تیرے جیسا دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا" بات تو غصہ کی ہے لیکن آپ نے اپنی زبان سے فطرت کی ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے ۔ سچ مچ اس وقت روئے زمین پر نہ تو آپ جیسا اور نہ اس جیسا کوئی اور موجود ہی نہیں ہے ۔ باوجود ناک نقشہ ایک سا ہونے آپکا ثانی کوئی نہیں ۔ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ قدرت کا عجوبہ ہی نہیں بلکہ ہر نمونہ نیا، نرالا اور بے مثال ہوتا ہے ۔ایک وقت جو نمونہ ڈھل چکا ہے پھر اس کا اعادہ نہیں ہوتا۔ صورت شکل ہی میں نہیں، عادات و اطوار، فطرت و مزاج میں منفرد ہوتا ہے ۔

کسی گھر میں اگر چار پانچ بچے ہوں تو آپ دیکھیں گے، لڑکی ماں کی جیسی ہے، لڑکا باپ کا سا، کوئی دادی کی طرف گیا ہے تو کوئی نانی کو پڑی ہے کوئی دادا کی چال پہ

آیا ہے تو کوئی نانا کی مسکین طبیعت پایا ہے ۔ آخر ایسا کیوں ؟ ماہرین حیاتیات نے اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کی آبادی اگر چالیس گنا ہو جائے تو اس تمام آبادی کے جنگل میں صرف دو افراد ایسے مل سکیں گے جن کے انگشت کے نشان یکساں ہوں گے دو جڑواں بچے باوجود شکل وشباہت میں زبردست مماثلت رکھنے کے ان میں بھی ذہنی ، جسمانی اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ اس لامحدود اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی نشو ونما میں دو عناصر پائے جاتے ہیں ایک تو ہے توارث اور دوسرا ماحول توارث وہ سب کچھ ہے جو بچہ بوقت پیدائش اپنے ساتھ لایا ہے ۔ اسے راست ماں باپ کا عطیہ کہا جاسکتا ہے ۔ توارث وہ تمام قوتوں اور امکانات کا مجموعہ ہوتا ہے ۔ جو بوقت استقرار حمل عضویہ میں موجود رہتا ہے یا کسی عضویہ کا کل ساز وسامان ہی توارث ہے ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ بچہ کی جسمانی ، ذہنی صلاحتیں ، ناک نقشہ ، رنگ وروپ اور قد وغیرہ کا تعین سب اسی لمحہ ہو جاتا ہے جب کہ حمل قرار پاتا ہے ۔ اس کے بعد اس میں کسی قسم کا اور اضافہ نہیں کیا جاسکتا ۔

" ایمرسن EMERSON کا خیال ہے کہ توارث صرف ماں ، باپ کا ہی عطیہ نہیں ۔ بلکہ اس کے خون میں ہمارے قریبی اور بعیدی ، دور دور تک کے بزرگ شامل ہیں ۔ ہم ان تمام کا جن سے ہمیں تعلق رہا ہے ایک جزو ہیں ۔ " توارث کا ایک طویل سلسلہ ہمارے آباواجداد سے ملا ہوا ہے ۔ ہمارے وجود کے لئے جن ہزاروں نسلوں نے کام کیا ہے ان کی جسمانی اور ذہنی خصوصیات بھی ہم کو ملتی ہیں ۔ ماں باپ کی ساری خصوصیات بچوں میں نہیں ملتیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم صرف ۲۰ پشتوں کے بزرگوں کا شمار کریں جنھوں نے ہماری انفرادیت میں حصہ لیا ہے تو ان کی تعداد دس لاکھ ہوگی اور اگر ۳۰ پشتوں تک چلے جائیں تو ان کی تعداد ایک لاکھ کروڑ

سے بھی زیادہ ہوجائے گی۔ ابتدائے آفرنیش سے ہم اندازہ کرنے ن سے قاصر ہیں اس لیے ہر فرد دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک دفعہ جو نمونہ ڈھل چکا ہے دوبارہ اس کا اعادہ ہونے نہیں پاتا۔

ماحول ان مہیجات کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ جس کی وجہ کسی ذی حیات میں اس کی قدرتی صلاحتیں نشو ونما پاتی ہیں۔ مہیّج STIMULUS ہر وہ قوت کا نام ہے جو ہماری شخصیت پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ہر لمحہ کوئی نہ کوئی قوت ہم پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے ہم اپنے کام میں مشغول ہیں گھڑی کی ٹک ٹک، بچہ کی رونے کی آواز، چڑیا کے چہکنے کی آواز ہمارے کانوں میں آتی ہے۔ لیکن ہم اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہ سب ہمارے ماحول سے خارج ہے۔ لیکن جب کوئی چیز میز سے گر جائے تو فوراً ہماری توجہ اس طرف جاتی ہے یہ مہیّج ہے۔ آب وہوا، سردی، گرمی، غذا، لباس، یہ سب ہمارے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم، خیالات، مہارتیں سب ہی مہیجات کی اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔

توارث کے اثرات:

توارث کے سلسلہ میں چند بنیادی باتیں ہیں۔ بچے ماں باپ جیسے ہوتے ہیں۔ انسان سے انسان کے بچے پیدا ہوتے ہیں اور بلّی سے بلّی کے بچے ہوں گے۔ بلند قامت ماں باپ کے بچے بھی اونچے قد کے ہوں گے۔ پست قامت ماں باپ کے بچے بھی پست قد ہوتے ہیں۔ اسی طرح عادات واطوار اور ذہنی لحاظ سے توارث کا اثر دیکھنے میں آیا ہے سر فرانسیس گولٹن نے کئی ایک تحقیقات کی ہیں۔ اس نے بعد تحقیق بتلایا ہے کہ ۹۷۷ قابل اشخاص کے خاندانوں میں ۵۳۵ قابل رشتہ دار پائے گئے اسی طرح ۹۷۷ معمولی افراد خاندانوں میں صرف ۴ لائق افراد مل سکے۔ اچھے قابل گھرانوں میں پیدا

ہونے والے بچوں میں قابل بننے کا ۳۰۰ گنا زیادہ احتمال ہے۔ اسی طرح اخلاقی و معاشرتی خصوصیات کا تعلق توارث سے ہے یا ماحول سے لیکن تعلیم و تربیت کا کتنا اثر ہوتا ہے۔ اس بحث میں گئے بغیر مندرجہ ذیل چند دلچسپ مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ توارث کے کتنے دور رس اثرات ہو سکتے ہیں۔

جیوکس کا خاندان۔ JUKES FAMILY :

مسٹر ڈک ڈیل نے ۱۸۷۷ء میں ایک خاندان جیوکس کی تحقیق کی وہ ۱۷۲۰ء تا ۱۸۷۷ء تک تقریباً ڈیڑھ سو برس کے واقعات اور اعداد اس خاندان کے جمع کیے۔ اس کا مورث اعلیٰ ایک آوارہ مزاج شخص MAX JUKES تھا۔ اس نے اپنے ہی جیسی ایک آوارہ بدکار عورت سے شادی کی۔ ۱۸۷۷ء تک ان کی پانچ نسلیں ہوئیں۔ جن میں بارہ سو افراد کا پتہ ملا۔ ان میں ۳۲۰ بھکاری، ۷ قاتل، ۶۰ چور، ۵۰۰ افراد حرام کاری میں مبتلا، ۱۳۰ مجرم، ۴۴۰ عیاشی اور اوباشی میں مبتلا ہو کر اپنی جسمانی حالت تباہ کر چکے تھے۔ ۳۰۰ کا زمانہ شیر خوارگی میں انتقال ہو چکا تھا صرف ۱۲۰ ایسے تھے جنھوں نے کچھ کاروباری پیشہ سیکھا تھا۔ اور ان میں بھی دس جیل میں کچھ ہنر سیکھنے والے تھے اس ناکارہ خاندان پر ریاست نیویارک کو دس لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم برداشت کرنی پڑی

CALICAX FAMILY

ڈاکٹر گاڈرڈ نے خاندان کیلی کاس مطالعہ کر کے دلچسپ

نتائج پیش کیے ہیں۔ ۱۷۷۵ء میں ایک نوجوان شخص مارٹن کیلی کاکس، ۲۱ سالہ نوجوان انقلابی افواج میں شامل تھا۔ وہ کسی سرائے میں ناقص العقل لڑکی سے ملوث ہوا۔ اس لڑکی کے بطن سے ایک ناقص العقل لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کی آل اولاد سے ۴۸۰ افراد کا پتہ ملا۔ ان میں ۳۶ ناجائز اولاد تھے۔ ۳۳ عیاش، ۲۴ شرابی، ۳ سزا یافتہ مجرم، ۸ قحبہ خانہ چلانے والے، ۸۲ کا انتقال زمانہ شیر خوارگی میں ہو چکا تھا، ۱۴۳ ضعیف العقل

اور ۳ مرگی کا شکار تھے۔

یہی نوجوان کچھ دنوں بعد ایک شریف گھرانے کی ذہین لڑکی سے شادی کیا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کے ۴۹۶ نام لیواؤں کا پتہ چلا جن میں سب کے سب قابل تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد، گورنر، یونیورسٹی کے پروفیسر، ادیب اور بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ہونا چاہیے کہ دوران حمل بعض مائیں اپنی ہونے والی اولاد پر اثر ڈالنے کے لیے سوچتی ہیں۔ بعض اونچے گھرانوں کی عورتوں کا خیال ہے کہ دوران حمل پڑھنے لکھنے میں مشغول رہنے سے بچہ ذہین ہوگا۔ یا پھر خوبصورت تصویر دیکھتے رہنے سے لڑکی حسین ہوگی۔ یہ سب خیال خام ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ بچہ کی حقیقی فطرت کا تعین اسی وقت ہوچکتا ہے۔ جب کہ حمل قرار پاتا ہے۔

لیکن ہمیں ان باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آئندہ بہت کچھ بچوں کی تعلیم و تربیت اور بچوں میں اعلیٰ خصوصیات پیدا کرنے کے مواقع ہیں۔ اگر مجرم کا لڑکا مجرم ہی ہوتا اور نیک شخص کا بیٹا نیک ہی نکلتا تو پھر ساری تعلیم و تربیت بے کار سمجھی جاتی۔ مقام شکر ہے کہ طفل انسانی پیدائش کے وقت نہ تو نیک ہے نہ بد۔ اس کے والدین اور اس کا آئندہ ماحول اس کو ایک خاص طریقہ پر تیار کرتا ہے۔ کل مولود یولد علی الاسلامہ ○ (یہاں بھیڑیا بچہ راموکی مثال "معیار تعلیم" کے عنوان کے تحت ضرور دیکھ لیں) ہر بچہ فطرت سلیم پر ہی پیدا ہوتا ہے۔

اوپر کی چند مثالوں سے واضح ہو چکا ہوگا کہ ہر بچہ کچھ نہ کچھ طبعی استعداد یا ذہانت لے کر دنیا میں آتا ہے۔ متعدد طلبہ کو ایک ہی قسم کی تعلیم دینے کے باوجود ان کی لیاقت اور قابلیت میں بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں یقیناً یہ بیج کی خاصیت

ہے۔ کیوں کہ ماحول تو یکساں ہے۔" نیم کا درخت خواہ بہشت میں بویا جائے مگر اس کی کڑواہٹ میں کمی نہ ہوگی۔" ہٹلر یا مصطفیٰ کمال کسی گمنام جزیرہ میں پیدا ہوتے تو اپنی ذاتی صلاحیت کی وجہ ان وحشی قبائل میں بھی سرداری حاصل کرتے اور اپنی لیڈری اور جنگی صلاحیت کا ثبوت دیتے۔ تان سین کو اکبر کا دربار نہ ملتا تو شاید اس کو اتنی شہرت نصیب نہ ہوتی۔ بعض کا خیال ہے کہ بچہ کی نشوونما میں ماحول کا تین چوتھائی، بلکہ ۹۰ نوے فی صد حصہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ذہین بچہ کو مناسب ماحول مل جائے تو وہ زمانہ کا قابل شخص بن سکتا ہے اور ایسا ماحول نہ ملے تو وہ مرجھا کر اپنی جگہ رہ جاتا ہے آج بھی بہت سے غریب طلباء ایسے ہیں جنھیں مواقع ملتے تو وہ بہت کچھ ترقی کر جاتے سینکڑوں برس سے زمانہ اور سماج نے ان کے ساتھ سخت بے اعتنائی اور ناانصافی کی جس کی وجہ وہ گوشہ گمنامی میں رہ گئے۔

بہت سے گوہر شاہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک ازفر کی

(طباطبائی)

یہاں پر یہ بتلانا مقصود ہے کہ توارث میں اب کچھ اضافہ نہیں ہوسکتا لیکن قدرت نے بچہ کو صلاحتیں دینے میں جو فیاضی دکھائی ہے اس کو زرخیز ماحول فراہم کر کے ہم ممکنہ حد تک نشوونما دے سکتے ہیں۔ بیج کتنا ہی اچھا ہو۔ اگر مناسب زمین، کھاد، روشنی، پانی، ہوا نہ ملے تو اس کی ساری صلاحیت رائیگاں جائے گی۔ فرد،

توارث ماحول کا حاصل ضرب ہے ۔ نہ کہ توارث اور ماحول کا حاصل جمع توار ماحول = فرد ۔ فرد کی مختلف صلاحیتوں کے نشو و نما کی اچھی مثال بائبل اور قرآن شریف میں دی گئی ہے ۔ آسمان سے بارش تو سب ہی زمین پر ہوتی جہاں زمین زرخیز تھی وہاں کے پودے سرسبز و شاداب زوروں پر آئے، کم زرخیز زمین پر نشو و نما اوسط رہی، لیکن وہ بنجر پتھریلی زمین میں سارے بیج جل کر رہ گئے ۔ یہی حال تعلیم کا بھی ہے ۔ تعلیم وہ باران رحمت ہے جو ساری جماعت کے طلباء پر یکساں برستی ہے ۔ کچھ طلباء بہت تیز ہوتے ہیں کچھ اوسط اور کچھ حاصل نہیں کر پاتے ۔

تعلیم کی اہمیت:

غریب گھروں میں بہتر ماحول نہیں پیدا کیا جا سکتا اس لئے اسکول ہی ایک مقام ایسا ہے کہ جہاں پر بہت اچھا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ تاکہ ہر بچہ اپنی ذاتی قابلیت کے مطابق سیکھ سکے ۔ اور ترقی کر سکے بہت سے غریب گھرانے ایسے ہیں جہاں بچے کوئی اخبار، رسالہ، یا کتاب برسوں میں بھی نہیں دیکھ پاتے لیکن اسکول کی لائبریری، ریڈنگ روم، چارٹس کے ذریعہ بہت ساری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں ۔ اسی طرح غیر نصابی مصروفیات سے دوسرے طلبہ کے ساتھ مل جل کر لڑکا بہت کچھ سیکھ جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ گھرانے کے اور ذہین طلبہ کے لئے الگ اسکول قائم نہیں کرنا چاہئے ۔ ہمارے ملک میں اچھے معیاری اسکول اور غیر معیاری اسکول الگ الگ ہوتے جا رہے ہیں ۔ جو جمہوری مزاج کے خلاف ہے ۔ اس کے اثرات بہت پیچیدہ اور دوررس ہیں جس کا معاشرہ کو اندازہ نہیں ہے ۔

(۲) انفرادی توارث کے علاوہ اجتماعی توارث بھی پایا جاتا ہے جس کو SOCIAL HERITAGE کہتے ہیں ۔ ہماری کئی نسلوں نے ہمیں فنون لطیفہ،

ادب ، عمارت ، تاریخ ، قانون ، روایت ، رسم و رواج ، مذہب و ثقافت کی شکل میں اجتماعی توارث دیا ہے ۔ مشہور غار قلعے ، مندر ، مسجد ہمارے آباواجداد کی شان وشوکت کی یاد دلاتے ہیں ۔اسی طرح جغرافیائی ماحول میں دریا ، پہاڑ ، وادیاں ، جنگل جانور وغیرہ شامل ہیں ۔ میوزیم اجتماعی توارث کا خزانہ ہوتے ہیں ۔ نمائش آرٹ گیلری ، لائبریری وغیرہ ایک نسل سے دوسری نسل کے تسلسل کا بہترین ذریعہ بلکہ ورثہ ہیں ۔ اس سماجی توارث سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں ۔انھیں ان تمام ورثہ سے سیرو تفریح ، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ واقف کروانا ضروری ہے ۔

(۳) بچوں کی ذہنی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی لیکن تعلیم کے دوران ان سب بچوں کے ساتھ یکساں سلوک رکھا جائے ۔ کسی کو ہرگز نکما اور بے کام کا نہ سمجھا جائے اس کی ذہنی استعداد کے مطابق تعلیم دی جائے ۔ تعلیم کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہر سیکھنے اور سمجھنے کے بعد شخصیت میں تغیر آتا جائے گا اور ترقی کرتی جائے گی جتنا ماحول زرخیز ہوگا شخصیت کی نشو ونما بھی اسی انداز سے ہوگی ۔

گھر پر والدین ہوں یا اساتذہ ، اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ تعلیم کے دوران بچوں کو سزا دینے کا طریقہ ، ڈانٹ ڈپٹ ، نہایت نقصان دہ ہے ۔ تعلیم کا عین مقصد ہی اس سلوک سے فوت ہوجاتا ہے ۔

(۴) اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے وقت عام طور پر لوگ عہدہ ، معیار اور دولت دیکھتے ہیں ۔ دیکھنے اور پرکھنے کی چیز اس گھر کا ماحول ، تعلیم و تربیت قابلیت و صلاحیت ہوتی ہے ۔ اس لئے شادی کے وقت لڑکے یا لڑکی کی صحت جسمانی ، تعلیمی معیار ، صلاحیت اور سلیقہ اور مزاج کا میلان دیکھنا چاہیئے تا کہ ان کی آئندہ نسل اچھی ہو سپھلے پھولے اور ترقی کرے ۔

کھیل کود اور تعلیم

"جب سے بچہ محلہ کے بچوں کی صحبت میں پڑا ہے بگڑ گیا ہے۔ اب اس کا جی پڑھنے میں نہیں لگتا۔ جب سے کھیل کا چسکا لگا ہے نہ اس کو بھوک لگتی ہے اور نہ دھوپ چھاؤں کا خیال رہتا ہے بس صبح سے شام تک باہر رہنے لگا ہے۔" ماں باپ کی یہ شکایتیں آپ آئے دن سنتے ہی ہوں گے ایسی شکایتیں کرتے وقت ماں باپ خود اپنے بچپن کا زمانہ بھول جاتے ہیں اور انھیں اپنی شرارتیں یاد نہیں آتیں۔ اگر آپ کا بچہ کھیلتا کودتا ہے اور بچوں کے ساتھ گھل مل گیا ہے تو سمجھیئے آپ خوش قسمت ہیں اور اگر کھیل کود سے دور الگ آپ کا بچہ کسی گوشہ میں خاموش بیٹھا رہتا ہے تو یہ آپ کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے۔ کیونکہ یہ مسائلی بچہ PROBLEM CHILD ہوگا جو آئندہ آپ کے لیے بہت پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔

ہر بچپن کھیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ ہر بچہ کھیلتا ہے جو بچے کھیلتے نہیں وہ بچے نہیں، کھیل کے دوران ان کی ذاتی صلاحیت، جوش، جذبہ، جدّت ساری باتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کی حقیقی مسرّت کا سرچشمہ یہی کھیل ہی تو ہے۔ کھیل کا صلہ خود کھیل ہے۔ اگر کسی بچہ کی شخصیت جاننا چاہتے ہو تو دیکھو کھیل کے میدان میں اس کا برتاؤ کیسا ہے وہ کہاں تک کھیل کے قواعد اور اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ اور کن دھاندلی مچاتا ہے کہاں اپنے مخالف کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کب ضد اور زبردستی پر آجاتا ہے اور کن بہانوں سے جھگڑے نکالتا ہے۔ یا ناراض ہو کر میدان چھوڑ جاتا ہے۔ یا پھر سب باتیں برداشت کر کے اپنی پوزیشن پر ڈٹا رہتا ہے۔ کس حد تک کیپٹن کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ اور مخالف کو شکست دے کر کیسے خوشی میں ناچتا ہے اور

خود ہارنے کے بعد ، اپنی شکست کو برداشت کر تا ہے یا گالیوں پر اتر آتا ہے
-------- کسی نے یہ بات سچ کہی ہے کہ SPORTSMAN SPRIT
کھلاڑی کی آن " دیکھنا ہو تو وہ کھیل میں ہارنے کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کس خندہ پیشانی سے اپنی شکست تسلیم کرتا ہے۔ کھیل کی نیرنگیاں ایسی ہیں کہ کبھی جیتنا ہوتا ہے تو اکثر ہارنا پڑتا ہے۔

ہم میں اکثر ایسے ہیں کہ جنھوں نے صرف جیتنا ہی سیکھا ہے ہارنا نہیں سیکھا " کھلاڑی کی آن " ایسی صفت ہے جو زندگی میں بڑے کام کی چیز ہے۔ کیوں کہ ساری زندگی جیت اور ہار، کامیابی و ناکامی، امید و بیم حسرت و یاس کے ایک طویل سلسلہ کا نام ہے۔

پروفیسر کارل گروس کی رائے ہے کہ وہ بچے کھیلنے میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں جن کہ والدین ان کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں۔ مرغی کا بچہ انڈے کے خول سے باہر آتے ہی دانہ چگنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے جس ذی حیات کی زندگی آئندہ چل کر جس قدر مخلوط، پیچیدہ اور ذمہ دارانہ ہوگی اتنی ہی اس کے بچپن کی مدت طویل ہوگی یہی وجہ ہے کہ انسان کا بچہ برسوں کھیلتا رہتا ہے۔ پروفیسر میگڈوگل کا خیال ہے کہ بچوں میں رشک و رقابت کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کھیلتے ہیں کھیل کی جان یہی مسابقت اور مقابلہ ہے۔

کھیل کی خصوصیات:

کھیل ایک جبلّی فعل ہے۔ ہر بچہ مختلف آزادانہ حرکات کرتا ہے، کودنا، پھاندنا، چیخنا، چلانا ہنسنا اور شور مچانا، گہرے سانس لینا، اور بے تحاشا زبان چلانا، لڑنا جھگڑنا، گالی گلوج کرنا، اپنی ٹیم کے وقار کا خیال رکھنا یہ سب کچھ آپ کھیل کے دوران

دیکھ سکیں گے ۔ کھیل میں جذبہ، جوش اور دلچسپی کے علاوہ یہ ذہنی، جسمانی، حسی اور حرکی عمل بھی ہے ۔ کھیل میں مشاہدہ توجہ، تصور، قوت فیصلہ، استدلال وغیرہ سب بیک وقت استعمال ہوتے ہیں ۔ فٹ بال کے کھلاڑی کو آن واحد میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ فٹ بال کو کس زاویہ سے ٹھوکر لگائے اور گول بنائے ۔ کھیل خود مقصد ہے اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں کھیل آپ اپنا انعام ہے ۔ جو خوشی اور مسرت کھیل سے حاصل ہوتی ہے وہی اس کا حاصل ہے ۔ انسانی فطرت کا اظہار بے روک ٹوک کھیل میں ظاہر ہو جاتا ہے ۔ کھیل میں توجہ اور دلچسپی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کھیل کے دوران ماں کی پکار اور اسکول کی گھنٹی کی آواز بچوں کے کانوں میں نہیں آتی -----

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(غالب)

کھیل اور تعلیم:

بچوں کو صحت مند توانا اور تندرست رہنے کے لیے کھیلنا ضروری ہے کھیل ذہنی اور عقلی تربیت کا ایک اہم ذریعہ ہے ۔ دماغی محنت کے بعد تکان محسوس ہوتی ہے ۔ کھیل کے بعد وہ پھر تازہ دم ہو جاتا ہے ۔

کھیل سماجی تربیت کا اہم ذریعہ ہے ۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تنہا رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔ باہمی رشک و رقابت کے ساتھ ساتھ باہمی تعاون اور امداد کے فوائد سے وہ واقف ہوتا جاتا ہے ۔ وہ ہمہ تن اپنی ٹیم اور اپنے اسکول کی خاطر جانبازی سے کوشش کرتا ہے ۔ دوسروں کے خیالات

وجذبات جس کا دوران کھیل آزادانہ اظہار ہوتا ہے اس سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ اس کے خیالات میں مختلف تجربات کی بدولت درستگی، صحت اور صفائی آجاتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے جو اس کی آئندہ زندگی کا قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اداروں کی ملازمتوں میں اسپورٹس مین کا انتخاب ضرور کیا جاتا ہے

عمر کے مختلف مدارج میں کھیل کی نوعیت بھی بدلتی جاتی ہے ابتدائی عمر میں بچے ایسے کھیلوں میں دلچسپی لیتے ہیں جس سے ان کے حسّی اور حرکی اعصاب کو تقویت ملتی ہے۔ جیسے اشیاء کو ڈھکیلنا آگے بڑھنا۔ اشیاء کو پکڑنے کی کوشش کرنا وغیرہ ---
۳ تا ۶ سال کی عمر میں پانی سے کھیلنا، جھولا جھولنا، گولے اور اسٹکس سے کھیلنا اور نقل کرنا وغیرہ ۶ یا ۱۲ سال کی عمر میں دوڑنا، چھونا، مارنا، اپنی اہمیت وانانیت جتانے کا جذبہ بڑھ جاتا ہے۔ بلکہ اس کی عمر کے بعد اپنی ٹیم کے وقار کا بہت خیال پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے گروپ یا جتھہ سے رقابت کے جذبہ کے ساتھ ساتھ ایثار کا جذبہ ابھرتا ہے ہیروپرستش (HERO WORSHIP) ، اور شخصی وجاہت اور اپنے گروپ سے وفاداری کے جذبات نشوونما پاتے ہیں۔ لڑکیوں کے کھیلوں میں فطرتاً دلچسپی ایسی اشیاء سے ہوتی ہے جو حسن وخوبصورتی کا مظہر ہوتی ہیں۔

کوئی کام جو کھیل کی اسپرٹ کے تحت کیا جائے وہ بہترین آرٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نسل انسانی کی بہترین کوشش جو سائنس، فلسفہ، آرٹ، ادب و صنعت و حرفت کے میدان میں کی گئی ہیں۔ وہ سب کھیل کے جذبہ کے تحت کی گئی ہیں۔ وہ اپنے محبوب مشغلہ میں اس قدر کھو گئے کہ انھیں اپنے ماحول کا خیال نہیں رہا۔

موثر اور کارآمد تعلیم وہی ہے جو کھیل کی اسپرٹ میں دی جائے جہاں پر مقصد کا اظہار نہ ہو بلکہ صرف ذریعہ رہ جائے۔ اسکول ایک جمہوری ادارہ ہے۔ طلبہ کو غیر

محسوس طریقہ پر یہ آزادی ہونی چاہئیے کہ وہ خود دریافت کرنے کی مسرّت سے مستفید ہوں اور انھیں اپنی خودی اور شخصیت کے اظہار کے مواقع ملیں۔

THE SCHOOL IS CONSIDERED A SELF GOVERNING DEMOCRATIC COMMUNITY IN WHICH YOUNG PEOPLE ARE ALLOWED AND ENCOURAGED TO EXPERIMENT WITH LIFE AND TO EXPERIENCE THE JOY OF ADVENTURE AND SELF EXPRESSION AS THEY DO IN PLAY

فروبل کا کنڈرگارٹن، مانٹی سوری سسٹم، اسکوٹنگ، گرل گائیڈ پراجکٹ میتھڈ بہت سی غیر نصابی مصروفیات کھیل کے ذریعہ تعلیم کی اچھی مثالیں ہیں۔

اسکول بیگ

انگریزی زبان کے مشہور ناول نگار کہانی نویس مسٹر آر ۔ کے نارائن بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں ۔ راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے دو سال خاموش تماشائی کی طرح بیٹھنے کے بعد بالاخران کی رگ اظہار کو جنبش ہوئی اور پہلی مرتبہ ۲۵ اپریل ۹۲ء کو معصوم بچون پر کتابوں اور نوٹ بکس کے بوجھ کے خلاف آواز بلند کر کے نہ صرف اراکین راجیہ سبھا بلکہ ملک کے ماہرین تعلیم والدین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کو متوجہ کیا ہے ۔ موصوف کا کہنا تھا کہ پہلی تا دسویں جماعت کے بچوں کو تین تا پانچ چھ کلووزنی کتابیں کا پیاں پیٹھ پر لاد کر لے جانا پڑتا ہے بچوں پر تعلیم کا یہ بوجھ سراسر ظلم ہے ۔

ملک کی آزادی کے بعد سارے ہندوستان میں پہلی مرتبہ کم از کم ایک دانش ور تو ایسا سامنے آیا جس نے بچوں کے ایک خاص مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہو ۔ بچے برسہابرس سے تعلیم کے اس بوجھ کو خاموشی سے اٹھائے چلے جارہے ہیں اس کا اثر یہ ہوا کہ اسکولوں کے پرنسپل و عہدیداران تعلیمات اس بوجھ کو کم کرنے کے لیے چند اقدامات کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں ۔

کوئی بارہ برس قبل دہلی میں ایک فوٹو تصاویر کی نمائش ہوئی تھی فوٹو گرافرس کے لیے مقابلہ کا عنوان تھا " بچے " یہ نمائش بڑی دلچسپ تھی اس تصویری نمائش میں جس کو پہلا انعام ملا تھا وہ ایک دس سالہ لڑکے کی تصویر تھی جو پیچھے سے لی گئی تھی اس کا سر اطراف سے چکنا تھا اور درمیان میں خوبصورت بالوں کی چوٹی (جٹایا جٹو) جس کے آخر میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی ۔ اسکول بیگ کا تسمہ سر پر لگائے اور بیگ پیٹھ پر

اٹھائے بڑی بیزارگی سے اسکول کی جانب قدم اٹھائے جارہا تھا یہ تصویر ہمارے دیہات کے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی بہترین عکاسی کرتی تھی آر۔کے نارائن کی تقریر پڑھتے ہی یہ شاہکار تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔

بعض کا خیال ہے کہ برسوں وزنی بیگ بچپن سے لے کر چلنے سے بچوں کے جسم کا فریم بگڑ جاتا ہے اور کوب نکل آتی ہے یہاں پر ہمیں یہ بات عرض کرنی ہے کہ آج کل وزنی اسکول بیگ اعلی اور معیاری تعلیم کی نشانی ہے۔چنانچہ خانگی۔پبلک اور مشن اسکولس کے طلباء کے بیگ کافی بھاری بھر کم ہوتے ہیں صبح میں جب بچہ اسکول یونیفارم ، بوٹ پاتابے ، ہاتھ میں ٹفن ، کاندھے سے لٹکی ہوئی واٹر باٹل اور سر یا کاندھوں سے لٹکائے ہوئے پیٹھ پر کتابوں کاپیوں کا تھیلا لیے ہوئے نکلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سپاہی محاذ جنگ پر جارہا ہے۔یہ منظر ماں باپ کے لیے بڑا دل خوش کن ہوتا ہے محبت کی اس خوشی میں بچے کی مصیبت کا انھیں احساس نہیں ہوتا۔

بچوں کی مصیبت اور بیزار گی کا منظر دیکھنا ہو تو سر شام دیکھیے جب وہ رکشاؤں یا بسوں میں سفر کر کے گھر پہونچتے ہیں ان کے بال بکھرے ہوئے پوڈر تو کبھی کے صاف ہو چکا ہے چہرے پر تکان اور چڑچڑے پن کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں وہ اس بیگ کے " خچری بوجھ کو فرش یا میز پر پٹک دیتے ہیں۔ٹفن۔واٹر باٹل۔یونیفارم جوتے پاتابے سارے گھر میں بکھرے ہوئے نظر آئیں گے ماں کو اس زلزلے کا احساس پہلے ہی سے ہوتا ہے۔یہ تو روز کا ہی قصہ ہے۔وہ ہدایت پر ہدایات نشر کرتی جاتی ہیں لیکن کوئی اس کی نہیں سنتا۔جب تک اس بکھرے ہوئے انبار کو یک جا کر کے رکھا نہیں جاتا دوسرے دن بچے اسکول کے لیے وقت پر روانہ نہیں ہوسکتے۔

وزنی اسکول بیگ کا مسئلہ بڑے شہروں کے خانگی اور پبلک اسکولوں کے طلباء کا ہے شہر کے غریب محلوں قصبات اور دیہات کے ہزاروں سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے طلباء کے مسئلہ کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے لاکھوں بچے ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں یہاں پر بیگ وزنی نہیں بلکہ ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ اکثر تو اس بیگ ہی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب شہر کے کسی سرکاری اسکول میں چلے جائیں اور کسی کلاس کو دیکھ لیں تو معلوم ہوگا کہ آدھی جماعت کے پاس کوئی نصابی کتاب ہی نہیں ہے آدھی کلاس کے پاس کوئی نوٹ بک نہیں اور کچھ ایسے بھی بیٹھے ہوئے ہیں جن کے پاس نہ تو کوئی کتاب کاپی یا پنسل ہی ہے جب یہ اسکول چلے تھے تو خالی تھے اور جب واپس ہوئے تو ان کے دماغ پر بھی تعلیم کا کوئی بوجھ نہیں۔

اپنے بچپن کی بات ہے کہ مہتم تعلیمات نے اپنے ہاتھوں سے انعام میں دو تاو کاغذ ایک پتی قلم اور ایک چھوٹی سی شیشہ کی سیاہی دوات دی تھی اس انعام کی کل مالیت دو آنے حالی تھی اس انعام پر سارے خاندان والے واہ واہ کر رہے تھے اور لڑکا خوشی میں پاگل ہوا جارہا تھا۔

ہمارے اسکول کا اصل مسئلہ بچوں کے وزنی بیگ کا نہیں بلکہ اس ہلکے پھلکے بیگ کا ہے کہ کس طرح کتابوں کاپیوں سے اس کا وزن بڑھایا جائے سستی تعلیم غیر معیاری ہوتی ہے اچھی اور خصوصی تعلیم ہمیشہ مہنگی ہوتی ہے خوشی ہوتی ہے کہ مسٹر آر۔ کے۔ نارائن یا پھر کوئی دانش ور یا ماہر تعلیم نے اسکول کے وزنی بیگ کے ساتھ " مالگدی " جیسے دیہات کے ان غریب طلبا کے بیگ کا بھی تذکرہ کیا ہوتا جن کی تعداد ملک میں لاکھوں نہیں کروڑوں تک پہنچتی ہے۔

گھر کا ماحول اور تعلیم

بہت عرصہ پہلے ایک ضلع کے مستقر پر لائبریری ویک منایا گیا جس میں کلکٹر اور ضلع کے عہدیدار اور وکلاء شریک تھے۔ احقر کو بھی کچھ کہنے کا موقع ملا میں نے بتلایا کہ وہ بچہ بڑا ہی بد قسمت ہے جو اپنے گھر میں کوئی کتاب رسالہ یا اخبار برسوں میں بھی دیکھ نہیں پاتا۔ اسی زمانے میں ضلع پریشد کے چیرمین نے ایک خوبصورت عالیشان مکان تعمیر کروایا تھا لیکن وہاں پر کوئی ایک الماری کتابوں کی نہیں تھی۔ اس گھر میں کالیداس شکسپیر، ٹیگور، غالب اور اقبال کا کہیں گذر نہیں تھا حالانکہ یہ سب اور بہت سی ایسی شاہکار کتابیں ہیں جو ہمارے تہذیب و تمدن کے ہزاروں میل کے سفر کو چند برسوں میں مختصر کر دیا جو بچے ان گھروں میں بڑے ہوتے ہیں وہ اپنے تہذیبی ورثہ اور مشاہیر کے شاندار علمی کارناموں سے بے خبر رہ جاتے ہیں۔

جس گھر کے بڑے اکثر فلمی رسالے جاسوسی ناول اور ادنی قسم کا لٹریچر پڑھتے ہیں وہی بچوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ بعض طلباء ان رسالوں کو چھپا کر اپنے ساتھ اسکول لاتے ہیں۔ کلاس روم میں آٹھ دس طلباء ان رسالوں کی تصاویر دیکھنے میں مصروف رہتے ہیں گھنٹہ ختم ہو جاتا ہے۔ جو سبق پڑھایا گیا وہ ان کے سروں پر سے گذر گیا گاندھی جی نے لکھا ہے کہ فحش لٹریچر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب اس کا چسکا لگ گیا تو پڑھنے والا فحش سے فحش ترین لٹریچر کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے علم میں ایک بزرگ ایسے بھی ہیں جو روزانہ کسی پان شاپ سے جاسوسی ناول کرایہ پر لاکر پڑھتے ہیں جب تک وہ جاسوسی پنجہ ختم نہ ہو جاتا انہیں چین نہیں آتا یہاں تک کہ باتھ روم میں بھی وہ کتاب ان کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔

اس شوق کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا ان کے بچے بڑے ہو گئے گھر کے ماحول کی مجرمانہ فضا کا اثر ان کے اخلاق و آداب پر پڑے بغیر نہیں رہا۔ اونچی کرسیوں تک پہنچ جانے کے بعد بھی ان کے قول وہ فعل سے یہ ساتے برے اثرات آج بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

جس گھر کا ماحول پڑھے لکھے لوگوں کا ہوتا ہے وہاں پر بچوں کے اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کا انداز مختلف ہوتا ہے وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کے مطابق ترقی کرتے ہیں۔ کسی اونچی ملازمت کے لئے جب یہ انٹرویو کے لئے آتے ہیں تو ان کے اچھے خاندان اور ماحول کے اثرات صاف ظاہر ہوتے ہیں جاہل خاندان کے امیدواروں کو پہچان لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ دستور ہند میں پسماندہ طبقات اور شیڈولڈ کاسٹ کو اگر تحفظات نہ دیئے جاتے تو آئی اے ایس میں ہر سال ان طبقات کے شاید ایک دو افراد ہی منتخب ہو سکتے جبکہ ہر سال ایک سو پچاس سے زائید امیدواروں کی کھیپ منتخب ہو جاتی ہے۔

گھر کے ماحول میں پڑھنے کے لئے بچوں کے واسطے علحدہ کمرے میز کرسی روشنی اور ہوا پر سکون فضاء کی سخت ضرورت ہے۔ ان خاندانوں کے بچے جو تنگ تاریک گھروں میں یا صرف ایک ہی کمرے میں رہنے کے لیے مجبور ہیں ان کی ترقی کا ریکارڈ کبھی شاندار نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس ماحول سے بھی کبھی کبھی کوئی ایک ذہین طالب علم کسی طرح اوپر آجاتا ہے لیکن ایسے حادثات شاذ و نادر ہیں۔ ایسے ذہین طالب علم دوسروں کے مقابلے میں احساس کمتری میں بتلا رہتے ہیں اونچے مقام پر پہونچنے کے لئے اندرونی شدید جذبہ، حوصلہ اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے گھر کے ماحول نے انہیں پہلے ہی چھوٹا بنادیا ہے تو وہ خود اپنے کو کب بڑا بنا سکتے ہیں۔

احساس کمتری کی دوسری شکل یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کامیابیوں کی داستانیں وقت بے وقت بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں ۔ ٹی وی تو ہے اسٹار ٹی وی عام ہونے کے لئے کیا دیر ہے ۔ پروگرام صبح سے رات کے ۱۲ بجے تک چلتے ہی رہتے ہیں اس گھر کے بچے صبح سے شام اس باکس کے سامنے سے ٹلتے ہی نہیں ۔ انہیں پڑھنے لکھنے اور ہوم ورک کے لئے وقت کہاں ملے گا ۔ پست معیار کے گانے ڈائیلاگ مار دھاڑ ڈسکو ڈانس نے گھر کے ماحول کو تباہ کر کے رکھدیا ہے ۔ ٹی وی پروگرام ختم بھی ہو جائے اس ڈرامے کے اچھے یا برے اثرات تادیر قائم رہتے ہیں ۔ ایسے میں پڑھنے کا موڈ آجانا کوئی کرشمہ ہی ہو سکتا ہے ایک سال تک اس ماحول میں رہنے کے بعد کسی طالب علم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کامیابی سے سرفراز ہو گا ۔ خود فریبی کی مثال ہے ۔ آخر اس ماحول کے ذمہ دار کون ہیں ۔ خود والدین کو بغیر ٹی وی اور ویڈیو کیسٹ کے چین نہیں آتا بلکہ انہیں اس کے بغیر گھر ویران نظر آتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ٹی وی کے بعض اچھے پروگرام نہ صرف ضروری ہیں بلکہ ان کے عام معلومات اور خود اعتمادی کے لیے بہت کار آمد ہیں سیہاں صرف پروگرامس کو کنٹرول کرنیکا سوال ہے ۔

گھر کی خوشحالی ماں باپ کی طرز زندگی اور بچوں کے ساتھ سلوک کا بھی بچوں کی تعلیم و تربیت پر گہرا اثر پڑتا ہے جس گھر کا ماحول خوشگوار ہو ماں باپ میں موانست ہے اور ایک دوسرے کی راحت کا خیال رکھتے ہیں وہ بچے سچ مچ خوش نصیب ہیں اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ خاندان دولت مند بھی ہو ، وہ بچے بڑی مصیبت میں ہیں جہاں پر ماں باپ آئے دن آپس میں جھگڑتے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع سے نوازتے رہتے ہیں ۔ جہاں پر دونوں کا غصہ چڑھ گیا بس گھر کے ماحول میں زلزلہ ہی آگیا اس ماحول میں بچے کیا خاک پڑھیں گے ۔ بعض گھر ایسے بھی ہیں جہاں پر

نہ تو غصہ ہے نہ تو زلزلہ کے آثار ہیں ۔لیکن سارا گھر خاموش ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر کی فضاء کو سانپ سونگھ گیا ہے ۔یہ ایک پوشیدہ راز ہے اسکو TENSION تناؤ کہتے ہیں ہر ایک اپنی جگہ خاموش ہے ۔ابا جان کا مزاج ہی ایسا ہے کہ سب دم سادھے بیٹھے ہوئے ہیں سکتہ کا عالم بھی پڑھنے لکھنے کے لے مناسب نہیں جو بچے مسلسل اس ماحول میں رہتے ہیں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے باوجود شدید احساس کمتری کے کرب میں مبتلا رہتے ہیں ۔ان کے دل و دماغ پر دن رات تناؤ کی سی کیفیت رہتی ہے ۔ایسے گھر کے ماحول سے خدا کی پناہ

بعض والدین کو بچوں کو نصیحتیں کرنے کا شوق مرض کی حد تک ترقی کر جاتا ہے ۔اس کے منفی اثرات بچوں کی تعلیم پر ہوتے ہیں ۔بعض والدین بات بات پر مار دھاڑ پر اتر آتے ہیں غصہ بری بلا ہے بچے ہمیشہ سہمے رہتے ہیں ان کی شخصیت کی نشو ونما ٹھٹر کر رہ جاتی ہے یہ کسی انٹرویو کا سامنا نہیں کر پاتے ۔

یہ مضمون جتنا آسان اور عام نظر آتا ہے اتنا ہی زیادہ اہم اور عالی شان ہے افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں اپنے دوستوں رشتہ داروں اور دوسرے مسائل سے بہت دلچسپی ہے ۔لیکن خود اپنے گھر کے ماحول سے بے خبر ہیں ۔کیا آپ کے لئے ممکن نہیں کہ اپنے بچوں کے لیے ماحول دے سکیں تا کہ ان کی شخصیت میں نکھار آئے اور وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکیں ۔

مسلمان اور تعلیمی منصوبہ بندی

آدمی کا صحت مند رہنا اس لیئے ضروری ہے کہ وہ اپنا بوجھ خود اپنے پیروں پر لاد کر لے جاسکے جب وہ بیمار پڑجاتا ہے تو دوسروں پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ خود چل پھر نہیں سکتا دوسروں کو سہارا دینا پڑتا ہے۔ اس طرح آدمی کا صحت مند رہنا نہ صرف گھر والوں کے لئے پریشانی سے دور رکھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ حکومت کو اس کے علاج معالجہ کے لیے قومی آمدنی سے روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال اس ان پڑھ اور ناخواندہ کا ہے جو نہ صرف اپنا نقصان کرلیتا ہے بلکہ خاندان، قوم و ملت کے لیے بھی مسئلہ بن جاتا ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد سے ہندوستانی مسلمان چار اہم مسائل سے دوچار ہیں معاشی پسماندگی، تعلیمی پسماندگی، مذہبی وثقافتی شناخت کی حفاظت اور برقراری چوتھے جمہوری حکومت میں مسلمانوں کی غیر متناسب نمائندگی۔ ان سب مسایل کے حل کا جذبہ عام طور پر پایا جاتا ہے لیکن مسایل اور بھی پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ ان سب میں اہم ترین بنیادی مسئلہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی ہے کیوں کہ یہ وہ شاہ کلید ہے جو ہر مسئلہ کے حل کے لیے کافی ہے جب تک مسلمانوں میں تعلیم عام نہ ہو نہ وہ غربت کے شکنجے سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنی زبان، مذہب اور ثقافت کی حفاظت کرسکتے ہیں اور نہ وہ جمہوری حکومت میں کسی حساب کتاب میں آسکتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنی سوانح حیات میں کوئی ساٹھ برس پہلے ہی لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ عام تعلیم سے دوری ہے۔ سرسیدؒ کی علی گڈھ تعلیمی تحریک شروع ہوئے ایک سو برس سے زائد ہوگئے لیکن مسلمانوں میں عام تعلیم کافی صد ۲۵

سے بڑھ نہ سکا اگر ہم اس حقیقت کو حسابی زبان میں وقت اور فاصلے کے لحاظ سے جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے سو برس میں تعلیم کے میدان میں صرف ۲۵ کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا ہے۔ باقی فاصلہ طے کرنے کے لیے اس رفتار سے مزید تین سو برس لگیں گے۔ یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ اس مسئلہ سے ہمارے سیاسی لیڈر، مذہبی رہنما اور دانش ور لاعلم ہیں۔ وہ اس مسئلہ سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن آج تک نہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے اور نہ کوئی عملی قدم اٹھایا گیا ۔اس صورت حال کی چند وجوہات سمجھ میں آتی ہیں:۔ (۱) ایک زمانے سے ہمارا سماج ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پڑھنا لکھنا، خود بچے کی انفرادی ذمّہ داری ہے۔ اگر کوئی بچہ پڑھ لکھ لیتا ہے تو خود اس کا ذاتی ذوق و شوق ہے یا پھر والدین کی توجہ کا سبب ہو سکتا ہے۔ یہ انفرادی ذمہ داری اس بچے پر ہے جو خود اپنی ذمہ داری سمجھنے کے قابل نہیں ہے۔ افسوس ہے ماں باپ اس روایتی غلط فہمی سے نکلتے نہیں اور بچہ کا مستقبل تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

(۲) اس کام کا پھیلاؤ وسیع اور دیرپا ہے۔ تعلیم میں جو وقت، پیسہ اور محنت صرف ہوتی ہے اس کے نتائج بہت دیر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ایک طویل مدتی کام ہے جو دس تا پندرہ برس پر پھیلا ہوا ہوتا ہے ایسا کام مسلمانوں کے جذباتی مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کام برائے نام ہو اور جلد اپنا نام ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عام تعلیم (جنرل ایجوکیشن) کے پروگرام کا تذکرہ آپ نہ تو کسی ایجوکیشن سوسائٹی، مذہبی جماعت یا سیاسی جماعت کے دستور یا منشور میں پائیں گے اور اگر کہیں ہے بھی تو وہ برائے نام ہوگا۔

رسول اکرمؐ کی دور اندیشی

جنگ بدر میں اہل مکہ کے جو لوگ گرفتار ہو کر جنگی قیدیوں کی حیثیت سے سامنے لائے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آزادی کی ایک شرط یہ رکھی کہ جو پڑھا لکھا ہو وہ دس صحابیوں کو پڑھنا لکھنا سکھادے یہ پڑھانے والے مسلمان نہیں کافر تھے اور پڑھنے والے معمولی مسلمان نہیں صحابہ کرامؓ تھے اور اس کی اہمیت کو جاننے والے خود رسول کریمؐ تھے جو خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے مگر عام بنیادی تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ بعد میں ان صحابہ کرامؓ کی وجہ سے مدینہ میں تعلیم عام ہوئی۔ قرآن حکیم کی آیات کو لکھ لینا اور احادیث نبوی کے لفظ لفظ کو محفوظ کر لینا اسی کے بعد آسان ہو سکا۔

منصوبہ بندی کا عام مفہوم:۔

عام طور پر منصوبہ بندی کے چار مراحل ہوتے ہیں مقصد کا تعین جس کے لیے نقشے اور پلان بنانا ہے۔ دوسرے مرحلے پر ضروری وسایل اور سرمایہ مہیا کرنا، تیسرے مرحلے پر اصل کام شروع کرنا جس میں سارے عوامل ایک ساتھ حرکت میں آجاتے ہیں اور جب منصوبہ مکمل ہوجائے تو یہ جانچ پڑتال کرنا کہ آیا منصوبہ کے مطابق وقت پر کام ہوا ہے۔ یہ جانچ اس لیے ضروری ہے کہ آئندہ کام کرنے میں آسانیاں پیدا ہوں۔

تعلیمی منصوبہ بندی کی ضرورت:۔

ہمیں جس منصوبہ کا خاکہ پیش کرنا ہے وہ " جنرل ایجوکیشن " پرائمری تا سیکنڈری ایجوکیشن سے متعلق ہے۔ دستور ہند کی دفعہ ۴۵ کے تحت اس کو " لازمی جبری تعلیم " کا نام دیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ۶ تا ۱۴ سال کی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کو مفت ابتدائی تعلیم دیں تاکہ وہ ۱۴ سال کی عمر تک ساتویں جماعت

کامیاب کرلیں ۔ گو یہ بات دستور ہند میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری بتلائی گئی ہے لیکن اب تک دو تین مرتبہ حکومت کو ناکامی ہو چکی ہے ۔ اب نیا ٹارگٹ ۱۹۹۵ء رکھا گیا ہے ۔ لیکن یہ بھی ناکام ہو جائے گا۔

یہاں ایک بات کہنے کی یہ ہے اگر ہم اپنے تعلیمی منصوبہ بندی کے پروگرام پر عمل کریں تو دستور ہند کی لازمی جبری تعلیم کی ایک اہم دفعہ کا مقصد پورا کرنے میں مسلمان بحیثیت قوم اپنا حصہ ادا کر سکیں گے ۔ (۲) ملک میں عام تعلیم کا اوسط ۳۷ فی صد ہے اور مسلمانوں کا ۱۵ فی صد کے لگ بھگ ہے ۔ مسلم عورتوں میں تعلیم کا فی صد برائے نام ہی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سو میں ۸۵ آدمی پڑھے لکھے نہیں ہیں ۔ ان پڑھے لکھے افراد میں غالب اکثریت ایسی ہے جن کی تعلیم چوتھی پانچویں جماعت تک ہوتی ہے یا پھر حرف شناس ہیں یا جو شد بد پڑھنا لکھنا جانتے ہیں ۔ (۳) اکثر شہروں میں مسلم ایجوکیشن سوسائٹیز کی جانب سے کھولے گئے پیشہ وارانہ کالجوں میں اب یہ شکایت عام ہو چکی ہے کہ حکومت کی جانب سے منظور شدہ نشستوں میں پچاس فی صد بھی مسلم امیدوار دستیاب نہیں ہوتے یہی حال جامعہ ہمدرد کے بعض کورسس کا ہے ۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک جگہ پر ۲۰ نشستوں میں صرف ایک مسلم امیدوار شریک ہو سکا۔

اس کا سبب عام طور پر یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ مسلم طلبہ میں مسابقت کا جذبہ نہیں ، ان کا معیار تعلیم پست ہے ، طلبہ کو زیادہ فکر باہر جانے کی رہتی ہے عام بے حسی وغیرہ ، بے شک یہ تمام باتیں کسی حد تک صحیح ہیں لیکن ۹۰ فی صدی اصلی سبب ہماری پرائمری اور سکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے لاپرواہی اور بے حسی ہے ۔ جب تک بنیادی پرائمری اور سکنڈری تعلیم کا پھیلاؤ وسیع نہ ہوگا، "تعلیمی اہرام" کبھی

بلند نہیں ہوسکتا۔ (۴) ہندوستان کے مزاج کے مطابق جمہوریت اور سیکولرزم یہ دونوں ایسی نعمتیں ہیں کہ مسلمان پوری طرح ان سے استفادہ کرنے کے قابل نہیں اصل وجہ تعلیم سے محرومی ہے۔ جمہوریت ایسا نظام حکومت ہے جس میں سب شہریوں کو اپنا حق پانے، اپنا حق منوانے، اپنا حق لینے کا حق ہے مگر اس کے لیے تعلیم اہم شرط ہے۔

تعلیمی منصوبہ بندی کے اہم خدوخال:۔

یہ پہلا پنج سالہ منصوبہ جنرل ایجوکیشن ساتویں جماعت تک تعلیم دلوانے کے پروگرام سے متعلق ہوگا۔ دس سال تک ہماری توجہ اسی ایک بنیادی مقصد پر مرکوز رہے تو اچھا ہے۔ البتہ خود طلبہ اور والدین میٹرک تک طلبہ کو لے جانا چاہیں گے جب انھیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوجائے گا۔

اس کام کے لیے منڈل، سمیتی، تعلقہ، ضلع اور ریاستی سطح پر جنرل ایجوکیشن کمیٹیاں قائم کی جاسکتی ہیں چوں کہ تعلیم کا کام سب ہی کا ہے اس لیے مقامی، سماجی، سیاسی، مذہبی، ادبی انجمنوں کے کارکن آگے آسکتے ہیں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ بڑے شہروں میں محلہ واری اور چھوٹے قصبات میں پوری آبادی کا گھر گھر جاکر ایسے بچوں کے نام رجسٹر کرلیں جو کسی اسکول میں نہیں پڑھتے یہ کام ایک مرتبہ کرلیں تو پھر یہی اعداد و شمار ۵ برس تک کام آسکتے ہیں۔ یہ کمیٹی کوشش کرے کہ ان بچوں کو جن کی عمریں ۵، ۶ سال ہوچکی ہیں کسی نہ کسی سرکاری مدرسے یا پھر خانگی مکتب میں شریک کروادیں۔ اس کے لیے والدین کو بھی سمجھانا بجھانا ہوگا۔ جب بچے شریک ہوجائیں تو "ڈراپ اوٹ" کو روکنے کے لیے ان پر مسلسل نگرانی کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ مسلم طلبہ اگر ۱۰۰ پہلی جماعت میں داخلہ لیں تو میٹرک تک پہنچنے تک صرف دس رہ

جاتے ہیں۔ باقی درمیان ہی سے غائب ہو جاتے ہیں اس کمیٹی کا کام یہ بھی ہو کہ مقامی جمع شدہ سرمائے سے غریب طلبہ کی مدد کرے۔ شہر میں ایسے بہت سے ادارے ہیں جو ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

فوائد:۔

ایسے مقامی افراد جنھیں اس کام سے دلچسپی ہوگی، ان کا تعلق گھر گھر سے ہو جائے گا۔ جو مواد جمع کیا جائے گا، وہ مردم شماری، مادری زبان، پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط اور ان غریب لوگوں کے مسایل سے واقفیت پیدا ہو جائیگی جن کی یہ کمیٹی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اگر پانچ سال یہ کام مسلسل جاری رہے تو اس مقام یا قصبہ کی آبادی میں کوئی بچہ بغیر ابتدائی تعلیم کے نہ رہ جائے گا۔

اس اسکیم کی خوبی یہ ہے کہ یہ کام کسی سطح پر شروع کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی ریاستی مرکزی تنظیم اس کام کو سنجیدگی سے شروع کرے اور چھوٹے بڑے مقامات پر اس قسم کی جنرل ایجوکیشن کمیٹیاں قائم کرے تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ اس کام کو شروع کرنے کے لیے آپ کو کسی سمینار، سمپوزیم یا کانفرنس کے رزولیوشین کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس دو روپے کا رجسٹر خرید لیجیے، اٹھ کھڑے ہو جاؤ، دیکھیے کام شروع ہو گیا۔

"بے شک یہ پہلا قدم ہی بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔"

(مولانا آزاد)

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

(حالی)

آپ شاید اس راز سے واقف نہیں کہ بھلائی کے چھوٹے کام سے بھی آدمی کتنا بڑا ہو جاتا ہے اور پھر یہ کام ایسا ہے جو ہر قسم کے سیاسی، مذہبی، سماجی، معاشی، معاشرتی دنیوی، دینی کام کے لیے بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ کام آج بھی نہ ہوا پھر ملّت کی قسمت میں حرماں نصیبی کے سوا کچھ اور نہیں۔

سوشیل سرویس

(اہمیت وافادیت)

سال ۱۹۸۳ء کی بات ہے کہ آندھرا پردیش میں پہلی مرتبہ تلگو دیشم پارٹی کی حکومت قائم ہوئی ۔اس کے چیف منسٹر، ین ، ٹی ، راماراؤ نے کچھ ہی دنوں میں اعلان کیا کہ ریاست کی ایسی بیواؤں کو جن کی عمر پچاس برس سے زائد ہو اور بے سہارا رہ گئی ہوں انھیں حکومت کی جانب سے پچاس روپے ماہانہ وظیفہ تاحیات منظور کیا جائے گا ۔یہ ایک غیر اہم خبر اخبار "سیاست" کے کسی کونے میں شائع ہوئی تھی ۔ایک غریب بیوہ اپنے مکان آتی جاتی تھی میں نے اس سے کہا کہ دیکھو تمہاری قسمت چمک گئی ۔چیف منسٹر نے اعلان کیا ہے کہ بیواؤں کو ماہانہ پچاس روپے، تاحیات وظیفہ ملے گا ۔بس اتنا کام کرو کہ ناملی اسٹیشن روڈ پر کلکٹر آفس ہے ۔وہاں پر فارم ملے گا ۔یہ تلگو میں ہوگا ۔اس فارم کی خانہ پوری کر کے کسی گزیٹیڈ افسر کی تصدیق اور اپنی فوٹو کے ساتھ ایک مہینہ کے اندر اندر اسی آفس میں داخل کر دو ۔پھر کیا ہے مزہ ہی مزہ ہے ۔میری اس ساری تقریر کا اس بوڑھی بیوہ پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا اور نہ اس نے کسی مسرت کا اظہار کیا ۔بلکہ حسرت سے ایک سرد آہ بھری اور یوں کہنے لگی ۔

س ۔یہ فارم کہاں سے لانا ہوگا ۔

ج ۔بس یہیں تو کلکٹریٹ آفس ہے ۔وہاں چلے جاو، فارم مل جائے گا ۔

س ۔آنے جانے کے لے کم از کم رکشا کے لیے دو تین روپے ہوں گے ۔وہ کہاں سے لاؤں ۔

ج ۔ چلو میں دیدوں گا۔ تم لوگوں کو تو بہانہ چاہیے ۔

س ۔ اچھا تو وہاں افسر سے ہمیں کون بات کرنے دے گا۔ پہلے تو اندر ہی جانے نہ دے گا۔

ج ۔ دیکھو دفتر میں یوں ہی کام نہیں بنتا۔ وہاں کے اٹنڈر کو آٹھ آنہ روپیہ دیدینا

س ۔ یہ فارم کون بھرے گا۔ کون افسر ہمارے لیے تصدیق کرے گا۔ وہ بڑا افسر کہاں رہتا ہے۔

ج ۔ بس بس تم لوگ اپنے سے کچھ حرکت ہی کرنا نہیں چاہتے۔

ج ۔ ہاں ہماری قسمت ہی کچھ ایسی ہے ۔ سرکار کیا دیتی ہے، کس کو دیتی ہے اور کتنا دیتی ہے، ہم لوگ بھی سنتے ہیں لیکن کون خدا کا بندہ ایسا ہے جو ہماری فریاد سنتا ہے ۔ کون ہماری مدد کرتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

یہ بڑھیا چلی گئی ۔ اس کو وظیفہ کی اطلاع دے کر پہلے تو کچھ ایسا محسوس کیا کہ میں نے اس پر بڑا احسان کیا ہے ۔ جب اس کی حسرت آگیں باتیں سنیں تو شرم آئی کہ ہم صوفوں پر بیٹھ کر بہت سی باتیں کرتے ہیں اور ایسا ہونا چاہیے وہ ہونا چاہیئے ۔ جہاں کہیں آپ سنیں گے سب کی تان "چاہیئے" پر آکر ٹوٹ جاتی ہے ۔ دل میں خیال آیا کہ بس یہی دو ٹکے کا کام کر کے بتلادو تو معلوم ہو گا کہ غریب اور حکومت کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہے ۔ اپنے محلّے میں اور بھی چھ سات بیواؤں کا پتہ چلا ۔ کلکٹر آفس سے فارم لائے گئے اور ضروری تکمیل کے بعد داخل کر دیے گئے ۔ کوئی چھ ماہ گزر گیے ایک دن وہی بیوہ چھوٹا سا پیکٹ مٹھائی کا لے کر حاضر ہوئی ۔ اسے تین ماہ کا وظیفہ ڈیڑھ سو روپے ذریعہ منی آرڈر اسی روز مل چکا تھا ۔ معلوم ہوا کہ اور بھی تین بیواؤں کو یہ وظیفہ منظور ہوا ۔

ریاست بھر میں ہزاروں بیوائیں ایسی ضرور ہوں گی جنھیں آج تک بھی یہ پتہ نہ ہوگا کہ حکومت نے کبھی ایسا اعلان بھی کیا تھا۔ سینکڑوں پڑھے لکھے لوگوں نے سرسری طور پر اس خبر کو دیکھا ہوگا لیکن کبھی انھیں یہ خیال نہیں آیا کہ محلہ کی کم از کم ایک بیوہ کے لیے کچھ مدد کر دیں۔اسی بات کا تذکرہ ایک بزرگ کے سامنے آیا جو ایک مذہبی جماعت کے سرگرم کارکن ہیں اور جن کے پاس سوشیل سروس کا ایک مستقل شعبہ بھی ہے۔کہنے لگے دراصل یہ کام ہمارے ہی کرنے کا تھا افسوس کہ وقت گزر گیا

اسی زمانہ میں یہ راقم گورنمنٹ سرویس سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔سامنے وقت ہی وقت تھا۔اب مشورے ہونے لگے کہ بندہ کو کیا کرنا چاہیے۔ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق رائے دی۔راشن شاپ کھولنے سے لے کر لیڈری تک۔ایک قابل احترام بزرگ نے ایک ایسا مشورہ دیا جنھوں نے ساری زندگی ایسا کوئی کام بھول کر بھی نہ کیا تھا" کچھ سوشیل سروس کیجیے" میں نے عرض کیا"آپ ہی تبلائیے کونسا کام اچھا رہے گا" کہنے لگے " بیگار کے کام بہت مل جاتے ہیں"۔

محلّہ بازارگارڈ میں ایک سلم ایریا SLUM AREA تھا جس کا آسان ترجمہ " گندی بستی ہے" جو شہروں میں ایسے محلوں کے لیے مخصوص ہے جو شہر کی عالی شان خوبصورت عمارتوں کے بیچوں بیچ غریبوں کی جھونپڑیوں کے جزیرے ہیں۔جن کی گندگی کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کبھی چند منٹوں کے لیے اس بستی سے گزرے ہوں بلدیہ کے اربن کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں یہ بستی دس برس سے منظورہ پلان میں تھی کہ اگر یہ لوگ اپنا مکان پکا بنالینا چاہیں تو سرکار سے سات ہزار روپے بطور قرض منظور کیے جائیں گے کچھ بلدیہ کے افسر اور اس آبادی کے لوگ بھی میرے پاس آئے کہ انہیں کچھ وقت دیجئے۔یہ ۲۶ خاندان تھے اور ان جھونپڑیوں میں کوئی دو سو

افراد بستے تھے ۔ اس پروجکٹ کی مشکلات کا کچھ اندازہ نہ تھا بے خطر اس سوشیل سرویس میں کود پڑا بلدیہ سے ایک لاکھ بیاسی ہزار روپے دو برس کی مدت میں دس اقساط میں سینکڑوں چکر لگانے کے بعد ملے ۔ پھر یہ اندازہ ہوا کہ یہ رقم بالکل ناکافی ہے کوئی ساٹھ ہزار کی رقم چندہ کے ذریعہ جمع کی گئی ۔ یہ کام تو اور بھی مشکل ہے " جان حاضر ہے مگر چندہ کس کے پاس ہے " ۔ بہر حال دو سال کی مدت میں ۲۶ مکانات بن گیے ۔ اب اس کا نام " ولی کالونی " ہے ۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے یونیورسٹی طلباء سے خطاب کرتے ہوئے بڑے کام کی بات بتلائی ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے ۔ جہاں سوشیل سرویس کے ذریعہ غریب مخلوق کی خدمت کے کئی مواقع ہیں ۔ اپنی طبیعت ، ذوق ، وجدان کے مطابق زندگی میں کسی نہ کسی کام کو لے لو اس لیے کہ مخلوق کی خدمت اعلیٰ ترین عبادت ہے ۔ اگر تم جرمنی یا انگلستان چلے جاؤ اور وہاں کچھ سوشیل سرویس کرنا بھی چاہو تو وہاں کوئی موقع نہیں ملے گا ۔ وہاں پر فلاحی حکومتیں ہیں اور آپ کی مہربانیوں کی ضرورت نہ ہوگی ۔ ہندوستان میں آبادی کی کثرت غربت اور جہالت کی وجہ ملک کے ہر شہر اور ہر بستی میں ایسے کئی مواقع ہیں جہاں پر آپ اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ خدمت کر سکتے ہیں ۔

کوئی پندرہ برس سے امریکہ میں چند ماہرین اس بات کی ریسرچ میں لگے ہوئے ہیں کہ " وہ کیا راز ہے کہ سوشیل سرویس میں مشغول لوگوں کی صحت نسبتاً بہتر ہوتی ہے ، ان کی عمریں طویل ہوتی ہیں ۔ اور شرح اموات بھی کم ہے مشی گن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے ۱۴ برس تک ۲۷۰۰ افراد پر اپنی ریسرچ جاری رکھی اور بتلایا کہ ایسے لوگ جو کسی سوشیل سرویس کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے ان میں شرح اموات

دوسروں کے مقابلہ میں ڈھائی گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ہان سیلی HAN SALLY۔ جو اس ریسرچ کا ہراول ہے لکھتا ہے کہ دوسروں کے کام آنے سے لوگوں کی مشکور نظریں اور احسان مندی کے سچے الفاظ دماغ کے ان خلیوں کو تازگی بخشتے ہیں جن کا تعلق راحت و مسرت سے وابستہ ہے جو زندگی اور صحت کے لیے معاون ہیں۔اسی طرح ماہرین امراض قلب کا کہنا ہے کہ "دل جلا" ANGRY HEART بہت زیادہ امراض قلب میں گرفتار رہتا ہے۔دل کی شریانوں پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ان میں حرکت قلب بند ہو جانے کے زیادہ امکانات پائے گئے ہیں۔(ریڈرس ڈائجسٹ ڈسمبر ۱۹۹۰ء)

عیسائی مشنریز میں خلق خدا کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کا ایک سلسلہ ہے نوبل انعام یافتہ مدر ٹیسا کی مثال سامنے ہے۔ہزاروں بے سہارا بچوں، غریب ولاچار لوگوں یتیموں اور بے سہارا عورتوں کے لیے یہ رحمت کا فرشتہ بنی ہوئی ہے۔کروڑوں کی رقم ساری دنیا کے دولت مند اور درد مند "مدر" کے نام پر بھیجتے رہتے ہیں جن کی کوئی رسید نہیں دی جاتی۔ساری دنیا کے لوگوں نے کوئی پچاس ساٹھ برس سے اس کے کام کو پرکھا ہے دیکھا ہے اور سمجھا ہے کہ یہ خالص سونا ہے۔

ایک اور نادر مثال پاکستان کے عبدالستار ایدھی کی انگریزی اخباروں کے ذریعہ پڑھنے میں آئی۔ساری دنیا میں اس ایک شخص کے کام کی دھوم ہے سوچو تو حیرت ہوتی ہے کہ اس ایک شخص نے کیا کیا کام کر دکھایا ہے ۲۲ سال کی عمر میں تقسیم ہند کے وقت یہ گجراتی مسلمان پاکستان آیا۔اب اس کی عمر ۶۲ سال ہے "ایدھی ویلفر سنٹر" میں اس وقت ایک ہوائی جہاز آٹھ ہیلی کوپٹرس، چار سو امبولینس کاریں ہیں جو

دن رات غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کے لیے سارے ملک میں دوڑتے رہتے ہیں۔ اس سنٹر میں کوئی ۳۰ ہزار مریضوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ ۱۳ دواخانوں میں پانچ ہزار سے زیادہ مریض شریک ہیں ان کی دیکھ بھال کے لیے تین ہزار ڈاکٹر نرسس اور دوسرے لوگ مشغول ہیں۔ ایدھی نے اب تک ۴۰ ہزار لاوارث نعشوں کو دفن کرنے کا انتظام کیا ہے۔ آدھی رات کوئی اس کا دروازہ کھٹکھٹائے وہ اسی وقت ان کی مدد کے لیے چل پڑتا ہے اکثر تو وہ خود دفن کا کام بھی اپنے ہاتھوں سے کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "میں پاکستان میں سوشیل ویلفر انڈسٹری" قائم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک اسٹوڈنٹس فنڈ" بھی قائم کر چکا ہے تاکہ غریب طلباء کی تعلیم کا انتظام نہایت معقول پیمانہ پر ہو اور طلبہ میں ہمدردی کا جذبہ اور سوشیل سرویس کی اہمیت آشکار ہو"۔ ایدھی انٹرنیشنل سنٹر نیویارک" اور اس کی شاخ لندن کے ذریعہ ہزاروں لوگ فیاضانہ روپیہ اس سنٹر پر بھیجتے رہتے ہیں جس کی مقدار سالانہ پانچ کروڑ سے زیادہ ہے ایدھی دو روپے کی رسید بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیتا ہے۔

اوپر کی دو مثالوں سے آپ کو ضرور اس بات کا اندازہ ہوا ہوگا کہ انھوں نے کام شروع کرنے سے پہلے نہ تو پیسہ کی پرواہ کی اور نہ ہمدردوں کو آواز دی کام شروع کر دیا۔ لوگ آتے گئے قافلہ بنتا گیا اور رواں دواں ہوتا گیا۔ آخر ان میں خاص بات کیا ہے یہی بس اخلاص، ایثار اور خلق خدا کی خدمت کا شدید جذبہ کچھ ایسی نادر صفات ہیں جن کے ناقابل یقین اور ہوشربا کرشمے دیکھنے میں آتے ہیں۔

سوشیل سروس کے لیے چھوٹا بڑا کام سب برابر ہے۔ اپنے اطراف دیکھیں تو ایسے کئی کام آپ کو آواز دے رہے ہیں۔ آدمی کسی اچھے کام کے شروع کرنے کے لئے بہت سوچتا ہے۔ کرنے یا نہ کرنے کی سوچ میں ساری زندگی ہی ختم کر دیتا ہے۔ اور یہ تذبذب اسے لے ڈوبتا ہے

تعلیم ہی بنیادی مسئلہ

رکھیو غالب ہمیں اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد دل میں سوا ہوتا ہے

کسی عالم دین کی کسی بات سے اختلاف کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ پھر مولانا وحیدالدین خاں جیسے عالم دین، جن کی فکر و نظر ذہن و قلم نے ملک کے اکثر مسلمانوں کو متاثر کر دیا ہو وہاں دم مارنا مشکل ہے۔"الرسالہ" ماہ ستمبر ۱۹۸۹ء سامنے ہے اسے شروع سے آخر تک ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالا چونکہ اس راقم کو ملّت کی جہالت و ناخواندگی کے دور کرنے سے تھوڑی بہت دلچسپی ہے، اس لیے لازماً یہ باتیں مسلمانوں کی عام بنیادی تعلیم سے ہی متعلق ہیں اور یہاں کوئی مذہبی بحث چھیڑنا مقصود نہیں اور نہ یہ اپنے بس کی بات ہے بلکہ اپنا مسلک سیدھا و صاف ہے۔

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
(اکبر)

الرسالہ کے ٹائٹل پر ایک فکر انگیز جملہ لکھا ہوا ہے" ہر انسان قدرت کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے ----- یہ صرف مشکلات کی ٹھوکریں ہیں ----- جو اس خزانہ کو اندر سے باہر لاتی ہیں"

یہ جملے صرف چند لوگوں کے متعلق کسی حد تک صحیح ہو سکتے ہیں ورنہ ملت کے

کام کے نہیں ہیں ۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ مشکلات کی ٹھوکریں شخصیت کے خزانوں کو باہر لاتی ہیں یہ صرف تعلیم ہی سے ممکن ہے تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہر بچہ کی شخصیت کو نکھارتی ہے ۔ اس کے اندر قدرت نے علم و دانش کے جو خزانے چھپا رکھے ہیں وہ اس پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں ۔ ہر قسم کے مادی اور روحانی کمال کے لیے بنیادی تعلیم و تربیت ضروری ہے جاہل اپنی زندگی میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا جاتا ہے وہ صرف اپنے پیر زخمی کر لیتا ہے ۔ کیوں کہ اس میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی کہ وہ ان تجربات حیات سے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکے ۔

حسن گنگو بہمنی کو برہمن مالک کی زمین میں ہل چلاتے ہوئے خزانہ کی دیگ باہر آ گئی یہاں پر محنت و مشقت ایمانداری و دیانت داری کام آئی جو وہ بادشاہت تک پہنچ پایا ۔

میں نے اپنی کتاب کے ایک مضمون میں تعلیم کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا ہے " دوستو ! تعلیم وہ شاہ کلید ہے جو ایک فرد کی پوشیدہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کے قفل کھول دیتی ہے جو شخص تعلیم سے محروم ہے وہ خود اپنی صلاحیتوں سے واقف نہیں رہتا ۔ اس کا حال کچھ ایسا ہے کہ وہ ساری عمر ایک بند کمرہ کے سامنے چوکیدار کی طرح بیٹھا ہوا ہے اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کن خزانوں کا مالک ہے ۔ اس کی محرومیاں اس کی جہالت ہے "

(تعلیمی مسائل ۔ سرسید کا کام ص ۸۶)

ایک اچھی مثال خود آپ کی ذات ہے ۔ فرض کیجئے کہ آپ کو کسی وجہ ساتویں

جماعت تک کی بھی تعلیم نصیب نہ ہوتی تو آپ کے جیسا زرخیز ذہن بنجر رہ جاتا ذاتی ذہانت سے آپ ایک چھوٹے سے دائرہ میں شاید کچھ کر لیتے لیکن یہ فکر وفن کے جواہر پارے اس طرح صفحہ قرطاس پر نہ بکھیر سکتے۔یہی حال سارے ملک کے دیہاتوں اور قصبات کے مسلمان بچوں کا ہے جو آبادی کے اس جنگل میں جنگلی پودوں کی طرح اگ رہے ہیں محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد ۳ کروڑ کے لگ بھگ ہو گی۔

۲۔الرسالہ کے اسی شمارہ کے صفحہ نمبر ۳۱ پر اور ایک اقلیت کے عنوان سے مسٹر جی ایم بھاٹیا کے مضمون کا خلاصہ ہے جو ٹائمس آف انڈیا کے کسی شمارے میں شائع ہو چکا ہے اس نے ہندوستان کی آبادی کی تقسیم تعلیم اور جہالت کی بنیاد پر کی ہے۔وہ لکھتا ہے۔

"اس تقسیم نے اس ملک میں کسی حقیقی اصلاحی کام کو بہت زیادہ آسان بنادیا ہے۔آپ یہاں کی آبادی کے ۲۰ فی صدی حصہ پر کام کر کے پوری آبادی تک پہنچ سکتے ہیں۔آپ انہی پر براہ راست اشاعت افکار کا کام کیجیے اور بقیہ ۸۰ فی صد اکثریت تک آپ کی دعوت بالواسطہ انداز میں پہنچ جائے گی

مولانا کو اس بات سے اتفاق ہے" ہر تاریک پہلو میں ایک روشن پہلو چھپا ہوتا ہے۔بشرطیکہ استعمال کرنے والے اس کو استعمال کر سکیں"۔

یہ اعداد وشمار ٹھیک مسلم اقلیت پر فٹ ہوتے ہیں۔اس لیے کہ سارے ملک کا تعلیمی اوسط ۳۷ فی صد ہے اور یہ سب باتیں خیال خام ہیں حقیقی اصلاح کا کام ۸۰ فی صد مسلمانوں کے ان پڑھ اور ناخواندہ رہ جانے سے مشکل ہی

نہیں ناممکن ہو چلا ہے ۔ انہیں اس کی خبر نہیں کہ شہروں میں بیٹھ کر ہم جلسوں سمینار سمپوزیم اور کانفرنسوں میں کن کن نازک خیالات سے کھیلتے ہیں اور کتنی بار "چاہیے" کی رٹ لگاتے ہیں ۔

۲۰ فی صد مسلمان ضرور پڑھے لکھے ہیں لیکن ان میں غالب اکثریت خواندہ ہے نہ کہ تعلیم یافتہ یہ LITERATE ہیں لیکن EDUCATED نہیں ہیں حرف شناس شد بد پڑھنے والے نان میٹرک نان مڈل کم و بیش ۸ انی صد ہیں باقی ۲ فی صدی مسلمانوں میں وہ لوگ آتے ہیں جنھوں نے گریجویشن کی تکمیل کرلی ہو یا اس سے اونچی تعلیم حاصل کرلی ہو ۔ اس تعداد میں سب نے گریجویشن کی تکمیل لسان داری سے کی ہے کچھ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا شاعر و افسانہ نگار آجاتے ہیں پھر ان دو فی صد میں دین و مذہب شعر و ادب کا پاک صاف نکھرا ہوا ذوق رکھنے والے بس ایک لاکھ میں سو پچاس ہو سکتے ہیں اور پھر بھی آپ کا الرسالہ ان کے پاس نہیں پہنچتا اور جن کے پاس پہنچتا ہے وہ ایسے پڑھے لکھے لوگ ہیں جو آخری عمر کو پہنچ چکے ہیں انہیں فرصت ہی فرصت ہے کچھ کام دھام نہیں ہے وقت کٹتا نہیں وقت گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی عنوان بحث کے لیے چاہیے اس طرح وہ کچھ ذہنی سکون اور روحانی مسرت سے آشنا ہو جاتے ہیں چنانچہ یہی لوگ صبح میلادالنبیؐ کے جلسوں میں نظر آتے ہیں اور شام میں مشاعروں کی ٹکٹ کی لائن میں نظر آئیں گے ۔ (خاکسار کا بھی ان ہی میں شمار کرلیجیے) آپ اپنی بات ان تک پہنچا کر یہ توقع رکھنا کہ وہ ساری بریانی کی دیگ کو مزیدار بنادے گا، خوش فہمی سے بڑھ کر خود فریبی کی عجیب و غریب مثال ہے ۔

مسٹر بھاٹیا کے مضمون پر مولانا کے تائیدی ریمارک سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ امت مسلمہ اس ملک میں جہالت کی جس تاریکی میں گم ہے وہ اس پر قانع ہے وہ

اس تاریکی کو " مستقل " دیکھ رہی ہے ۔ہاں کبھی کبھی اس تاریکی میں بجلی چمک جائے تو بس ہے۔یہاں پر بے ساختہ جارج برنارڈ شاہ کے وہ جملے یاد آجاتے ہیں جو غریب اور جاہل عوام کے خلاف ان کی چھپی سازش کا اظہار یوں کیا ہے ۔(ترجمہ نہیں خلاصہ ہے)۔

" سچی تعلیم ظلم اور استحصال کے خلاف خطرہ کی گھنٹی ہے ،
سرمایہ دارانہ نظام کی جڑیں عام جہالت کی وجہ سے سرسبز
ہوئیں ۔چرچ کی برتری لوگوں کی جہالت ہی سے قایم ہے
فاتح اور ڈکٹیٹر تو ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ عوام انہیں دیوتاؤں
کے جیسا پوجیں وہ کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان جاہل
عوام کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں ۔"

کیا یہ بات آج کے حالات میں ہمارے ملک کی مسلم اور غیر مسلم آبادی پر یکساں چسپاں نہیں ہوتے ۔کیا کوئی دولت مند ہی جان سے چاہتا ہے کہ عام غریب لوگ پڑھ لکھ کر قابل بن جائیں ۔کیا کوئی مولوی، مُلّا، مرشد، واعظ، عامل، مجاور، خادم درگاہ یہ چاہتا ہے کہ مسلمان پڑھ لکھ کر ان کے قابو سے باہر ہو جائیں کیا کسی لیڈر کو یہ توقع ہے کہ وہ صرف اپنی زبان کے زور سے ووٹ حاصل کر سکتا ہے ۔

کیا یہ بات مبالغہ ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کو شروع ہوئے ایک سو برس سے زیادہ ہو گئے اور ان ایک سو برسوں میں مسلمان تعلیم کی وادی میں صرف ۲۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے ہیں ۔اگر وقت اور فاصلہ کی حسابی زبان میں کہا جائے تو یہ بات ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ باقی ۸۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے لیے ہمیں مزید چار سو سال لگ جائیں گے کیا روئے زمین کی گردش ہمارے انتظار میں ساکت ہو

جائے گی۔ یا کوئی بتادے کہ "آپ کے حساب میں کچھ غلطی رہ گئی ہے"۔

خدارا یہ وقت آپ کا ہے علمائے دین اور واعظان کرام کی باتوں کو سارے مسلمان اپنی کمزوریوں کے باوجود بڑے دھیان سے سنتے اور دل سے مانتے ہیں یہ بات ان کے دل و دماغ میں ڈال دینا ہے کہ دیکھو تم اپنے بچوں کو کسی اسکول یا مسجد کے مدرسہ ہی میں شریک کرادو۔ یہ وقت آپ کے ذہن و قلم کو اس جہالت کی بھیانک تاریکی کو دور کرنے کے لیے موڑ دینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس عظیم جمہوری ملک میں مسلمان دیہات میں کس قوم کی جگہ لے چکے ہیں وہ سب آنکھوں کے سامنے ہے۔

"پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے"

اور یہ بھی تو دیکھے۔۔

یہ نادان گر گیئے سجدہ میں جب وقت قیام آیا"

(علامہ اقبال)

تعلیم کا کام ۔۔۔ عائشہ بیگم کے نام

محترمہ عائشہ بیگم، صدر محفل علم و فن، سابق جوائنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن. مہاراشٹرا کے نام اور کام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے ۔ان کا لائف مشن تعلیم ہی تعلیم ہے ۔اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تعلیم ہی موضوع گفتگو ہوتا ہے ۔روزآنہ صبح سے شام تک اپنی کار میں غریب ذہین بچوں کی تلاش میں گھر گھر پھرتی رہتی ہیں تاکہ ان کی مدد کی جائے ۔ان کے عزم اور لگن کو دیکھ کر خیال آیا کہ محترمہ کے کام کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی چاہئیے ۔تاکہ اس گم نام نیک نام خاتون کے کام سے عجب نہیں بہت سے خاندانوں کو روشنی ملے گی ۔ ممکن ہے کچھ دیر کے لئے گہری فکر میں گم ہوجائیں گے اس مضمون کا اصل مقصد بھی یہی ہے ورنہ محترمہ کی تعریف و توصیف میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں ہے۔

دوسروں کی باتیں بعد میں ہوں گی، یہ بتائے کہ آپ کے بچے بھی کچھ پڑھے لکھے ہیں ۔کہنے لگیں میرے سات بچے ہیں، چار لڑکے اور تین لڑکیاں اس میں چھ ڈاکٹر ہوئے اور ایک لڑکا انجنیر ۔دو بہو ڈاکٹر ہیں اور تینوں داماد ڈاکٹر ۔یہ سب کے سب امریکہ، انگلینڈ میں ہیں ۔ایک صاحب زادی ڈاکٹر شمیم حیدرآباد ہی میں وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کی سپرنٹنڈنٹ اور گائناکالوجی کی پروفیسر ہیں ۔ بعد میں یہ ترقی پاکر ڈائرکٹر میڈیکل ایجوکیشن سے ریٹائرڈ ہو گئیں ۔آندھرا پردیش میں یہ پہلی مسلم خاتون ہیں جو اس اعلیٰ اعزاز کو حاصل کیا ۔اعلیٰ تعلیم کے دوران میرے خاندان کے بچوں نے گیارہ گولڈ میڈل لئیے ایک لڑکی نے میڈیسن میں چار گولڈ میڈل لئے یہ سب میرے یہاں

آج بھی محفوظ ہیں۔ میں نے کہا ایک ہی خاندان میں گیارہ ڈاکٹر اور گیارہ میڈل اَحَدَ عَشَرَ کَوکَباً کی مثال۔ گیارہ کے گیارہ آسمان کے تارے۔ پھر ان سب کے بچے میڈیسن، انجنیرنگ اور کالج کی اعلی تعلیم پا رہے ہیں۔

مین نے کہا کہ آپ کے سب بچے جب اتنے قابل نکلے تو ظاہر ہے کچھ اپنے آبائی خاندان کے ماحول اور روایات کا ضرور اثر ہوگا۔

ہاں یہ بات بڑے پتے کی ہے۔ میری آٹھ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہمارے خاندان میں بزرگ عالم، فاضل اور جید علمائے دین گزرے ہیں۔ میری والدہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ان کا ارادہ تھا کہ سب بچوں کو کالج تک اعلیٰ تعلیم دلوا کر رہوں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری سب آٹھ بہنیں محکمہ تعلیمات میں کلاس ون گزیٹڈ آفیسرس کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوگئیں اور میرے ایک بھائی ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے سے۔ ساٹھ ستر برس پہلے لڑکیوں کے لئے نہ تو اسکول زیادہ تھے اور نہ کالج۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لڑکیوں کی تعلیم کو گناہ اور خاندان کے لئے عیب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے زمانے میں آپ کی والدہ کی دور اندیشی اور روشن خیالی کچھ عجوبہ روزگار سے کم نہیں۔

تعجب ہے کہ آپ کے سب بچے اتنے ذہین و فطین کیسے نکلے؟

آپ تو میرے سب راز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اور میرے شوہر روزانہ شام میں اپنے بچوں کے ساتھ دو تا چار گھنٹے ان کے اسباق اور ہوم ورک دیکھنے بیٹھ جاتے ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر ہونے کے باوجود میں صرف ایک دن کلب گئی۔ عام طور پر ہم لوگ کسی تقریب میں شریک نہ ہوتے۔ سوائے ایسی تقریب کے جو بہت ضروری اور اہم ہوتیں۔ بچوں کی تعلیم میں ایک دن کا بھی حرج ہوتا تو میں بے چین ہوجاتی۔

ان کے عام معلومات کے لئے پر بھنی کی پبلک لائبریری سے روزآنہ ایک کتاب ایک آنے میں لاتی جو ۲۴ گھنٹوں بعد واپس کرنی پڑتی ۔وہ ایک کتاب ایک دن میں تین چار بچے باری باری سے پڑھ لیتے ۔اس طرح لائبریری کی ساری کتابیں میرے سب بچے دیمک کی طرح چاٹ گئے۔

میری ایک لڑکی ہوسٹن (امریکہ) میں گائنا کالوجسٹ ہے جو انگلینڈ اور امریکہ کے بارہ امتحانات پاس کر چکی ہے ۔ایک داماد ڈاکٹر عبد العلی شہرہ آفاق کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر کولی کے ساتھ کام کرتے ہیں ۔ان کی شہرت اور عظمت کے لئے اسی ۸۰ سالہ ڈاکٹر کولی کا نام کافی ہے۔

میں اور میرے شوہر سادہ لباس استعمال کرتے ہیں میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھڑک دار اور قیمتی ساڑی نہیں خریدی ۔جو ٹیچرس اور خواتین مجھ سے عید ملنے آتیں وہ میری سادہ لباسی پر حیرت کرتیں ۔کیوں کہ وہ بھڑک دار لباس اور زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتیں ۔ کبھی وہ پوچھ لیتیں کہ آپ ڈسٹرکٹ کی عہدہ دار ہوتے ہوئے بھی کیوں اتنے سادہ لباس میں رہتی ہیں ۔میں کہتی اچھے لباس اور زیور کی تمنا مرے دل میں نہیں ہے ۔اگر میں اس آرائش و زیبائش پر خرچ کروں تو میں بچوں کو پڑھا نہیں سکتی ۔جب یہ بچے بڑے ہو کر کچھ نام پیدا کریں گے تو اس وقت خوشی ہوگی، اس کا اندازہ تو اب نہیں ہو سکتا۔میں نے کبھی زندگی میں کسی سے بھی قرض نہیں لیا آج میرے سب خواب پورے ہو گئے ۔ان بچوں کو دیکھ کر ماں کو جو خوشی ہوتی ہے وہ آپ کو کیسے بتاؤں ۔مجھے اپنی سادہ زندگی پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ فخر ہی رہا نہ معلوم کتنی خواتین نے میری زندگی سے سبق لیا ہوگا۔

میں نے گفتگو کو ذرا بدلتے ہوئے سوال کیا کہ اپنے بچوں کے لئے کون کیا کچھ

نہیں کرتا۔ اگر آپ نے بھی یہ سب کیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر آپ نے کچھ غریب، ذہین بچوں کے لئے بھی کیا ہوتا تو پھر ہمیں آپ کے کام سے کچھ دلچسپی ہو سکتی یہ سوال کچھ ان کی رگِ حمیت کو پھڑکانے والا تھا۔ ذرا جوش میں آکر کہنے لگیں۔

میں نے بچپن ہی میں اور پھر اسکول کی ٹیچر اور بڑے عہدوں تک پہنچنے تک ہر منزل پر میں نے بحیثیت عہدہ دار نہیں بلکہ خانگی طور پر دوسروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے مقدور بھر کوشش کرتی رہی۔

محترمہ نے کوئی دس بارہ قصے ایک گھنٹے میں سنا ڈالے سب کہاں کچھ آپ سن لیجئے کہنے لگیں۔

میں اورنگ آباد میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر تھی ایک دن ایک غریب لڑکا آیا۔ کہنے لگا مجھے کہیں نوکر رکھوا دیجئے۔ پوچھا بیٹا کچھ پڑھا بھی ہے۔ کہنے لگا میٹرک اسی سال کامیاب کیا ہوں۔ کیا نمبر لائے۔ ۹۲ فیصد تین مضامین میں پورے سو فیصد۔ یہ حیرت میں پڑھ گئیں۔ اس لڑکے کو سمجھایا کے بیٹا تو ڈاکٹر بنے گا۔ غریب باپ نے وعدہ کیا کے کسی طرح اس کے اخراجات برداشت کرے گا۔ وہ میڈیسن کے کورس کے دوسرے سال میں تھا کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ اس وقت جالنہ میں تھیں۔ انہیں خط ملا کہ آپ کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو اچھا ہوتا۔ میرے خاندان کا سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے دوسرے سال میں ہوں۔ اگر مجھے کم از کم ۲۵ روپے ماہانہ وظیفہ کسی طرح نہ ملے تو میں تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوں۔ محترمہ عائشہ بیگم نے فوراً ٹیلی گرام کے ذریعے ۲۵ روپے منی آرڈر بھیج دیا اور خط لکھ دیا کہ تعلیم ختم کرنے تک ۲۵ روپے ماہانہ تمہیں ملتے رہیں گے۔ یاد رہے کہ یہ روپے آج کے نہیں کوئی چالیس برس پہلے کے تھے۔ اس لڑکے کو یہ رقم ہر مہینے کی پہلی

تاریخ کو کوئی تین برس تک ملتی رہی ۔ ایک روز وہ گھر آیا اور اپنی پہلی تنخواہ محترمہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ محترمہ نے کہا اس کی حق دار تو تمہاری والدہ ہیں اور رقم واپس کر دیں ۔ لیکن اس شریف ڈاکٹر نے تعلیم کے زمانے کے پورے روپے واپس کر دیئے تا کہ اس قسم کی امداد دوسرے لڑکوں کے لئے جاری رہ سکے ۔ اس ڈاکٹر کی شادی اونچے خاندان کی خوبصورت لڑکی سے ہوئی ۔ ان کے بچے کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور آج کل سیول سرجن ہیں ۔ اگر وقت پر عائشہ بیگم صاحبہ نے اس لڑکے کی تعلیم میں دلچسپی نہ لی ہوتی تو نہ معلوم یہ ہیرا کہاں کوڑے کرکٹ میں گم ہو جاتا ، کسی کو پتہ بھی نہ ہوتا۔

ضلع پربھنی میں ایک صاحب امریکہ سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر کے آئے اور کسی بڑی ملازمت پر کام شروع کیا لیکن یہ تھے کٹر مذہبی آدمی ۔ لڑکیوں کی تعلیم کے دشمن اور لڑکیوں کو پردہ کرانے کے سخت پابند ۔ ان کی ایک بارہ سالہ لڑکی چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی جو برقعہ اور رکشا کو پردہ لگا کر اسکول جاتی تھی ایک روز یہ لڑکی پردے سے باہر دیکھ رہی تھی ۔ باپ کی نظر پڑی ۔ شام میں لڑکی اسکول سے واپس آئی ۔ ابا جان غصے میں آپے سے باہر ہو گئے ۔ لڑکی کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ لڑکی کا ایک دانت ٹوٹ کر گر گیا اور اسکول سے نام خارج کروالیا ۔ محترمہ کے بہت سمجھانے بجھانے پر اس لڑکی کو وہ دوبارہ اسکول بھیجنے پر آمادہ ہو گئے ۔ اس حادثہ کے ایک دو سال کے اندر ہی ان صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا ۔ ۲۵ سالہ بیوہ اور پانچ بچے بے سہارا اس دنیا میں رہ گئے ۔ عائشہ بیگم صاحبہ نے اس سارے خاندان کو اپنے گھر بلا کر رکھ لیا ۔ یہ پردہ نشین بیوہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھیں ۔ انہیں پڑھانا شروع کیا ۔ انہوں نے میڈل پاس کر لیا اور ٹرینڈ ہو کر اسکول میں ٹیچر ہو گئیں ۔ باپ کا مرنا

کیا تھا سب کے لیے تعلیم کا دروازہ کھل گیا۔ یہ خاتون راتوں میں کپڑے سیتیں اور اس پیسے سے گھر کا خرچ چلانے لگیں۔ ان کے پانچوں بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لڑکے اعلیٰ عہدوں پر ہیں اور لڑکیاں بڑے خاندانوں میں بیاہی گئیں۔ ان صاحبہ کے چھ بھائی چھوٹی موٹی کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ ان سب کے بچوں کو اس خاتون نے تعلیم کا انتظام کیا اب ان میں پچاس سے زاید افراد آپ کو ڈاکٹر انجنیر، ٹیچر، پی۔ ایچ۔ ڈی، پرنسپل مل جائیں گے۔

میں نے کہا مولانا سلیمان ندوی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "اگر غریب خاندان کا کوئی لڑکا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاتا ہے تو اس کی تیسری چوتھی پشت میں کوئی غریب باقی نہیں رہے گا اس پر محترمہ نے کہا:

دیکھئے صرف ایک ہی پشت میں تعلیم نے سارے خاندان میں انقلاب برپا کر دیا اور کہا میں نے کسی پردہ نشین خاتون کو ایسی ذہین، دوراندیش، دانش مند اور حوصلہ مند اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

ایک دن ایک لڑکی اپنے خاندان سے ناراض ہو کر محترمہ کے گھر آگئی تاکہ وہ کالج میں شریک ہوسکے۔ اس لڑکی کے بھائی کالج کی اعلیٰ تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ بڑی مشکل سے محترمہ نے انھیں سمجھایا۔ اس لڑکی کے ساتھ اور آٹھ لڑکیوں کو کالج میں شریک کروایا اس لڑکی نے ڈیرہ دون سے ایگریکلچر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ آج کل زرعی کالج میں ایک شعبہ کی ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ہے اور پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

اچھا آج کل آپ کی مصروفیت کیا ہے۔ دبیرپورہ میں بینی صاحب کے بنگلہ میں "امام بخش میموریل اسکول" چلا رہی ہوں جس میں ۱۲۶ طلبہ اور دس ٹیچر کام کرتے

ہیں ۔ اس عمارت کا ایک حصہ میرے داماد ڈاکٹر عبدالعلی نے اسکول کھولنے کے لئے دے دیا ہے ۔ اس محلّے کے عام طور پر غریب خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیاں پڑھنے کے لئے آتے ہیں ۔ میں اسی اسکول میں بیٹھا ہوا تھا ۔ ایک خاتون اپنے دو بچوں کو لے کر آئیں اور اپنی افتاد سنانے لگیں ۔ یہ دونوں بچے رات میں سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں ۔ باپ پینے کا عادی ہے ۔ کبھی کبھی گھر کی صورت دیکھ لیتا ہے ۔ میں ان بچوں کو آپ کے حوالے کرتی ہوں ۔ محترمہ نے کہا بیٹا تم بڑے ہو کر رکشا چلاؤ گے یا میری طرح موٹر کار میں اڑتے پھرو گے اس کے لئے تعلیم ضروری ہے ۔ بچوں نے کہا ہمیں رکشا نہیں چلانا ہے ۔ موٹر کار چلانا ہے ۔ بس انھیں اپنے اسکول میں جہاں پہلے ہی سے ۱۸ بچوں کے قیام و طعام کا مفت انتظام ہے ان دو بچوں کے رہنے، کھانے پینے کتابیں کاپیاں سب کا مفت انتظام کر دیا ۔ یہ دونوں لڑکے کوئی دو ماہ سے پڑھ رہے ہیں، ذہین ہیں ۔ خود محترمہ روزانہ ان کا ہوم ورک دیکھتی ہیں ۔ چند برسوں بعد عجب نہیں کہ یہ سماج میں کسی اچھے درجے تک پہنچ جائیں ۔

میں نے کہا کسی کو ایک وقت مدد دے کر نجات حاصل کر لینا آسان ہے لیکن آپ نے تو ان بچوں کی ہی نہیں ان کے خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لیتی ہیں یہ تو جان کا جھنجھٹ ہے ۔ کون یہ پریشانی اپنے سر لیتا ہے کہنے لگیں ۔ دیکھئیے یہ میرا لائف مشن ہے ۔ اگر میں یہ کام نہ کروں تو میری زندگی کے دس سال کم ہو جائیں گے ۔ میں نے مسلمان ہی نہیں تین ہندو بچوں کی خاموش مدد کی ہے ۔ ان کے نام لینا نہیں چاہتی ۔ ان میں ایک ڈاکٹر، ایک انجنیر، ایک کالج کے پرنسپل ہیں ۔

اب چلئے آخری سوال رہ گیا ۔ آخر یہ ماہانہ ہزاروں کا خرچ آپ کیسے برداشت کرتی ہیں ۔ میرے بچے میرے کام سے واقف ہیں وہ میری مدد کرتے ہیں ۔ میں نے آج

تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ کبھی اخبار میں کوئی اپیل کی۔ میری پنشن کی ساری رقم غریب۔ذہین بچوں کی تعلیم پر خرچ ہوجاتی ہے۔ میں نے آج تک اپنی پنشن کی رقم کا ایک روپیہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔

اگر کسی خاتون میں خدمت خلق کا ایسا جذبہ موجود ہو تو وہ تعلیم کے ذریعے کئی ایک خاندان ہی نہیں بلکہ ان کی آنے والی نسلوں کو نامعلوم وقت کے دھارے تک اپنے اس احسان کی بارش سے ہرا بھرا رکھ سکتی ہے۔شائد اس کا اندازہ خود عائشہ بیگم کو بھی نہ ہوگا۔میں نے کہا کوئی پیام:

چلئیے آپ کی خاطر اقبال کا ایک شعر پڑھ دیتی ہوں۔

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں ، شاید انھیں جگا دے

میں نے یہ شعر پڑھا

بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ " ایسے " ہیں جہاں میں

اردو میڈیم اسکولوں کا معیار تعلیم اور تعلیمی پروگرام

آج سے کوئی ۳۰ برس پہلے ملک کے ایک ممتاز دانشور کی ایک طویل تقریر بعنوان " اردو کے مستقبل " پر حیدرآباد ہی میں ہوئی تھی ۔ موصوف نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ پیش گوئی کی تھی کہ " آج سے ۲۵ برس بعد ہندوستان میں یونیورسیٹیز کے اردو ڈپارٹمنٹ میں اردو رہ جائے گی ۔ اس کو پڑھنے اور لکھنے والا شاید ہی کوئی رہ جائے گا ۔ اگر اس زبان کو زندہ رکھنا ہو تو یہودی قوم کا سا جگر چاہئے جنہوں نے اپنی عبرانی زبان کو چار ہزار برس تک صحرانوردی کے باوجود سینہ سے لگائے رکھا اس مضمون کے لکھتے وقت میرے سامنے وہ مایوسی کا عالم ہے جو سارے ہال پر چھا گیا تھا ۔ اور دل افسردہ سے زبان پر یہ مصرع آیا تھا ؏ ۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اتفاق کی بات ہے کہ وہ دانشور آج بھی زندہ ہیں اور وہ تقریر سننے والے مجھ جیسے ابھی بقید حیات ہوں گے ۔ زہے نصیب کہ وہ پیش گوئی پوری نہ ہوئی ۔ بلکہ اردو کے اچھے دن آگئے ہیں ۔ اس زبان کی چاہت نے اس کو زندہ ہی نہیں رکھا بلکہ اس کو پروان چڑھانے کے لئے ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا میں کوشش جاری ہیں ۔

یوں تو موسم بدلتے ہی رہتے ہیں پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے گرنے لگتے ہیں اور وہ ننگ دھڑنگ موسم بہار کے انتظار میں کھڑے رہ جاتے ہیں ،

چند برسوں سے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ان خزاں رسیدہ درختوں پر نسیم بہار کے جھونکے چلنے لگے ہیں۔ عابد علی خاں اردو تعلیمی ٹرسٹ کے تحت اردو سیکھنے کی گرمائی کلاسیس میں کافی گرمی آچکی ہے۔ اس پروگرام کا عوام نے جس جوش و خروش سے استقبال کیا اسے دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ سرپرستوں میں اپنے بچوں کو اردو سکھلانے کا جذبہ کس قدر شدید ہے۔ مشاعروں کی آب و تاب وہی باقی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے ہندی۔ اردو یا ہندوستانی زبان کہہ لیجئے یہی عوام کی زبان ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں لیکن سارا ملک اس کا وطن ہے۔ اگر کوئی زبان سیکولرزم کا دعویٰ کر سکتی ہے تو وہ اردو زبان ہی ہے۔ اے سخت جاں اردو تیری پیدائش جنگی لشکروں کے درمیان ہوئی۔ ہندوستان کے بازاروں میں تیرا بچپن ہنستے بولتے گزر گیا، مشاعروں اور ادبی محفلوں نے تیرا شباب دیکھا، ادیب و شاعر، افسانہ و ناول نگار، کالجوں اور جامعات کے اساتذہ نے تیری زلفوں کو سنوارا عوام نے تجھے گلے لگایا اب یہی تیری زندگی کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

ذریعہ تعلیم:

قریب ڈیڑھ سال قبل روزنامہ "سیاست" میں کسی نے یہ سوال کیا تھا کہ بچوں کے لئے کونسا ذریعہ تعلیم مناسب ہے؟ دنیا کے سارے ماہرین تعلیم اس ایک بات پر متفق ہیں کہ "بچہ کے لئے مادری زبان ہی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا قول ہے کہ "بچہ مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے" مادری زبان بھی بچہ کے جسم و جان کا حصہ بن جاتی ہے۔ بلکہ خون کے ساتھ اس کے رگ و پئے میں دوڑنے لگتی ہے۔ مادری زبان کا مطلب ذرا وسیع ہے۔ گھر میں بھائی، بہن، دوست و رشتہ دار، محلہ کے بچوں کی زبان کا سارا ماحول مادری زبان ی کا حصہ ہے۔ اب جو لوگ اپنے بچوں کو

کسی دوسری زبان میں تعلیم دلوانا چاہتے ہیں تو وہ اپنے بچوں پر ظلم کرتے ہیں ۔ کیوں کہ بچہ پہلے پانچ برس میں جتنا کچھ سیکھتا ہے ، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ وہ باقی ساری عمر کے حصہ میں اسی پانچ برس کے مساوی سیکھ پاتا ہے ۔ یہی بچہ کی زندگی کا زرخیز زمانہ ہے ۔ لیکن وہ ایسی مصنوعی کاوشوں میں ضائع ہوجاتا ہے جو بچہ کو نامانوس زبان سیکھنے کے لئے کرنی پڑتی ہے اکثر دانشور حضرات کا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں نہ پڑھائیں تو پھر وہ اعلیٰ تعلیم اور آل انڈیا سروسز میں نہیں آسکتے ۔ چونکہ یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ انگلش میڈیم کے طلبہ ہی ہر سال میڈسین ، انجنیرنگ ، زراعت ، وٹرنری ، بزنس ایڈ منسٹریشن وغیرہ جیسے اعلیٰ تعلیم کے شعبوں میں داخل ہوتے ہیں ۔ ایک طرف تو آپ کا دعویٰ ہے کہ مادری زبان ہی میں تعلیم دینا چاہیے اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میڈیم اسکولوں کے میٹرک کی سطح کے نتائج افسوسناک حد تک پست ہیں آندھراپردیش اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق سال گذشتہ ۶۰ فیصد اردو میڈیم اسکولوں کے میٹرک کے نتائج صفر رہے اور ۴۰ فیصد اسکولوں کا نتیجہ ۶ فیصد سے بڑھ کر نہ تھا ۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھا کر ان کی ساری زندگی کون برباد کرے گا اور سارے حوصلوں پر پانی پھیرنے کے لئے کون تیار ہوگا ۔ اردو سچ ہے میری مادری زبان ہے ، پیاری زبان ہے دل اور روح کی زبان ہے مگر دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی گذارنے کے لئے کچھ روپیہ پیسہ کی بھی ضرورت ہے ۔ سرسید کی زبان میں گو یہ دنیا دو روزہ ہے لیکن یہ دو روز کی زندگی بھی بڑے معرکہ اور مصیبت کی ہے ، یہاں پر عزت و وقار کی زندگی کی قیمت ہے ، جاہل و کاہل بن کر ، دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہنا زندگی کی توہین ہے اگر بچہ اردو میں تعلیم پائے گا تو اس کے ڈاکٹر ، انجنیر بننے کے مواقع

۹۰ فیصد کم ہوجائیں گے ہمیں یہاں ان ہی سوالوں کا جواب دینا ہے ۔ جو بڑی ذہنی الجھن کا باعث بنے ہوئے ہیں ۔

حیدرآباد و سکندرآباد ہی میں نہیں بلکہ اضلاع پر بھی ہزاروں انگلش میڈیم اسکول چل رہے ہیں ۔ ان میں بس دو چار فیصد ایسے اسکول ہیں جو گذشتہ ساٹھ ستر برس سے اپنے اعلیٰ تعلیمی معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ۔ ان کی شہرت کا راز یہ نہیں کہ ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے بلکہ یہاں پر داخلہ ہر کس و ناکس کو ملتا ہی نہیں ۔ داخلے کے وقت وہ بچے سے زیادہ ماں اور باپ کی تعلیمی قابلیت عہدہ اور سماجی مرتبہ کو جانچتے ہیں ۔ اس طرح وہ ابتداء ہی میں سوسائیٹی کے Cream Layer (بالائی سطح) سے Cream (بالائی) نکال لیتے ہیں ۔ ایک اندازہ کے مطابق ۶۰ فیصد تعلیم اسکول میں ہوتی ہے اور ۴۰ فیصد تعلیم گھر پر ہوتی ہے ۔ اگر آپ گھر پر ٹیوٹر کا انتظام نہ کریں یا خود ماں یا باپ دو گھنٹے ان کا ہوم ورک نہ دیکھیں تو بچہ کا گریڈ گر جاتا ہے ۔ اگر فیل ہوگیا تو وہ اسی دن اسے ٹی ۔ سی دے کر بڑھا دیتے ہیں ۔ پھر اسکول کا انتظامیہ بھی غیر معمولی موثر اور اساتذہ قابل اور کارکرد ہوتے ہیں ۔ وہ اپنے نام کو اونچا رکھنا چاہتے ہیں ۔ کوئی پندرہ برس پہلے مجھے لٹل فلاور Little Flower اسکول کے پرنسپل سے نجی گفتگو کا موقع ملا میں نے کہا کہ آپ کے ہاں منسٹر، سکریٹریز، ڈاکٹرس کے بچے پڑھتے ہیں کیوں آپ کالج اور پوسٹ گریجویشن کالج قائم نہیں کرتے ۔ آپ کے لئے کالج کی منظوری حاصل کرنا کون سی بڑی بات ہے ۔ برادر نے جواب دیا کہ ہاں ہم کالج کھولنا چاہیں تو بس ایک دو دن میں منظوری حاصل کرلیں گے ۔ دوسروں کیلئے شاید تین برس بھی کافی نہ ہوں گے ۔ ہم کوئی کالج اسٹارٹ کرنا اسلئے نہیں چاہتے کہ دیکھئے گذشتہ سال ایک سو طلبہ انٹرمیڈیٹ میں سب کے سب فرسٹ کلاس پاس

ہو گئے ۔ ان میں ۲۱ میڈیکل کالج میں، ۲۹ انجنیرنگ کالج، آئی ۔ آئی ۔ ٹی، چند اگریکلچر کالج، وٹرنری اور باقی سب کے سب راستا پور پالی ٹیکنیک میں شرکت کے مستحق ہوئے ۔ بس ہم انٹرمیڈیٹ کورس تک اپنے طلبہ کو لے جاتے ہیں جو تمام فنی اور پروفیشنل کورسس کا باب الداخلہ ہے ۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ تعلیم کے کالجوں میں ہمارے ہی اسکول کے طلبہ کا قبضہ ہے ۔ پھر ہمیں کوئی کالج اسٹارٹ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔

باقی ۹۰ فیصد سینکڑوں انگلش میڈیم اسکول جو ہر موڑ پر نظر آئیں گے ان کا معیار تعلیم نہایت پست ہے ۔ لہذا تمام اسکول کچھ ظاہری ٹپ ٹاپ کے ساتھ تجارتی نوعیت کے (Education Shops کی سی ہے، جہاں پر بچہ کو اسباق رٹنے پڑتے ہیں ۔ جن کا رٹو حافظہ Rote Memory اچھا ہوتا ہے وہ کچھ آگے جاتے ہیں ۔ ورنہ ان کی مہارتیں اردو تلگو میڈیم طلبہ سے بہت کم ہوتی ہیں ۔ لیکن یہ اسکول سرسبز و شاداب اس لئے ہیں کہ سرپرست ایک بڑے دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ بچہ انگریزی میڈیم اسکول سے پڑھے گا تو کچھ بن جائے گا ۔ "ولی کالونی" کے سلم ایریا کے کوئی دس بارہ بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں شریک ہیں جن کے باپ رکشا چلاتے ہیں یا پھر ٹھیلے کا کاروبار کرتے ہیں اور عورتیں گھروں میں کام کرتی ہیں ۔ ان کے بچوں کا تعلیمی معیار معلوم کرنے کے لئے میں خود ان کے ساتھ بیٹھ گیا ۔ تعجب ہے کہ پانچ سے سات سال تک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کے باوجود ایک طالب علم بھی نہ تو ایک جملہ بول سکتا ہے اور بعض کو سبق کے عنوان کے معنیٰ تک نہیں معلوم ہیں ۔ لیکن رپورٹ میں نمبرات ۷۵ فیصد سے کامیاب ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سرپرست اس جال میں پھنس چکے ہیں اردو داں طبقہ کی مصیبت یہ ہے کہ اردو میڈیم

اسکولوں کا معیار تعلیم بہت پست ہے وہ ان اسکولوں میں پڑھانا نہیں چاہتے ۔ مکان کے قریب ہی جو اسکول انگلش میڈیم کا ہے اس میں شریک کروادیتے ہیں اس سے بہتر تھا کہ وہ تلگو میڈیم میں شریک کرواتے اگر کوئی ان اسکولوں کے معیار تعلیم پر ریسرچ کرے تو عوام کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی ۔

اب تیسرا رخ اردو میڈیم کا اسکولوں کا دیکھئیے ۔ اردو اکیڈیمی روڈ (کی جانب سے) ایک گورنمنٹ گرلز اپر پرائمری اسکول کی عمارت ہے ، جو کھنڈر میں تبدیل ہوچکی ہے ۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ یہاں کا تعلیمی معیار کیا ہوسکتا ہے ۔ بعض اسکولوں میں دس دس برس سے کوئی ٹیچر نہیں ۔ نصابی کتب ندارد بلاک بورڈ اور چاک بھی نصیب نہیں تو پھر تعلیم کیا ہوتی ہوگی ۔ یہ کہہ دینا آسان ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کا معیار تعلیم بہت پست ہوتا ہے لیکن یہ تہمت کہاں تک درست ہے ان اسکولوں کو بھی وہی سہولتیں فراہم کر دیجیئے جو اچھے انگلش میڈیم مشنری اسکول میں ہیں تو پھر ان طلبہ کا پانچ سال کی تعلیم کے بعد مقابلہ کروادیجئیے ۔ آپ یہ دیکھ کر حیرت میں پڑھ جائیں گے اردو میڈیم طلبہ ان سے کسی طرح کم نہیں ۔ لارڈ بازار میں اردو میڈیم اقامتی اسکول کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے ۔ میٹرک امتحان میں ہر سال ۸۰ فیصد طلبہ فرسٹ ڈیوژن میں کامیاب ہوتے ہیں اور نتیجہ سو فیصد رہتا ہے ۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہاں پڑھانے کی تمام سہولتیں حاصل ہیں ۔

اردو میڈیم کے ساتھ ہی غربت کا سایہ سامنے آجاتا ہے ۔ اس شہر کے محلہ تاڑبن میں گورنمنٹ اردو میڈیم ہائی اسکول ہے جہاں تعداد گیارہ سو سے اوپر ہے ۔ ۳۵ ٹیچرس کی جائیدادیں منظور ہیں لیکن گذشتہ پانچ سال سے صرف تین ٹیچرس اس

اسکول پر کام کرتے رہے ۔ کوئی دو ماہ قبل ہائی کورٹ کے حکم سے ان خالی جائیدادوں کو پر کیا گیا یہ ایک کلاسیکل مثال اردو میڈیم اسکول کی دی جا سکتی ہے ۔

تعلیمی پروگرام:

حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی مساجد اور مکاتب کے ذمہ داروں نے اردو کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ اردو اور دینیات کی تعلیم کا سلسلہ صباحی مدرسوں میں آج ہر محلہ اور بستی میں جاری ہے ۔اس طرح اردو کا رشتہ ہر جگہ بنیادی سطح پر آج بھی باقی ہے ۔ بعض سرپرست اپنے بچوں کو اچھے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھا رہے ہیں لیکن وہ اپنی مادری زبان سے بچوں کو اجنبی رکھنے کے بجائے انہیں گھر پر اردو پڑھا رہے ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ان کی نسل کسی طرح اردو سے اپنا رشتہ جوڑے رکھے ۔

(۱) انجمن ترقی اردو ہر سال ایک ماہ کے لئے اردو ٹیچرس، ان ٹرینڈ اور ٹرینڈ ٹیچرس کے لئے ریفریشن کورس چلائے تو ہر سال کم از کم ۲۰۰ اساتذہ کی تربیت سے اسکولوں میں پڑھائی کے حالات بہت کچھ بدل سکتے ہیں اس سلسلہ میں اسلامک سوشل سرویس نے کوئی ۸۶ ان ٹرینڈ ٹیچرس کے لئے ان گرمائی تعطیلات میں اس قسم کا کورس کا انتظام کیا جس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں ۔

(۲) عابد علی خان اردو تعلیمی ٹرسٹ کا ٹارگٹ ۵ لاکھ کا سرمایہ ہے لیکن اسے ایک کروڑ کے کارپس فنڈ میں تبدیل کیا جائے تو اردو کی تعلیم اور ترقی کے بہت سے کام کئے جاسکتے ہیں ۔ یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے ۔ لیکن اردو کے پریمیوں کو ایک مہم چلانے کی ضرورت ہے تاکہ یہ ٹارگٹ ایک سال کے اندر پورا ہو جائے ۔

(۳) اتر پردیش میں ہمدرد ملت سید حامد صاحب کی قیادت میں ایک تعلیمی کارواں کوئی دو سال قبل نکالا گیا۔ یہی کارواں اب تک ۲۷ اضلاع کا دورہ کر چکا ہے۔ اس کارواں میں پروفیسر، دانشور، ڈاکٹر، انجنیر، ماہرین تعلیم، تاجر صحافی سب ہی شریک تھے۔ مقصد عام تعلیم پر اور اصلاح معاشرہ کے کاموں پر توجہ دینا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں جب تک تعلیم کے کام کو ایک تحریک میں تبدیل نہ کیا جائے اس وقت تک حالات کے بدلنے کی کوئی توقع نہیں۔

(۴) ریاست کے چار اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکولوں میں شرکت کے لئے دو جماعتوں میں ۳۶، ۳۶ ایسے طلبہ نہیں مل رہے ہیں جو چوتھی جماعت کامیاب ہوں اور داخلہ امتحان میں ۱۰۰ میں ۱۵ نمبر لیں۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے جب کہ تلگو میڈیم کے ایک سو سے زائد رہائشی اسکولوں میں شرکت کے لئے اس ضلع کے طلبہ ان نشستوں کے لئے ہر ایک رہائشی اسکول میں داخلہ کے لئے پانچ ہزار سے زائد طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ اس ٹیسٹ میں کامیابی کے لئے خانگی سطح پر ہر ضلع میں کوچنگ انسٹی ٹیوٹس کا جال بچھا ہوا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہمارے ادارے ان طلبہ کی کوچنگ کا انتظام کریں۔ ہر سال طلبہ کی کمی کی وجہ سے پانچ چھ سیٹ خالی رہ جاتے ہیں، دوسرے معنوں میں ان طلبہ کے قحط کی وجہ سے یہ گورنمنٹ اسکول سسک رہے ہیں

(۵) اسی تعلیمی پروگرام کے تحت اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کی غربت اور جہالت کی وجہہ آج لاتعداد بچے جن کی عمریں ۵، ۶ سال کی ہو چکی ہیں وہ معمولی کارخانوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے اور خاندان کی آمدنی بڑھانے میں مصروف ہیں۔ یہ بچے ناخواندہ ہی نہیں بلکہ تعلیم سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جاتے ہیں

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اقبال کا یہ پیام ہم سب کے لئے ہے۔

دیہات کے اسکول

اس قصّہ کے معتبر راوی وجیہ الدین صاحب مرحوم ہیں جو اظہر الدین کرکٹ اسٹار کے نانا تھے ۔ وہ اپنی سروس کے آخر زمانے میں فلک نما ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے اور موصوف سے لوکل ٹرین میں اکثر ساتھ رہتا بڑے خوش مزاج اور زندہ دل آدمی تھے ۔ موصوف کا بیان تھا کہ یہ قصہ خود انھوں نے جناب محمد حسین جعفری صاحب کی زبان سے سنا تھا جو حکومت آصفیہ کے ناظم تعلیمات تھے ہوا یہ کہ ناظم تعلیمات ایک مرتبہ ضلع محبوب نگر کے دورے پر آئے ہوئے تھے انھیں خیال ہوا کہ اچانک کسی چھوٹے سے مدرسہ کا بھی معائنہ کرنا چاہیے ۔ وہ اس بات کو راز میں رکھے رہے دوسرے دن صبح میں مہتمم تعلیمات (ڈسٹرک ایجوکیشنل آفیسر) سے کہا کہ بذریعہ ٹرین ہمیں دیور کدرہ کے تحتانیہ مدرسہ (جس میں چوتھی جماعت تک تعلیم ہوتی تھی) کا معائنہ کرنا ہے ۔ ضلع کے عہدہ دار، کلرک وغیرہ سات آٹھ افراد کا قافلہ بذریعہ ٹرین روانہ ہوا ۔ دیور کدرہ کرنول لائن پر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہے ۔ یہ سب کوئی ساڑھے دس بجے صبح پہنچے ۔ چپراسی آگے آگے بھاگ رہے تھے تاکہ اسکول جاکر اطلاع دیں ۔ دیکھا باہر ایک چپراسی بیٹھا بیڑی پی رہا ہے اور اسکول میں ایک بچّہ بھی نہیں ہے ۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ صدر مدرس اور طلبہ کہاں ہیں لیکن یہ اسے اسکول میں جانے سے روک رہا تھا ۔ یہ کہنے لگا کہ ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) معائنہ کے لیے آرہے ہیں ۔ وہ کہنے لگا کہ ناظر صاحب تعلیمات نے چار برس سے جھانک کر نہیں دیکھا، ناظم صاحب کہاں سے آسکتے ہیں ۔ بہر حال یہ بحث جاری

تھی کہ دور سے اس قافلہ پر اس کی نظر پڑی ۔ چپراسی ہیبت سے اٹھا، اس وقت ناظر تعلیمات بھی اسکول تک پہنچ چکے تھے ۔ دیکھا اسکول خالی ہے اور اجلاس کا دروازہ اندر سے بند ہے ۔ صدر مدرس اور تین مددگار صبح صبح کی میٹھی سیندھی منگا کر جام پر جام نوش کر رہے تھے اور اسکول کو تعطیل دے دی گئی تھی اپنے چپراسی کی وارننگ پر ایک صاحب نے آہستہ سے دروازہ کا کواڑ کھولا اور باہر دیکھا تو پورا قافلہ صحن میں پہنچ چکا ہے ۔ ان کے تو ہوش جاتے رہے ۔ اندر سے دوبارہ دروازہ بند کر لیا اور اجلاس کے پیچھے ایک کھڑکی تھی جس میں سلاخیں نہیں تھیں، وہ چاروں کود کر رفو چکر ہو گیے ناظم تعلیمات غصہ سے لال پیلے ہو رہے تھے اور ضلع کے عہدہ دار اپنی کارگزاری پر سخت پشیمان ۔ اب ایک چپراسی کو کھڑکی سے اندر اتارا گیا، دروازہ کھلا تو ناظم صاحب نے دیکھا میز پر تلے ہوئے مرغ کے اجزائے پریشان بکھرے پڑے ہیں، ایک دو جام آدھے رہ گیے ہیں جو لبوں تک آکر چھوٹ گیے ہیں اور سیندھی کا جام آدھے سے زیادہ خالی ہے ایک دو جام شکستہ پڑے ہیں ۔ ساقی و میخوار غائب ہیں ۔ کیا حال اس میخانے کا تھا ۔ ناظم صاحب اگر صاحب دل ہوتے تو ضرور میخانے کی اس بربادی پر افسوس کرتے ۔

اب ناظر صاحب اور اہل کاران چاروں کی تلاش میں گاؤں میں نکلے یہ چاروں قریب ہی ایک جھونپڑی میں پناہ لیے ہوئے تھے ۔ سامنے ناظر صاحب اور پیچھے یہ چاروں مجرم سر جھکائے ہوئے چلے آرہے تھے ۔ ان کے دل و دماغ پر کیا گزری ہو گی جب انھوں نے یہ دیکھا

"راستے سب بند ہیں ایک کوچۂ قاتل کے سوا"

ادھر ناظم صاحب غصہ سے کانپ رہے تھے ۔ ایک لفظ منھ سے نہ نکلتا تھا ۔

صحن میں پہنچے ۔ یہ چاروں ایک قطار میں کھڑے ہوگیے ۔ بلا کسی اشارہ کے چاروں اپنے کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ کرنے لگے یہ منظر کچھ ایسا تھا کہ ناظم صاحب اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکے ۔ بہت سخت سست کہا، چاروں کا تبادلہ چار سمتوں میں کرنے کے احکام جاری کیے ۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا ۔

راقم ایک چھوٹے سے اسکول پر ہیڈ ماسٹر تھا ۔ قریبی دیہات کے اسکول سے ایک دن ایک اسکول کا چپراسی آیا اور کہنے لگا کہ ہیڈ ماسٹر کی شکایت پر ناظر تعلیمات نے ایک روپیہ جرمانے کی سزادی ہے ۔ واقعات یوں تھے کہ دو مددگار باری باری سے ہر ماہ دس، دس دن کے لیے اپنے گاؤں چلے جاتے اور صدر مدرس ۲۰ دن غائب رہتے ۔ اس طرح " رخصت اتحادی " کا معمول تھا ۔ ایک مرتبہ اس چپراسی نے تین یوم کی رخصت لی اور پندرہ دن اسکول سے غائب رہا ۔ صدر مدرس نے اس سے جواب طلب کیا اس نے جواب میں لکھا کہ آپ سب اپنی رخصت خاص ہر مہینہ چلاتے ہیں ۔ آخر بندہ کا بھی کچھ حق ہے ۔

ایک مڈل ٹرینڈ ٹیچر کا تبادلہ ترقی پر دور دراز کے دیہات پر ہوگیا ۔ جہاں پہنچنے کے لیے صرف بیل گاڑی کا راستہ تھا ۔ ناظر صاحب کے لیے گھوڑے کا انتظام کرنا پڑتا تھا اس ٹیچر نے ایک ہوشیار لڑکے کو مانیٹر بنایا اور اپنے دستخط کرنا سکھلادیا ۔ یہ لڑکا استاد کا خاص شاگرد نکلا وہ اپنی چھڑی کے زور پر اسکول چلاتا ۔ گاؤں کے پٹیل پٹواری سے اس ٹیچر نے رسم وراہ بڑھائی اور ایک سال کے لیے حیدرآباد آکر کسی اور ٹریننگ میں شریک ہوگیے ۔ ہر ماہ جاتے اپنی تنخواہ اور سب کا معمول ادا کرکے واپس آتے ۔ اس طرح اس ٹیچر نے دو سال اس گاؤں کے بچوں کی خدمت کی ۔

۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ سنگاریڈی بیسک ٹریننگ اسکول میں مجھے بحیثیت لکچرار

کام کا موقع ملا۔یہاں پر ایک اردو میڈیم سیکشن کھولا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ کے بعد سے ان اردو اساتذہ کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔چنانچہ بہت سے سینیر استاد آکر شریک ہو گیے۔ ان چالیس اساتذہ میں صرف ایک صاحب میٹرک کامیاب تھے۔ باقی سب کے سب منشی، عالم، فاضل، مولوی، ادیب دبیر وغیرہ تھے دو اصحاب تو شملہ باندھ کر آتے اور داڑھیاں بھی کہیں کہیں سفید ہو چکی تھیں۔انھیں اپنا شاگرد دیکھتے شرم آتی تھی، کیونکہ یہ لکچرار ان کے سامنے بچہ تھا، مگر انھیں پڑھانا شراب طہور پینے سے کم نہ تھا کیونکہ ان سے بہت سیکھا اور یہ دو سال اپنے پیشے کے بہت زرخیز رہے۔انھیں ایک دن ایک مضمون لکھنے کو دیا:

"بحیثیت مدرس میرے تجربات۔"...... ایک صاحب نے لکھا کہ جس گاؤں میں ان کا تقرر ہوا تھا وہاں کوئی اسکول کی عمارت نہیں تھی۔عاشورخانہ برسات میں گر چکا تھا اور مندر کا صحن بھی ٹوٹ چکا تھا۔اس مندر کے دیوتا بھی فرش پر سو رہے تھے۔ گاؤں کے پٹیل کے مکان میں جانوروں کی ڈڈّی تھی جہاں پر ایک کونے میں چالیس پچاس بچے پڑھنے آتے۔ مصیبت یہ تھی کہ یہاں بیل بھینس بھی بندھے ہوتے۔ایک مرتبہ ناظر صاحب معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ مدرس نے شکایت کی کہ ان جانوروں کے درمیان پڑھانا اور بچوں کی حفاظت کرنا مشکل ہے۔ مدرسہ کے لیے کوئی دوسرا انتظام ہو تو اچھا ہے۔ناظر تعلیمات نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "ٹیچر بچوں کے ساتھ بیلوں کی بھی نگرانی کرے۔میں نے اس مضمون کے حاشیہ پر لکھا:
"ناظر صاحب بھی بیل تھے۔"

۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ پروفیسر غیاث الدین صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے بی ایڈ کالج میں کام کرتے تھے۔باہر کی بہت سی ڈگریاں رکھتے تھے۔موصوف نے ایک

مرتبہ قصہ سنایا کہ وہ ابتدائی ملازمت میں کسی دیہات کے اسکول پر معائنہ کے لیے گئے۔ دیکھا بچے کھیل کود میں مشغول ہیں اور ٹیچر غائب ہے۔ اپنے آدمی سے کہا کہ دیکھو ٹیچر کہاں ہے۔ وہ واپس آیا اور کہا:

"وہ حجامت بنا رہا ہے۔"

صاحب نے پوچھا:

"خود کی حجامت بنا رہا ہے یا دوسروں کی۔"

"دوسروں کی۔"

"اچھا تو وہ اپنے پیشہ پر قایم ہے۔"

صدر مہتمم تعلیمات، ڈی۔ آر۔ ترکی (ایم، اے ایڈنبرا) کا نام پرانے لوگوں کو یاد ہوگا۔ ۱۹۵۱ء میں یہ جڑچرلہ اسکول کے معائنے کے لیے تشریف لائے جہاں پر یہ راقم ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ اونچے پورے، گورے چٹے پارسی، خوش پوشاک سوٹ، بوٹ میں ملبوس تھے۔ اپنا اسکول دکان، مکان میں تقسیم تھا۔ انہیں ایک چھوٹے سے مکان کے اسکول میں لے گیا۔ کویلو کی چھت تھی اور دن میں آسمان کے تارے نظر آتے تھے ترکی صاحب کا معائنہ تین دن کا تھا۔ وہ اس مکان کے ایک کمرے میں داخل ہوئے اور جھٹ سے باہر نکل آئے:۔

"اس اسکول میں، میں اپنے مویشی بھی باندھنا پسند نہیں کروں گا۔" دو دن ڈاک بنگلہ میں قیام رہا اور پھر معائنہ کا نام نہیں لیا۔

یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا اگر ہم ان ٹیچروں کا تذکرہ نہ کریں جنھوں نے اس گاؤں کی آبادی کی خدمت کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی ایسے لوگوں کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ ان کے نام آبادی کے لوگ بڑی عزت سے لیتے ہیں۔ یہاں پر

بے ساختہ انگریز شاعر گولڈاسمتھ کی شاہکار نظم ۔ " DESERTED " " VILLAGE اجڑا گاؤں " کا خیال آتا ہے جب کہ اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے دوران دیہات کے لوگ محنت مزدوری کے لیے گاؤں چھوڑ کر کارخانوں کا رخ کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے دیہات ویرانوں میں تبدیل ہوتے گیے اس عظیم شاعر نے اسکول ٹیچر کی تصویر کھینچی ہے اس گاؤں کا بھی تو ایک ٹیچر تھا جو زمینوں کی پیمائش بھی کرتا درخواستیں بھی لکھتا اور حساب کتاب بھی کرتا اور گاؤں والے اس کو حیرت سے تکتے ۔

"THAT ONE SMALL HEAD COULD CARRY ALL HE KNEW" " اس کے اتنے چھوٹے سے سر میں یہ ساری باتیں کیسے سما گئیں ۔ " اس قسم کے پرانے قصے آپ کے حافظے میں بھی ہوں گے آزادی کے چالیس برس بعد بھی دیہات کے اسکولوں کا حال اچھا نہیں ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ حالات میں کچھ سدھار ضرور آرہا ہے اور تبدیلیاں بھی آرہی ہیں مگر ہمارے سامنے جو معیار ہے اس تک پہنچنے کے لیے بہت عرصہ درکار ہوگا شہری آبادی کو اس کا اندازہ نہیں ہے ۔ گرام پنچایت سے لے کر ممبران پارلیمنٹ تک ۹۰ فی صد لیڈر سب کے سب ان ہی دیہات کے اسکولوں میں پڑھ چکے ہیں ۔ وہ ان حالات سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن وہ کبھی اس حالت زار کا تذکرہ تک نہیں کرتے ۔ وہ اپنے ہی ماضی قریب سے منھ پھیر چکے ہیں ۔

جدید قومی تعلیمی پالیسی کے ایکشن پروگرام (۱۹۸۶ء) میں بڑے کام کی بات " آپریشن بلیک بورڈ " کی اسکیم ہے ۔ اس پروگرام کے تحت تمام یک مدرسی مدرس ، ڈبل ٹیچر اسکول ہوجائیں گے جن کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار ہے ۔ یہاں پر ایک

لیڈی ٹیچر ضروری ہو گی ۔ دو کمرے بڑے پکے ہوں گے ، فرش سیلو کا ہو گا اسٹیشنری کے لیے کچھ رقم بھی منظور ہو گی اور یہ ساری اسکیم ۱۹۹۵ء تک مکمل کر لی جائے گی لیکن اس کی توقع بہت کم ہے ۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ تین سال میں صرف ۲۵ ہزار اسکولوں تک یہ اسکیم پہنچ سکی ہے اور اس سے اس ٹارگٹ کی ناکامی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن اور جدید قومی تعلیمی پالیسی کے ماہرین تعلیم نے ملک کی قومی آمدنی کا صرف ۶ فی صد تعلیم کے لیے مانگا ہے جب کہ تعلیم پر قومی آمدنی کا صرف ۲ فی صد خرچ کیا جاتا ہے ۔ یہ مطالبہ بہت کم ہے لیکن قوم اس کے لیے بھی تیار نہیں ہے ۔

غریب طلبہ ـــــ تعلیم نے جنھیں بلند کردیا

حیدرآباد میں کاچی گوڑہ اسٹیشن روڈ پر ایک محلہ لنگم پلی ہے جس کے ایک کونے پر میونسپلٹی کا ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔" ڈاکٹر بھومناؒ لین " ڈاکٹر بھومناؒ کو انتقال ہوئے کوئی دس پندرہ برس ہوچکے ہوں گے۔ یہ اپنے زمانہ کے مشہور ہومیوپیتھک ڈاکٹر تھے۔ سارے شہر میں ان کا چرچا تھا۔ دوائیں مفت دیتے۔ معلوم نہیں فیس یا خرچ کس سے لیتے اپنے کالج کے زمانہ میں ان کے پاس سے دوائیں لاتا کیوں کہ مفت کا سودا تھا۔ سنتے تھے کہ ہاتھ میں شفاء ہے ان کا بچپن بڑی غربت اور تنگی کا تھا۔ ڈاکٹر حامد نواز جنگ کہتے تھے کہ یہ اپنے اسکول کے زمانہ میں راتوں میں اسٹریٹ لائٹ کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے۔ ساتویں جماعت سے ایک طالب علم بالریڈی میرے ہم جماعت تھے وہ اپنے دیہات سے چھ دن کے لیے جوار باجرہ کی روٹیاں اور کچھ چٹنی اچار ساتھ لاکر تعلقہ مستقر کے مڈل اسکول کے ایک ٹیچر کے مکان میں رہتے۔ ان ہی خشک روٹیوں پر ان کا گذارہ تھا۔ ڈسٹرکٹ کے ایک ہائی اسکول میں جب نویں جماعت میں شریک ہوئے۔ سارے طلبہ اور اساتذہ پر ان کی ذہانت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ابھی یہ نویں جماعت میں تھے۔ میٹرک کی جنرل اور اعلیٰ ریاضی کی کتابوں کا پورا حل اپنی نوٹ بک میں تیار کرلیا تھا۔ انگلش اردو ہوم ڈکشنری، اے، ٹو زیڈ پوری زبانی یاد تھی۔ کم از کم تین ہزار الفاظ تو ہوں گے۔ کہیں سے آپ کوئی لفظ پوچھ لیں۔ اس کے معنی مطلب استعمال سب حاضر۔ اس کمپیوٹر کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اپنی غرض کے مارے ہم سب ان کی دوستی کا دم بھرتے۔ میٹرک کے امتحان میں اول آنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج میں داخلہ ملا۔ تیسرے سال،

مسلسل غربت اور فاقوں کا شکار ہو کر یہ ذہین طالب علم دق کے مرض میں گرفتار ہو گیا ۱۹۴۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔اس خبر کو سن کر کچھ دیر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ اگر زندہ رہتا تو ہندوستان کا مشہور انجینئر ہوتا یا پھر دوسرا سر ویشویشوریّا۔" حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گیے " نہ معلوم غریب ماں باپ پر کیا گزری ہوگی یہ اگر زندہ رہتا تو اس کے خاندان اور چھوٹے سے گاؤں کی قسمت بدل جاتی ۔ نہ معلوم اس کی ہستی ملک اور قوم کے لیے کتنی فیض رساں ہوتی ۔

ایک اور غریب ذہین طالب علم سے اپنی گاڑھی چھنتی تھی چھٹی جماعت میں تھے ہیڈ ماسٹر ڈسپلن کے بہت پابند تھے ۔انھوں نے پانچویں جماعت سے سب طلباء کے لیے نیلی شیروانی یا کوٹ اسکول یونیفارم لازمی کر دیا یہ دراصل عثمانیہ یونیورسٹی کے یونیفارم کی نقل تھی اس زمانہ میں شیروانی دو روپے آٹھ آنہ میں سلائی کے خرچ کے ساتھ تیار ہو جاتی تھی ۔اسی زمانہ میں ریاست حیدرآباد کے ناظم تعلیمات ڈائرکٹر آف ایجوکیشن جناب سید علی اکبر کے معائنہ کا پروگرام آگیا پھر کیا تھا سب طلباء نے جلد جلد شیروانیاں سلوائیں ۔جس دن انسپکشن تھا یہ ایک طالب علم، وہی سادہ لباس میں تھا ۔ٹیچر نے جب دیکھا کہ یہی ایک ساری کلاس کا " شو " بگاڑ رہا ہے ۔تو اسے اسکول سے باہر چلے جانے کے لیے کہا وہ سر جھکائے کچھ دیر کلاس میں کھڑا رہا اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک گیئے اور وہ باہر چلا گیا اسکول سے دور اکیلا بیٹھا آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا۔اگر مبالغہ نہ سمجھو تو یہ طالب علم عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی منزل پیٹ کے بل گھسیٹتے ہوئے پار کیا ۔ یہ چاہتا تھا کہ اعلیٰ ریاضی مضمون اختیاری کے طور پر لے ، تو ٹیچر نے کہا کہ انجینئرنگ کالج میں ایک کمپاس خریدنا پڑتا ہے جس کی قیمت ستر روپے ہوتی ہے ۔ تم خرید نہیں سکتے اس طرح اس کی زندگی کی لکیر درمیان ہی سے

کٹ گئی۔

میرے ساتھ ایک اور طالب علم نائی برادری کا پڑھتا تھا جو اپنے ساتھیوں کی اور اسکول کے طلبہ کی حجامت بناتا تھا ایک آنے دو آنے میں ہماری اچھی حجامت ہو جاتی تھی۔ یہ قابل فخر طالب علم حجامت کے بیاگ کے سہارے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ پھر ہم بچھڑ گئے بہت دن بعد کاچی گوڑہ اسٹیشن پر ایک پولیس انسپکٹر میری طرف مسکراتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ دیکھا یہ وہی اپنا ساتھی ہے جو کلاس میں ہم سب کے مذاق کا مرکز تھا۔ ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ آٹھ اضلاع میں کوئی ایک بھی نائی برادری یا بیاک ورڈ کلاس میں میٹرک کامیاب نہ تھا۔ بس انہیں پولیس عہدہ دار کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ وہ اسٹنٹ کمشنر پولیس کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہو گیے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک سینیر طالب علم تھے۔ جنھوں نے ایم ایس سی اچھے درجہ سے کامیاب کر لیا تھا ان کے والد ایک لکڑی کی ٹال میں مزدور تھے یہ محض ٹیوشن کی آمدنی پر اتنا سب کچھ کر لیا تھا۔ جب یہ پاس ہو گیے تو حیدرآباد کے بہت سے امیر کبیر انھیں اپنی دامادی کا شرف عطا کرنے کے لیے تیار ہو گیے ان کی شادی ایک اونچے گھرانے میں ہوئی۔ ریاست حیدرآباد کے اسکالر شپ پر انگلینڈ گیے۔ کوئی اچھی ڈگری لے کر واپس ہوئے۔ جب تک ملک دو گھروں میں بٹ چکا تھا۔ یہاں پر ان کی پذیرائی نہیں ہوئی پاکستان چلے گیے۔ وہاں پر بہت بڑے عہدہ پر فائز ہوئے۔ کوٹھی پر کاریں، اور سترہ نوکر چاکر تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگؒ نے اپنے ایک دلچسپ مضمون "نذیر احمد کی کہانی، میری زبانی" میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ نذیر احمد ایک نہایت ہی غریب طالب علم تھے تعلیم کا شوق تھا دہلی کی کسی مسجد میں کوئی مولوی صاحب بچوں کو پڑھاتے تھے۔ یہ بھی وہیں

بیٹھ گئے مولوی صاحب نے دیکھا کہ لڑکا غریب ہے اور ذہین بھی ہے۔ اپنی خدمت میں رکھا وہ دن رات مولوی صاحب کی خدمت میں رہتے مولوی صاحب کے لیے ایک امیر کے گھر سے کھانا مقرر تھا جب یہ ان صاحب کے گھر جاتے تو ان صاحب کی لڑکی کو شرارت سوجھتی وہ ان کے کان پکڑ کر انہیں چٹنی مصالحے پیسنے کے لیے بٹھا دیتی۔ قدرت کی کرنی ایسی ہوئی کہ جب یہ بڑے ہوئے تو ان کے علم و فضل کی سارے شہر دہلی میں دھوم مچ گئی اور پھر اسی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی جو ان سے بچپن میں مرچ مصالحہ پیسنے کی مشقت لیتی تھی۔

یہی حال ہر غریب طالب علم کا تھا جو کچھ پڑھ کر اوپر آگیا وہ صاحب ثروت وشوکت، نواب اور زمیندار اسے اپنی دامادی کا شرف عطا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے بلکہ اس کو پھانسنے کے لیے جال بچھائے جاتے۔ اکبر الہ آبادی نے اس حال کی سچی تصویر کھینچی ہے۔ کہا مجنوں سے لیلیٰ کی ماں نے

بیٹیا اگر کرلے تو بی اے پاس
بے دھڑک بن جاؤں میں تیری ساس

اس طرح یہ غریب طالب علم ایک ہی جست میں غریبی کے غار کو پار کر جاتے لیکن اس کا ایک نقصان تو یہ ہوتا کہ وہ بڑے گھر کی بیوی کے احسانات میں دب جاتا اور پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے خاندان ہی سے کٹ گیا لیکن بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے ماضی کو ایاز کی طرح یاد رکھا اور اپنے خاندان کی بھلائی کے لیے بہت کچھ کیا۔

گزشتہ دو سال سے مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی (حیدرآباد) کے سکریٹری جناب

کے ایم عارف الدین نے ایک نہایت ہی قابل تعریف کام شروع کیا ہے وہ ہر سال ایسے مسلم طلبہ کو جو کبھی اعلیٰ امتحانات میں اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہو انھیں گولڈ میڈل دیئے جاتے ہیں۔اس کے لیے بہت اعلیٰ پیمانہ کی تقریب منعقد کی جاتی ہے ملک کے دانشور مدعو کیے جاتے ہیں ۱۹۸۹ء میں ضلع کرنول کے ایک تلگو میڈیم رزیڈنشیل اسکول کا ایک مسلمان طالب علم ریاست آندھرا پردیش کے میٹرک پبلک امتحان میں اول درجہ سے کامیاب ہونے والا طلبہ کی فہرست میں سرفہرست تھا۔یہ جب اپنے باپ بھائی کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کے لیے آیا تو اس کے پیر میں چپل بھی نہیں تھے۔معلوم ہوا کہ خاندان کی آمدنی کا ذریعہ صرف ڈھائی ایکڑ زمین ہے اس کے لیے مزید ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے لیے معقول وظیفہ بھی جاری کر دیا گیا جو حضرات اس مضمون کو پڑھ رہے ہوں گے ان میں بعض خود بھی اپنے زمانہ طالب علمی میں اس دور غربت سے گزر چکے ہوں گے۔ بعض کے تجربہ میں ایسے غریب و ذہین طلبہ کی بھیانک تصویریں ضرور ہوں گی۔ افسانوں اور تاریخ کے صفحات پر ایسی سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔ان سب کا حال سن کر فطرتاً سب کو ترس بھی آتا ہوگا۔لیکن یہ اپنے زمانہ طالب علمی میں کسی کے رحم و کرم کے طالب نہیں ہوئے۔اپنی خودداری کو قائم رکھا اور زمانہ کے بے حس سماج اور گردش ایام کی چکی میں پس گئے اور اپنے لیے زندگی میں کچھ مقام پیدا کر لیا۔

ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جو منزل کا پتہ نہ پاکر راستے میں تھک ہار کر بیٹھ گیے۔کس حسرت سے وہ دوسروں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے رہے پھر ان کا کیا ہوا وہ کہاں غائب ہوگیے کچھ نہیں معلوم۔ان میں کچھ ہیرے جواہرات بھی تھے جو صحرا کے کنکر پتھر میں گم ہوگیے بس ہمیں اپنی کامیابی اور زندگی میں ترقی کی فکر رہی وہ ہمیں

دور سے دیکھ کر اپنی محرومیوں پر غمزدہ ہوتے رہے کبھی وہ ہم سے ملے تو ایسے کہ کبھی وہ ہمارے ساتھ نہ تھے اور نہ انھیں وہ دھول دھپا یاد رہا۔ وہ ہم کو اونچا مینار سمجھتے اور اپنے کو اس کا سایہ۔

ان میں کچھ گوہر شاہوار ایسے بھی رہے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب چھپ گئیں تہہ میں سمندر کی

(طباطبائی)

خشونت سنگھ نے "سنڈے" ماہ دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں -- (صفحہ ۱۹ پر "برہمن طاقت" (BRHAMIN POWER) کے عنوان سے چند دلچسپ اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہر محفل میں مجھے اسکی کھوج رہتی ہے کہ یہاں کس ذات کے کتنے لوگ کس حیثیت کے جمع ہیں جہاں کہیں دیکھتا ہوں برہمن کا بول بالا ہے۔

WHATEVER BE THE SPHERE OF CURIOSITY, LITERARY, SCIENTIFIC AND BEAURACRATIC BRAHMIN THE TOP DOG.

(Khushwant Singh = Sunday Dec 1990)

۱۹۸۲ء کے ایک سروے کے مطابق آبادی میں ان کا تناسب صرف ساڑھے تین فی صد ہے لیکن یہ ملک کی اعلیٰ ترین (۷۰) فی صد جائیدادوں پر قابض ہیں۔ سینٹرل سیول سروس آفیسرس میں جو ڈپٹی سکریٹری اور پھر اس سے اوپر کی ۵۰۰ جائیدادوں میں ۳۱۰ برہمن تھے۔ ۲۶ اسٹیٹ چیف منسٹرس میں ۱۹ برہمن ۲۷ گورنر اور لفٹنٹ گورنرس میں ۱۳ برہمن تھے۔ سپریم کورٹ کے ۱۶ ججوں میں ۹ برہمن، وائس چانسلرس ۵۰ برہمن،

۴۳۸ ڈسٹرکٹ ججس میں ۲۵۰ برہمن ، ۳۳۰۰، آئی ۔اے ایس آفیسرس میں ۲۳۷۶ برہمن
پارلیمنٹ کے ۵۳۰ ممبروں میں ۱۹۰ برہمن ، راجیہ سبھا کے ۲۴۴ ممبروں میں ۸۹ برہمن

دیکھ مسجد میں شکست رشتہ تسبیح شیخ
اور بتکدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

اقبال نے شیخ و برہمن کا موازنہ ایمان و عقیدہ کی پختگی کی میزان میں ضرور کیا ہے لیکن علم کے میدان میں شیخ جی کو برہمن کی ہمسری کے لیے کوئی ایک سو برس لگ جائیں گے ۔اس وقت تک وہ پختہ زنّار کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے گا ۔ نہیں معلوم بظاہر برہمن طبقہ دان دھرم پر ہی زندہ رہا ۔ان کا شمار آزادی سے پہلے غریب طبقات ہی میں ہوتا تھا لیکن انھوں نے علم کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ۔ حکومت و شوکت (چھتری) دولت و معاش (ویش) جیسی پر کشش چیزوں کو دوسرے طبقات کے لیے چھوڑ دیا جب ہندوستان آزاد ہوا تو حکومت کے کل پرزے یہی پڑھے لکھے اور قابل لوگ ہی ہوسکتے تھے آزادی کے ساتھ ہی ہر محکمہ میں ہزاروں جائیدادیں ابل پڑیں اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے پارسی اور برہمن رہ گئے جو ساری آبادی کا بس دو چار فی صد تھے ۔اس میدان میں کوئی ان کا رقیب ہی نہ تھا اور تعلیم میں ان کا اوسط ۱۰۰فی صد کے قریب تھا۔

وہ لوگ ان کے مقابلہ پر آہی نہیں سکتے جو بڑی دیر سے بیدار ہو کر آنکھیں ملنے لگے ہیں اور کچھ چلنے بھی لگے ہیں ۔ یہ جو کچھ مسلم طبقہ کا حشر ہوا وہ ہمارے دولت مند طبقہ ، لیڈر ، رہنمایان قوم اور علمائے دین کی بے حسی اور سخت غفلت کا نتیجہ تھا ۱۹۲۱ ۔

ہی میں،ہوش مندوں کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان پچاس برس میں آزاد ہو جائے گا آزادی کے بعد صرف اسی طبقہ کو فائدہ پہنچے گا جو حکومت کی مشنری چلانے کا اہل ہو اگر ایسا کوئی پلان پچاس برس پہلے بنایا جاتا کہ قوم کا کوئی فرد ان پڑھ نہ رہنے پائے تو آج مسلمان اس زبوں حالی میں گرفتار نہ رہتے ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط فی صد چھ سے بھی کم تھا تقسیم کے بعد حکومت میں بھی ان کا حصہ ہمیشہ کے لیے تقسیم ہو گیا ۔پڑھے لکھے مسلمان سب کے سب پاکستان منتقل ہو گئے اور جو رہ گئے پڑھنے لکھنے میں صفر رہ گئے ۔یہ نحوست و افلاس تقدیر کا نہیں بلکہ تعلیم سے دوری ؛ جہالت اور غفلت کا نتیجہ ہے ۔ساڑھے تین فی صد برہمن آبادی کا ملک کی ۷۰ فی صد اعلیٰ ترین جائیدادوں پر آزادی کے بعد سے مسلسل قابض رہنا ملک کے جمہوری نظام کا حیرت انگیز کرشمہ ہے ۔اب اس زنجیری سلسلہ کے ٹوٹنے کی بہت کم توقع ہے ۔

پنڈت نہرو سے کسی نے پارلیمنٹ میں شکایت کی کہ حکومت میں جنوبی ہند کی نمائندگی بہت کم ہے پنڈت جی نے جواب دیا کہ ہمارے سنٹرل سکریٹریٹ میں ٹائیپسٹ سے لے کر سکریٹری تک ساری جائیدادوں پر سب کے سب مدراسی اور جنوب کے لوگ قابض ہیں ۔سچ پوچھو تو حکومت ان ہی کے ہاتھوں میں ہے ۔غریب امیر طالب علم کا فرق محض ظاہری لباس اور چند آسائشوں سے ہے ۔لیکن جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے وہاں سب برابر ہیں بشرطیکہ ان غریب طالبہ کو تعلیم حاصل کرنے کی ساری سہولتیں نصیب ہوں ۔ہمارے سماج نے بہت ہوشیاری سے انھیں جاہل رکھا ہمارے علم میں بعض ایسی مثالیں ہیں کہ بعض دیہات میں سرکاری اسکول کھولے گیے ۔وہاں کے ویسماکھ زیندار نے اسکول کے ٹیچر کو گاؤں سے بھگا دیا ۔البتہ اس کی تنخواہ کا انتظام کر دیا کہ وہ ہر مہینہ آکر اپنا وظیفہ حاصل کرتے ۔انہیں یہ خوف تھا کہ

یہ غریب بچے پڑھ لکھ کر ہوشیار ہوجائیں گے تو پھر یہہ جانور ہمارے قابو سے باہر ہوجائیں گے۔ جن کی دم صدیوں سے ان کے ہاتھ میں رہی تھی۔

۱۹۴۱ء میں گورنمنٹ کی جانب سے ایک کشمیری پنڈت مورخ کو کشمیر کے دیہات کے اعداد و شمار جمع کرنے کا موقع ملا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سارے ہی دیہات مسلمانوں سے آباد ہیں لیکن ان میں ایک بھی پڑھا لکھا نہیں ہے حیرت تو اس بات پر ہے کہ بعض مسلمان چرواہے بارہ کے عدد تک اپنی بھیڑوں کو گن نہیں سکتے۔ آج بھی ان میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط ۱۰% فی صد ہے جب کہ یہ آبادی کا ۸۵ یا ۹۰ فی صد ہیں۔ دس فی صد دوسرے پڑھے لکھے لوگ ۷۶ فیصد جائیدادوں پر قابض ہیں۔ "اندھیر ہورہا ہے بجلی کی روشنی میں۔"

ہمارے اطراف و اکناف میں بہت سے غریب اور ذہین طلبہ تھوڑی سی تلاش کے بعد مل جائیں گے۔ انہیں ایک مہم اور پروگرام کے تحت اسکولوں میں شریک کروانا ان کے لیے کاپی کتابوں کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ یہ کام ایک فرد ایک طالب علم ہی کے لیے کیوں نہ ہو کرلے یا کوئی تعلیمی اداروں کے توسط سے بھی اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔ ایجوکیشن سوسائٹی اور مسجد کی کمیٹیاں صاحب ثروت لوگ محدود پیمانے پر یہ کام کرسکتے ہیں۔ ذاتی تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ غریب لوگ اپنے بچوں کو لے جاکر فارم بھرنے شریک کروانے سے گھبراتے ہیں۔ انہیں سمجھانے اور ان میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سی دینی، سیاسی اور ملی جماعتیں کام کررہی ہیں۔ ان سب کے ہاں لازماً ایک تعلیم کا شعبہ ہونا ضروری ہے۔ جو چند مخلص ہمہ وقتی کارکنوں کے ہاتھ میں ہو۔ ریاستی اور مرکزی سطح پر مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ قائم کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ جس کا ایک بنیادی مقصد غریب اور ذہین طلباء کی تعلیم کا بھر

پورا انتظام کرنا ہوگا۔ دوسرے اور کئی تعلیمی کام بھی ہیں جن کی افادیت سے انکار نہیں

خانگی اعلیٰ تعلیم کے کالج اور پیشہ وارانہ فنی تعلیمی ادارے جیسے میڈیکل اور انجینیرنگ کالجس یا ٹرینگ کالجس میں ان میں غریب طلبہ کے لیے دس فیصد کی حد تک نشستیں محفوظ کر دیں اور انہیں فیس وغیرہ کے اخراجات سے آزاد کر دیں تو ان میں بہت سے قابل لوگ نکل آئیں گے۔ تعلیم ہی ایک ایسی جوہری طاقت ہے۔ جو فرد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی پوری قوت کے ساتھ آزاد کر دیتی ہے۔ جیسے کسی پہاڑی چٹان سے چشمے پھوٹ کر جاری ہو جاتے ہیں۔

اسرائیل کی ترقی کا راز۔۔۔۔ تعلیم

یہودی ساری دنیا کی آبادی کا ایک حقیر ترین حصہ ہیں یعنی آج ان کی آبادی ۶۰ لاکھ سے زیادہ نہیں اور اسرائیل کا رقبہ ہماری، ریاست کے ایک ضلع محبوب نگر کے مساوی ہوگا۔ اس چھوٹے سے ملک کے اطراف عرب آبادی دس کروڑ سے زائد ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ ہی سے ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات شرارت، سرکشی زبان درازی اور عدول حکمی رہا ہے۔ یوروپی ممالک میں ہر جگہ یہودی بڑی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے کوئی چار ہزار برس تک یہہ راندہ درگاہ قوم اپنا کوئی ملک یا وطن نہیں بنا سکی۔ ان کے خلاف نفرت و حقارت کی شدت کا اظہار نازی جرمنی کے ہٹلر کے رویہ سے ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس نے کوئی ساٹھ لاکھ یہودیوں کو گیس چمبرس میں بند کر کے ہلاک کر ڈالا۔ ان کے مکر و فریب، سخت دلی و سنگدلی، لالچ اور روپیہ کی حرص و آرزو کو ولیم شکسپیر نے شیلاک SHYLOCK کے روپ میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں معاہدہ بالفور کے ذریعہ انگریزوں کی چالاک سیاست کی وجہہ فلسطین کی سرزمین "اسرائیل" کے نام سے دنیا کے یہودیوں کو جا بسنے کے لئے HOME - LAND دیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں اس نوآبادی میں ان کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ ان میں ہر پچاس نفوس میں ایک ڈاکٹر تھا۔ انہوں نے دنیا کے سارے ممالک کو تار بھیجا کے ڈاکٹر زیادہ ہیں مریض بھیجیئے۔ ساری عرب آبادی جو دس کروڑ کے قریب ہے ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ اس صحرائے سینا کو ان کے

ماہرین زراعت نے تھوڑے ہی عرصہ میں سرسبز و شاداب علاقہ میں تبدیل کر دیا جو دنیا کے ماہرین سائنس کے لئے ایک حیرت انگیز کارنامہ سے کم نہیں ۔ آج یہودی ساری دنیا کی سیاست، دولت، معیشت اور ذرائع ابلاغ پر اثرانداز ہیں ۔ یہ سب کچھ ہر شعبہ حیات میں ان کے علم و فن میں ان کی غیر معمولی فضیلت کا نتیجہ ہے ۔ سائینس ٹکنالوجی، سماجی علم طب اور انجنیرنگ میں اس قوم کے ماہرین بے حساب ہیں ۔ نیوٹن اور آئن سٹائن بھی یہودی تھے ۔ دنیا کا سب سے بڑا علمی اعزاز نوبل انعام پانے والے ۷۰ فیصد یہودی ہیں اور باقی حصہ میں ساری دنیا کے سائنس دان ادیب آتے ہیں ۔ اس طرح یہہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ وہ بجا طور پر زمین کا نمک SALT OF THE EARTH کہلائے جانے کے مستحق ہیں ۔ ان کی محنت، جفاکشی، ذہانت و فضیلت علمی میں آج شاید ہی کوئی قوم ان کے مقابلہ پر آسکتی ہے ۔

کوئی ۳۰ برس قبل کی بات ہے کہ ڈاکٹر عباس ندوی کا ایک مراسلہ " صدق جدید میں شائع ہوا تھا جب کہ وہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں ایک یہودی مستشرق پروفیسر کی زیر نگرانی اسلامیات میں اپنے ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہے تھے ۔ ایک دن یہودی پرفیسر نے دیکھا کہ عباس ندوی ظہر کی نماز ایک چھوٹے سے کمرہ میں ٹیبل ہٹا کر پڑھ رہے ہیں ۔ وہ دوسرے ہی دن ان کے لئے مستقل نماز کی جگہ کا انتظام کر دیا ۔"

ایک دن ڈاکٹر عباس ندوی نے سوال کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ کی قوم میں اعلیٰ ترین دانشور، پروفیسر، سائنس داں اور ڈاکٹر وغیرہ موجود ہیں ۔ آخر اس کا راز کیا ہے پروفیسر نے جواب دیا کہ اگر کسی قوم کا طالب علم (۱۰۰) نمبر کا پرچہ حل کرتا ہے تو اس کو پورے (۱۰۰) نمبر دیتے ہیں ۔ اگر کوئی یہودی طالب علم (۱۰۰) نمبر کا پرچہ حل

کرے تو اس کو ہم (۹۰) نمبر دیتے ہیں۔ اس کو (۱۰۰) نمبر لینے کے لیئے (۱۱۰) نمبر کا پرچہ حل کرنا پڑے گا تاکہ وہ اپنا اعلیٰ علمی معیار برقرار رکھ سکے۔

تعلیم کی جو اہمیت ان کے ہاں ہے وہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں شائع شدہ ایک مضمون (۵/ نومبر ۹۵ء) سے ہو جائے گا جو مرزا شکور بیگ (حیدرآباد) تل ابیب "میرا وطن" کے عنوان سے لکھا ہے اس مضمون میں جو بات غور کرنے کی ہے وہ اس ملک میں تعلیم کی اہمیت اور اس کا معیار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہاں خدا کے بعد تعلیم کو درجہ دیا جاتا ہے۔ تعلیم خدا کی نعمتوں کی طرح فری ہے۔ تعلیم کے معاملہ میں ہر شہری عابد علی خان ہاشم علی اختر اور پروفیسر حامد ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ساری دنیا کے یہودیوں نے یروشلم میں ایک عبادت گاہ کی تعمیر کے لئے ایک بلین امریکی ڈالر کا چندہ جمع کیا۔ (یہہ رقم ہندوستانی سکہ میں 3300 کروڑ روپے کے مساوی ہوتی ہے) جب یہ رقم اسرائیل کے دینی پیشوائے آعظم CHIEF RABBI کو نذر کی گئی تو اس کے الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ساری دنیاؤں کے مالک ہیں۔ ساری شان وشوکت اس کے لئے ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں جو اس کے لئے ایک بلین ڈالر جیسی حقیر رقم کا محل تعمیر کرنے والے۔ اس کی بندگی تو ہر جگہ سوتے جاگتے کی جا سکتی ہے۔ خدا کو جاننے کے لئے علم ضروری ہے۔ جاؤ اس سے ایک تعلیمی ٹرسٹ بناؤ تاکہ کوئی یہودی بے علم نہ رہے" ۔ چنانچہ اس وقت اتنا بڑا تعلیمی ٹرسٹ کسی

ملک میں نہیں ہے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر ڈاکٹریٹ اور پوسٹ
ڈاکٹریٹ تک تعلیم مفت ہے۔

اگر ہم سب مل کر ایک سو کروڑ روپے کا نہ سہی دس کروڑ روپے کا ہی مسلم تعلیمی ٹرسٹ (فنڈ) قائم کریں تو ملت کے دن بدل جائیں گے حوصلہ کی کمی، احساس کمتری پستی اور بے حسی ہمارے اصل روگ ہیں۔ جن کا علاج ہم بجائے عملی پروگرام کے محض تقاریر، بیان بازی، سمپوزیم، سمینار اور ریسرچ سے کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں یہہ کہنا ضروری ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک واحد قوم ہے جو اسلام کی طرح توحید کی پرستار ہے اور مسلمانوں کی طرح ان میں ختنہ کا رواج ہے۔ گویا مذہباً یہودی مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔

کرے تو اس کو ہم (۹۰) نمبر دیتے ہیں۔اس کو (۱۰۰) نمبر لینے کے لیئے (۱۱۰) نمبر کا پرچہ حل کرنا پڑے گا تاکہ وہ اپنا اعلیٰ علمی معیار برقرار رکھ سکے۔

تعلیم کی جو اہمیت ان کے ہاں ہے وہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں شائع شدہ ایک مضمون (۵/ نومبر ۹۵ء) سے ہوجائے گا جو مرزا شکور بیگ (حیدرآباد) تل ابیب "میرا وطن" کے عنوان سے لکھا ہے اس مضمون میں جو بات غور کرنے کی ہے وہ اس ملک میں تعلیم کی اہمیت اور اس کا معیار ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"یہاں خدا کے بعد تعلیم کو درجہ دیا جاتا ہے۔ تعلیم خدا کی نعمتوں کی طرح فری ہے۔ تعلیم کے معاملہ میں ہر شہری عابد علی خان ہاشم علی اختر اور پروفیسر حامد ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ساری دنیا کے یہودیوں نے یروشلم میں ایک عبادت گاہ کی تعمیر کے لئے ایک بلین امریکی ڈالر کا چندہ جمع کیا۔(یہہ رقم ہندوستانی سکہ میں 3300 کروڑ روپے کے مساوی ہوتی ہے) جب یہ رقم اسرائیل کے دینی پیشوائے آعظم CHIEF RABBI کو نذر کی گئ تو اس کے الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔اللہ تعالیٰ ساری دنیاؤں کے مالک ہیں۔ساری شان وشوکت اس کے لئے ہے۔ہم کون ہوتے ہیں جو اس کے لئے ایک بلین ڈالر جیسی حقیر رقم کا محل تعمیر کرنے والے۔ اس کی بندگی تو ہر جگہ سوتے جاگتے کی جاسکتی ہے۔خدا کو جاننے کے لئے علم ضروری ہے۔جاؤ اس سے ایک تعلیمی ٹرسٹ بناؤ تاکہ کوئی یہودی بے علم نہ رہے" ۔چنانچہ اس وقت اتنا بڑا تعلیمی ٹرسٹ کسی

ملک میں نہیں ہے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر ڈاکٹریٹ اور پوسٹ ڈاکٹریٹ تک تعلیم مفت ہے۔

اگر ہم سب مل کر ایک سو کروڑ روپے کا نہ سہی دس کروڑ روپے کا ہی مسلم تعلیمی ٹرسٹ (فنڈ) قائم کریں تو ملت کے دن بدل جائیں گے حوصلہ کی کمی، احساس کمتری پستی اور بے حسی ہمارے اصل روگ ہیں۔ جن کا علاج ہم بجائے عملی پروگرام کے محض تقاریر، بیان بازی، سمپوزیم، سمینار اور ریسرچ سے کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں یہہ کہنا ضروری ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک واحد قوم ہے جو اسلام کی طرح توحید کی پرستار ہے اور مسلمانوں کی طرح ان میں ختنہ کا رواج ہے۔ گویا مذہباً یہودی مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔

دی سوپر اسکول۔ایک منفرد تجربہ

THE SUPER SCHOOL AN EXPERIMENT

کسی اسکول میں کوئی جماعت ایسی نہیں جہاں پر چند طلبہ غیر معمولی طور پر ذہین نہ ہوں اور چند طلبہ ضرور ایسے مل جائیں گے جن کا تعلیمی ریکارڈ تشویشناک حد تک پست ہو۔اگر سب ہی طلباء کا معیار تعلیم اچھا اعلیٰ سطح پر قائم ہے تو ضرور وہاں پر اچھے ذہین طلباء کو چن لیا جاتا ہے جو اچھے کھاتے پیتے تعلیم یافتہ خاندانوں سے آتے ہیں دوسرے الفاظ میں ان کے ہاں داخلہ SLECTIVE ADMISSIONS کی پالیسی کے تحت ہوتا ہے۔لیکن سرکاری اسکولوں اور عام خانگی تعلیمی اداروں میں اس پالیسی پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔

طلباء کی روزمرہ بڑھتی ہوئی تعداد کچھ تجارتی پہلو کے غالب رہنے کی وجہ سے صرف اچھے ذہین طلباء کو ہی داخلہ دینا دشوار ہے تعلیم کے میدان میں کام کرنے والے ہزاروں ٹیچرس، لکچررس اور پروفیسرس اسبات سے واقف ہیں کہ کلاس روم اسباق اور لکچرس آسمان سے بارش کی طرح سب کے لئے یکساں ہیں لیکن جہاں زمین زرخیز ہے اس خطہ میں برگ و بار اچھے آتے ہیں اور جو علاقہ بنجر ہے وہاں پر کوئی پودا مشکل ہی سے پروان چڑھتا ہے۔ذہین اوسط اور غبی طلباء کے ساتھ یکساں برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ اوسط طلباء کے سامنے ذہین طلباء کا اونچا مظاہرہ ہوتا ہے ان کے لئے آئڈیل کا کام کرتے ہیں اور وہ کسی طرح آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں ہر جماعت ہیں اوسط طلباء کی تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی ہے۔جو ذہین طلباء ہیں انہیں بہت کچھ تشنگی رہ جاتی ہے ان کے سامنے کوئی آئیڈیل نہیں ہے بلکہ وہ مجبور ہیں کہ کمزور اور پست تعلیمی سطح کے طلباء کے ساتھ چلتے رہیں اور یہی کام بڑا مشکل ہے شہرہ آفاق ڈاکٹر ہیلن کلر Dr. Helen Keller کا کہنا ہے کہ "سب سے مشکل کام آہستہ چلنے والوں کے ساتھ چلنا ہے تیز گام کے سامنے منزل ہوتی ہے ان کے ساتھ چلنا آسان ہے"۔

یہاں اصل سوال یہ ہے کہ ایسے غیر معمولی ذہین طلباء کو سب کے ساتھ ہی پڑھانا چاہیئے یا ان کے لئے علحدہ مخصوص تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے؟ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اب یہ قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے کہ ہر طالب علم کو بہتر سے بہتر تعلیم کے زیور سے سنوارا جائے اسکی کئی وجوہات ہیں لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ اس طالب علم میں ذہانت اور سمجھداری کی سطح اونچی ہونی چاہیئے۔اگر یہ خوبی موجود ہے تو اعلیٰ اور اچھی تعلیم Quality Education کے لئے کافی روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا انحصار والدین کی معاشی حالت پر ہوتا ہے۔اگر ذہانت اور معاشی حالت دونوں ساتھ نہ ہوں تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے طلباء محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر دولت ہو لیکن بچہ میں صلاحیت نہ ہو تو دولت مند بھی مجبور ہے۔ذہین ہو لیکن روپیہ نہ ہو تو اس طالب علم کو تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کے بعد کوئی پیشہ کرنے پر مجبور ہے۔یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اچھی تعلیم خرچ طلب اور مہنگی ہوتی ہے اور کم معیاری تعلیم ارزاں ہوتی ہے۔ تعلیم بھی عام اشیاء کی طرح مارکٹ کی قیمتوں سے ناپی جاسکتی ہے طلب و رسد کے قوانین سے تعلیم بھی الگ نہیں ہے۔

مدینہ ایجوکیشن سنٹر کے تحت تعلیم، اصلاح معاشرہ اور امدادی کام بہتر انداز سے جاری ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ دس سال کے قلیل عرصہ میں کے، ایم عارف الدین نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے چند لاکھوں کی اوقافی جائیدادوں کو کروڑوں کی مالیت کی ٹھوس جائیدادوں میں تبدیل کر دیا۔ تعلیم کے میدان بالخصوص ملت کے بچوں اور نوجوانوں کے لئے بڑے مفید کام انجام دئے جارہے ہیں۔ مدینہ پبلک اسکول، مدینہ جونیر کالج فار گرلز، مدینہ جونیر کالج فار بوائز، مدینہ ڈگری کالج فار ومنس، میڈیکل ویلفیر سنٹر، انجنیرنگ اینڈ میڈیکل انٹرنس کوچنگ۔ شاندار تعلیمی ریکارڈ اور مسابقتی امتحانات میں کامیاب طلباء کے لئے گولڈ میڈلس اوراڈ کی تقسیم، تعلیمی وظائف، امدادی فنڈ، I.A.S. STUDY CIRCLE ہاسٹل لائبریری، آڈیٹوریم، ممتاز دانشوران ہند کے توسیع لکچر ماہانہ مباحثے، سیکولرزم کے تقاضوں کو پورا کرنے کی میٹنگس وغیرہ کچھ ایسے کام ہیں جو وقت کا تقاضہ اور دور رس نتائج کے حامل ہیں۔

ان کاموں کے علاوہ مدینہ گروپس آف ایجوکیشن کے سکرٹری مسٹر عارف الدین نے وقت کے اہم تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ایک منفرد تجربہ کا آغاز، "مدینہ سوپر اسکول" سے کیا ہے۔ جو اس تعلیمی سال سے شروع کیا گیا ہے۔ چونکہ راقم کو ہر تعلیمی کام اور تعلیمی تجربہ سے دلچسپی ہے، اس لئے اس اسکیم کے چند اہم خدوخال سے پڑھنے والوں کو واقف کروانے کا خیال آیا تاکہ ذہین طلباء اس نادر موقع کو یوں ہی ضائع نہ کردیں۔ ہر نئی اسکیم اور تعلیمی تجربہ کے متعلق بہت شکوک وشبہات ذہن میں آتے ہیں۔ اس لئے اس اسکیم کے متعلق قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتے ہیں ایم

(۱) اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ غیر معمولی ذہین طلباء کو ابتدائی درجوں سے ہی

ان کے لئے اعلیٰ معیاری تعلیم کا انتظام کیا جائے تا کہ وہ ایسے مسابقتی امتحانات میں شریک ہو کر کامیاب ہو سکیں جو اعلیٰ قومی سطح کے پروقار کورس سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے I.A.S, I.P.S., M.B.B.S., B.E., I.R.S., I.I.T., I.F.S., A.I.I.M.S., MANAGEMENT, C.A., A.F.M.C., M.A., وغیرہ وغیرہ ان اعلیٰ امتحانات میں شرکت کے لئے عام طور پر ایک سال یا دو سال اسپیشل کوچنگ کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے لیکن اکثر اوقات یہہ محنت ضائع جاتی ہے۔ ان امتحانات کے لئے ایک طویل المدتی منصوبہ بند تعلیمی پروگرام کی ضرورت ہے تا کہ پانچ چھ سال کے عرصہ میں وہ چھن چھن کر سونا بن جاتے ہیں۔ اسی مقصد کی خاطر اس اسکول کا نام بھی "سوپر اسکول" رکھا گیا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے جدید طرز پر ان طلبہ کی اسپیشل کوچنگ کا انتظام رکھا گیا ہے۔ اس پراجکیٹ کے تعارفی لٹریچر کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ PERSONAL GROWTH, PFOJECT FIELD WORK GROUP, LEARNING FORUMS, PARENT TEACHER MEETINS, LABORATORIES. وغیرہ تعلیم کے لازمی اجزا ہوں گے۔

(۲) سوپر اسکول کی چھٹی تا دسویں تک کی ہر جماعت میں طلباء کی تعداد (۲۰) رہے گے تا کہ ہر طالب علم پر خاص توجہ دی جاسکے۔ داخلہ صرف ان طلباء کو دیا جائے گا جو نیچے کی جماعتوں میں بہت اچھا تعلیمی ریکارڈ رکھتے رہے ہوں یا دوسرے الفاظ میں کلاس کے پہلے پانچ RANK میں کوئی پوزیشن سنبھالے ہوئے ہوں۔ جن کے ماں باپ اچھے تعلیم یافتہ ہوں اور معاشی لحاظ سے خوش حال بھی ہوں سماج میں باوقار مرتبہ کے حامل ہوں۔ دس طلباء خود مدینہ پبلک اسکول سے لئے جائیں گے اور دس طلباء

کسی بھی انگلش میڈیم اسکول بعد انٹرنس ٹسٹ کے شریک ہوسکیں گے جس کے لئے کسی قسم کی سفارش اور ڈونیشن وغیرہ کا جھگڑا نہ ہوگا کیوں کہ مقصد صرف اعلیٰ ذہنی سطح کے طلباء کے لئے اعلیٰ قسم کی QUALITY EDUCATION ہے۔

اس نادر اسکیم سے ہمیں چند وجوہات کی بناء پر پوری طرح اتفاق ہے۔ ہندوستان میں بعض پبلک اسکول ایسے ہیں جو ۸۵ فی صد نشانات لینے والے منتخب طلباء ہی کو شریک کرتے ہیں۔لیکن یہاں پر بھی کلاس روم کی تعداد ۴۰ طلباء پر مشتمل ہوتی ہے۔مدینہ سوپر اسکول میں ان ہی طلباء کو داخلہ مل سکتا ہے ۸۰ فی صد نشانات حاصل کرنے کے اہل ہوں گے یہ کوشش نہایت مبارک اس لئے ہے کہ ہمارے اکثر غیر معمولی ذہین طلباء کو اسپیشل کوچنگ نہ ملنے کی وجہ سے ان کا مظاہرہ مسابقتی امتحانات میں اچھا نہیں رہتا۔

تجربہ بتلاتا ہے کہ اکثر ہوش مند والدین دس سال پہلے ہی سے اپنے بچوں کو اعلیٰ مسابقتی امتحانات کیلئے ان کے رجحان طبع کے مطابق ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت تیار کرتے ہیں۔بعض کمیونٹی فلاحی ادارے اپنے ذہین طلباء کو ساری ریاست سے ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور ان کی تعلیم کے سارے اخراجات خود برداشت کرتے ہیں اور انہیں ہر فکر سے بے نیاز کردیتے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں قابل فخر مقام حاصل کرسکیں۔

ان ہی وجوہات کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ مدینہ سوپر اسکول تعلیم کے میدان میں ایک منفرد اور مبارک تجربہ ہے۔اس کے نتائج بھی دو چار سال میں سامنے آئیں گے اسکول کے انتظامیہ اعلیٰ مقاصد، موثر طریقہ تعلیم و تدریس، انفراسٹرکچر اور پر

خلوص جذبہ اور فکر کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پراجکٹ کامیاب نہیں بلکہ ملک کے لئے بہت سے تعلیمی اداروں کو روشنی دے گا وہ والدین قابل رشک ہیں جن کے بچے سوپر اسکول کی جماعتوں میں شریک ہوں گے۔

بچوں کا ادب

ہندوستان آزاد ہو چکا تو شری راج گوپال اچاریہ نے مدراس سے پنڈت نہرو کے نام ایک خط لکھا کہ اب تو ہماری سیاسی جنگ ختم ہو چکی، بہتر ہے آپ کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر بچوں کا لٹریچر تیار کیجیے۔ پنڈت نہرو کا ذہن ماضی کی تاریخ کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے خوب واقف تھا" باپ کے خطوط بیٹی کے نام" میں پنڈت جی نے بڑی خوبصورتی سے بچوں کے لیے ہندوستان کی عظمت رفتہ کا نقشہ کھینچا ہے لیکن پنڈت نہرو کو پہلے وزیراعظم کی حیثیت سے ملک کی تعمیر میں بہت بڑا کام انجام دینا تھا۔ اس ملک کو مضبوط، سیاسی، سماجی اور جمہوری راستہ پر ڈالنے کا کام کوئی معمولی نہ تھا پنڈت جی کو بچوں کے ادب پر توجہ دینے کا پھر کبھی موقع نہ ملا۔ یہاں پر تعجب اس بات پر ہے کہ شری راج گوپال اچاریہ نے وزارت عظمیٰ کے عہدہ سے بھی بڑھ کر پنڈت نہرو کے لیے بچوں کا ادب پیدا کرنا ضروری سمجھا۔ اس قسم کی تجویز رکھنے والے اور جن سے ایسی خواہش کی گئی یہ دونوں ہندوستان کی عظیم شخصتیں تھیں انھیں اندازہ تھا کہ بچوں کا ادب پیدا کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔

کئی برس پہلے مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین کی ایک کہانی کی تلاش تھی، جس کا نام "ابّو خاں کی بکری" ہے اس کتاب کی تلاش میں حیدرآباد میں چوک کی پرانی کتابوں کی دکان پر گیا۔ یہ کتاب نہیں ملی۔ ایک دوکان پر دوچار بے فکرے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جیسے ہی اس کتاب کا نام لیا۔ وہ سب کورس میں پکار اٹھے "ابّو خاں کی بکری" اور میری صورت معنیٰ خیز انداز میں دیکھنے لگے اور بے اختیار ہنس پڑے زور" بکری"

پر تھا اور اشارہ میری صورت کی طرف۔ میں نے ہمت سے کام لے کر اس کے مصنّف کا اتا پتا بتایا کہ یہ ملک کا ایک ممتاز ماہر تعلیم ہے جس نے بچوں کے لیے یہ کہانی لکھی ہے۔ لیکن وہ اس کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔

بڑے آدمی کا بچوں کے ذہن کی سطح تک اتر آنا ایک مشکل بات ہے۔ یہاں پر اپنے کو بچہ سمجھ کر ویسے ہی سوچنا سمجھنا اور لکھنا پڑھنا بڑی مہارت کا کام ہے بچے ایسے ادب کو پڑھ کر یا سن کر حیرت و مسرت کے جذبات سے ان کی آنکھیں چمک اٹھنا، چہروں پر جذبات کی لہروں سے سرخی کے ڈورے دوڑ جانا، بڑے ادیب یا آرٹسٹ کا کمال ہے۔ بات کچھ یوں سمجھ میں آتی ہے کہ بچوں کا ادب پیدا کرنے کے لیے ادیب یا شاعر بچوں کی نفسیات کا ماہر ہو، ان کی طلب کا اسے شدید احساس بھی ہو اور ان ہی کی سادہ سلونی زبان میں لکھنے کی قدرت رکھتا ہو۔ تب ہی وہ بچوں کا ادب پیدا کر سکتا ہے ایسا ادیب بننے کے لیے وہ خود بہت کچھ ادب کے میدان طے کر چکا ہو۔ وہ نفس انسانی کا نباض بھی ہوگا اور وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہوگا جو اور لوگ دیکھ کر بھی دیکھ نہیں پاتے اور اگر دیکھتے ہیں تو اظہار پر قدرت نہیں رکھتے۔ اگر یہ سب خوبیاں کسی ادیب و شاعر میں موجود نہ ہوں تو پھر وہ ادب پھیکا اور بے ذائقہ رہ جائے گا۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

(اقبال)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کسی جگہ لکھا ہے کہ اپنے قیام جرمنی کے زمانے میں وہ ایک مرتبہ روس میں ٹرین کے ذریعہ سفر کر رہے تھے۔ ٹرین کے اسی ڈبّے میں کوئی روسی بزرگ سفید براق سی لانبی داڑھی والے بھی ان کے ہم سفر تھے کسی اسٹیشن پر

اسی کمپارٹمنٹ میں ایک نوجوان خاتون اپنی چھوٹی سی حسین لڑکی کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ لڑکی کی عمر یہی کوئی چھ سات سال کی ہوگی۔ ٹرین چل پڑی ہر تھوڑی دیر بعد لڑکی ماں کے کان میں کچھ کہتی۔ ماں ہر مرتبہ مسکرا کر اس کو چپ کرا دیتی۔ بالآخر ماں نے کہا "اچھا پوچھ لے۔" اس معصوم لڑکی نے سفید براق داڑھی والے بزرگ سے پوچھا "دادا جان آپ سوتے وقت یہہ داڑھی لحاف سے باہر رکھتے ہیں یا اندر" ذاکر صاحب لکھتے ہیں: آدمی سچے تھے کہنے لگے "بیٹی میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا" --- پھر لکھتے ہیں کہ رات بھر اس بزرگ کو نیند نہیں آئی کروٹیں بدلتے رہے کبھی ان کی ڈاڑھی کمبل کے اندر ہوتی اور کبھی باہر۔ بہر حال "رات کاٹی خدا خدا کر کے" صبح کو جاگ کر اس "خضر صورت" نے اس لڑکی سے کہا بیٹی! تمہارے سوال کا جواب تو نہیں دے سکتا لیکن تمہارے سوال نے میری نیند اچاٹ کر دی۔" یہاں پر دو باتیں ہمارے کام کی ہیں، لڑکی کا ذہن ٹرین کی رفتار کے ساتھ سفر کر رہا تھا بچوں کے دل و دماغ میں ایسی باتیں آتی رہتی ہیں جس طرف بڑوں کا ذہن کبھی جاتا نہیں۔ اور دماغ جاگنے لگتا ہے۔

کوئی چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک مشہور انگریزی کے پرفیسر دورے سوامی تھے وہ کلاس میں لکچر دیتے ہوئے کہنے لگے۔ بچوں کے ادب میں حیرت و استعجاب کا عنصر ہونا ضروری ہے تاکہ بچے پڑھ کر خوش ہوں۔ حیرت سے کچھ سوچ میں پڑجائیں اور معصوم سے بے تکے سوال کرنے لگیں۔ پھر اس کے بعد کہنے لگے، یہ تو اس زمانہ کے بچے تھے جب کہ ابھی تعلیم اور سائنس عام نہیں ہوئی تھی۔ بے شک وہ کہتے تھے

TWINKLE TWINKLE LITTLE STAR

HOW I WONDER WHAT YOU ARE

لیکن آج کل بچے دوسرا مصرعہ یوں پڑھتے ہیں۔

I DON,T WONDER WHAT YOU ARE.

اس واقعہ کو گزرے ہوئے اب کئی برس ہو چکے۔ اس دوران فلم، ریڈیو، ٹی، وی کی وجہ سے موجودہ نسل عام معلومات میں بہت سے فاضل بوڑھوں کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ حیرت و استعجاب کے عناصر کم سے کم ہوتے جارہے ہیں اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عرفان ذات باری کے لیے سائنس نے اتنا کچھ مواد جمع کر دیا ہے کہ سائنس داں بھی پکار اٹھے۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلاً۔

علامہ اقبال کا سا شاعر کسی زبان میں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اقبال نے بچوں کے لیے نہایت خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ "ایک پہاڑ اور گلہری"، "ایک مکڑا اور مکھی"، "ایک گائے اور بکری"، "بچے کی دعا"، "نیا شوالہ"، ہمدردی"، "پرندے کی فریاد"، "چاند تارے" وغیرہ اور پھر ہر نظم کے آخر میں کچھ کام کی بات رکھ دی ہے جو بچوں کے دل میں اتر جاتی ہے۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پر چلانا مجھ کو

(بچے کی دعا)

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(ہمدردی)

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

(ایک گائے اور بکری)

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

(پہاڑ اور گلہری)

اس طرح مولانا روم نے اپنی مثنوی میں کئی ایک قصّوں کو اپنایا ہے جو بچوں کے کام کے ہیں۔ "شیر اور خرگوش" کے قصے سے مولانا روم نے اپنی طویل مثنوی میں حقیقت و معرفت کے کئی نکات نکالے ہیں۔ مشہور نظم "کچھوا اور خرگوش" کا آخری مصرعہ اب تو ضرب المثل ہو چکا ہے۔ "ورنہ کچھوا کہاں، کہاں خرگوش"۔

ہمارے ملک میں بچوں کے لٹریچر کا قحط ہے۔ ملک کی ۴۲ فی صد آبادی ایسے بچوں پر مشتمل ہے، جن کی عمریں ۱۲، ۱۳ سال کی ہیں۔ اس طرح ۳۳ کروڑ سے زائد آبادی بچوں کی ہے۔ اس عمر کے بچوں کے لیے جس قسم کے ادب کی ضرورت ہے، اس کا کچھ اندازہ اوپر کی باتوں سے ہو چکا ہو گا لیکن ایسا صاف ستھرا ادب بچوں کو نہیں مل پاتا لازماً وہ فلمی رسالوں اور فحش لٹریچر پر گر پڑ جائیں تو پھر باقی ساری عمر کسی اچھے ادب سے انہیں دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ گاندھی جی نے لکھا ہے کہ فحش لٹریچر کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والا فحش ترین لٹریچر کا طلب گار ہوتا ہے۔ بعد میں یہ شوق ایک نفسیاتی بیماری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر ایسے لوگ بہت سی نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

چند تجاویز:۔

بچوں کے ادب کے لیے قومی اور ریاستی سطح پر ایک واضح پروگرام کے تحت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ (۱) ہر ریاست میں اچھے ادیب، شاعر، افسانہ نویس، ناول نگار،

مذہبی رنگ میں لکھنے والے موجود ہیں ۔ ہر زبان کی اکیڈیمیاں بھی قائم ہیں وہ بچوں کے ادب کے لیے بھاری انعامات رکھیں اور ایسے ادیب اور شاعر کو اعزاز بخشیں جو بچوں کے لیے کہانیاں ، اخلاقی و تاریخی قصے ، نظمیں ، کھیل کود کے ساتھ خوبصورت نظمیں ، مناظر فطرت اور ماحولیات پر بچوں کے لیے اچھا ادب تیار کرنے کی ترغیب دیں ۔ اخبار ، ریڈیو ، ٹی ، وی سے اس کی کافی تشہیر کی جائے ۔

(۲) ایسے ادارے جو پہلے ہی سے کوئی اخبار ، رسالے یا میگزین نکالتے ہوں انھیں بچوں کے لیے اسپیشل ایڈیشن نکالنے کی ترغیب دی جائے یا پھر چند صفحات بچوں کے لیے مختص کر دیئے جائیں ۔ انگریزی اخبارات میں ہفتہ وار ایڈیشن میں بچوں کے لیے دو چار صفحات ہوتے ہیں ۔ اردو کے اخبارات میں ایسا کوئی صفحہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے ۔

(۳) بچوں کے تخلیقی ادب کو شائع کرنے کی ذمہ داری اس زبان کو فروغ دینے والے ادارے پوری دلچسپی سے نبھائیں ۔ ادیب کو ادب پیدا کرنے کے لیے چھوڑ دیں ۔ کوئی ادیب اپنی تخلیق کی کتابت ، طباعت اور تجارت کے چکر میں پڑنے سے سخت گھبراتا ہے ۔ یہ ایک المناک پہلو ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔ کتب فروش اور ناشرین مصنف پر جو ظلم کرتے ہیں وہ تو اب عام بات ہے ۔ اور اب شکایت عام ہو چکی ہے کہ کتابیں فروخت بھی ہو جائیں تو کتب فروش مصنف کو پیسہ دینا اپنی عادت کے خلاف سمجھتے ہیں ۔ کوئی ادیب ایسا خون جگر کہاں سے لائے کہ وہ گھنٹوں ایسا ادب تیار کرنے میں لگا دے ، جیب سے پیسہ خرچ کرے مارا مارا پھرتا رہے اور آخر میں نقصان نہیں دیوالیہ ہو جائے ۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے اگر ہمارے ادارے ، چاہے وہ کسی زبان سے تعلق رکھتے ہوں ، اس کی اشاعت اور تشہیر کی ذمہ

داری لے لیں اور مصنف کو بھی معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو پھر ایک ہی سال میں دیکھیے کتنا کچھ بہترین بچوں کا ادب آجائے گا۔ باتیں کرنا یا کسی اسٹیج سے اردو زبان کی ترویج کے لیئے قوم اور ملت کی دہائی دینا بے سود ہے۔

(۴) اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ بچوں کی کتابوں کا ٹائیٹل خوب صورت اور دلکش ہو۔ جاذب نظر ہو۔ لکھائی چھپائی اچھی ہو۔ حجم زیادہ نہ ہو۔ قیمت ایسی ہو کہ والدین بار نہ سمجھیں۔

(۵) پہلے سے بچوں کے لیے جو رسالے مختلف مقامات سے شائع ہوتے رہے ہیں، ان کے سرکولیشن کو بڑھانے اور پھیلانے کی سخت ضرورت ہے یہ کام کچھ ہمدردانِ ملت سے ممکن ہے۔ لیکن اس کے لیے جس جذبے کی ضرورت ہے وہ عام نہیں ہے۔

اس ملک کے بچے بڑے ہی خوش نصیب ہیں جہاں کے لوگ، ادیب، شاعر، دانش ور، لیڈر بچوں کے لیے صاف ستھرا ادب پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

بچّہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے

کوئی ۲۵/ برس پہلے کی بات ہے کہ مجھے گوداوری کھنی (کریم نگر) میں ایک سرکاری تقریب میں شرکت کے لئے تعلیمات کی دو خواتین عہدہ داروں کے ساتھ جیپ کار میں سفر کرنا پڑا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ہماری جیپ کار جنگل میں ایک ریلوے کراسنگ کے سامنے آکر ٹھیر گئی۔ کچھ ہی دیر میں ایک مال گاڑی درختوں کے جھنڈ سے مست ناگن کی طرح نمودار ہوئی اور بل کھاتے ہوئے گزرنے لگی۔ ایک خاتون ان ڈبوں کو زیر لب گننے لگیں دوسری خاتون نے تلگو میں اسے ڈانٹا "چل گدھی بچوں کی طرح کیا گن رہی ہے؟" اس خاتون نے مسکرا کر جواب دیا کہ اس سنسان بیابان میں پہاڑیوں کے درمیان سے مال گاڑی کا یوں انگڑائی لیتے گزرنا کسے اچھا نہیں لگتا۔ میں تو چاہتی ہوں کے کسی طرح اچھل کر ایک ڈبہ کی چھت پر بیٹھ جاؤں اور جہاں وہ لے چلتی ہے چلی جاؤں۔ حقیقت تو یہ کہ "بچے اور بلّیاں ہر اس شئے میں دلچسپی لیتی ہیں جو حرکت کرتی ہے۔

" Cats and Children are very much interested in every thing that moves "

ہماری عمریں لمبی ہوجائیں لیکن بچپن ہم میں چھپا بیٹھا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہمارے ماحول سے بچوں کی شرارتیں اور مسکراہٹیں نکال لی جائیں تو لوگ پاگل ہوجائیں۔

اکثر مائیں یہ شکایت کرتی ہیں کہ میرا بچہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے اسی

حقیقت کی بنیاد پر ماہرین تعلیم ڈراپ آوٹ کی وجوہات پر رپورٹس تیار کرتے ہیں۔
اس سوال کا جواب دینے سے قبل بچہ کی فطرت کی عکاسی شیکسپیر نے اپنی ایک خوب صورت نظم "آدمی کے عمر کی سات منزلیں" Seven stages of Man میں بچہ کے اسکول جانے کا منظر یوں کھینچتا ہے:

WITH HIS SATCHEL AND
SHINING MORNING FACE
THE WHINIG SCHOOL BOY
CREEPING LIKE SNAIL
UNWILLINGLY TO SCHOOL

پھر وہ صبح کا تازہ چہرہ لئے ہوئے، کتابوں کا بستہ اٹھائے، رونی صورت بنا کر اسکول کی طرف گھونگھے کی طرح رینگتے ہوئے بیزاری سے قدم اٹھاتا ہے۔

جب ہم بچوں کی نفسیات، عادات و اطوار اور ان کی دلچسپیوں سے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو خود اپنے بچپن کو بھول جاتے ہیں۔ اکثر والدین بچوں کے سامنے فلسفے کی زبان میں بہت بلندی سے بات کرتے ہیں، حالانکہ ماں باپ کو بچے کے پیروں کے نیچے زمین دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ بچے کا دل ہمیشہ کھیل کود، چیخ و پکار، دنگا فساد، مار دھاڑ، چھیڑ چھاڑ اور توڑ پھوڑ میں لگا رہتا ہے پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا، اس کے بستہ سے آج کاپی غائب ہے تو ہمسایہ کی کنگھی، ربر اور پنسل موجود، کتاب کی شکل و صورت بگڑی ہوتی ہے تو لکیروں، تصویروں اور بے معنی رنگوں کے دھنک ساری کاپیوں میں نظر آئے گی۔ ٹیچرس کی شکایتیں، نصیحتیں ماں باپ کی دھمکیاں، ٹیچرس کی سزائیں، بنچوں پر کھڑا کرنا ہم جماعت طلبہ میں بے عزت کرنا، کون خود دار اس ماحول

میں ابھرے گا۔ ایسی تعلیم کو دور سے سلام۔ پڑھنا لکھنا ویسے بھی کیا ضروری ہے جبکہ سارے محلہ میں ایک دو لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ ان سارے خیالات کا ہجوم لے کر اسکول پہنچا۔ بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں۔ پہلے ہی سے ایک ایک جماعت میں ۹۰، ۱۰۰ بچے ہیں جو جگہ کے حق مالکانہ کے لئے جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں جو زور آور لیڈر ٹائپ کے ہیں اپنی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ ٹیچر بھی ان کی قیادت کو مانتے ہیں۔ دھول دھپّا لڑائی جھگڑا ہر روز کا معمول ہے۔ ٹیچر دس پندرہ منٹ دیر سے داخل ہوئے۔ اس جم غفیر کی حاضری لینے میں دس منٹ لگ گئے۔ باقی ۲۰ منٹ میں کچھ پڑھا دیا۔ گھنٹہ ختم ہوا۔ ریاضی کے ٹیچر نے آتے ہی چھڑی سے پیٹنا شروع کیا۔ بلیک بورڈ پر اعداد رقص کر رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ پینے کے لئے پانی ہے اور نہ حاجت کے لئے صاف جگہ۔ کھیل کود کے لئے نہ تو میدان ہے نہ کلاس روم سے آزاد ہونے کے لئے کوئی راستہ ادھر اسکول کی چھٹی ہوئی سینکڑوں بچوں نے شور مچایا چلو اس تنگ و تاریک قید خانہ سے چھٹکارا ملا۔ گھر آتے ہی کتابوں کا بستہ پٹک دیا۔ جوتے یونیفارم گھر کے ہر کونے میں پڑے ہوئے ہیں۔ صورت اتری ہوئی، بال پریشان، خود ماں باپ کو بھی ایسے وقت کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

اس پر مزید یہ کہ طریقۂ تدریس غیر دلچسپ، اسکول کا ماحول تنگ و تاریک، کتابوں کاپیوں کے انبار سے نفرت، اسکول کے ڈسپلن سے وحشت، وحشیانہ سزاؤں کا خوف، ہوم ورک میں سر کھپانے کا درد سر، آخر اس Torture Chamber " عذاب جان " سے چھٹکارا پانے کے لئے بچہ بھاگے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ اگر وہ نہیں بھاگتا ہے تو پھر بچہ نہیں۔

ہمارے اسکولوں میں ڈراپ آوٹ Drop out کا فیصد بہت زیادہ ہے۔ ہمدرد فاونڈیشن کی سروے رپورٹ کے مطابق اگر پہلی جماعت میں ایک سو بچے شریک ہیں تو پانچویں جماعت تک نصف غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ پت جھڑ ہر موسم میں جاری رہتی ہے۔ دسویں جماعت میں پہنچنے تک ایک سو میں صرف دس باقی رہ جاتے ہیں یعنی "تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا"۔ پیسے کی صورت میں کروڑوں روپے کے ضائع ہونے کا اتنا غم نہیں جتنا کہ قوم اور ملت کے ذہن انسانی کا ۹۰ فیصد زرخیز حصہ یوں ضائع ہو گیا جو کسی اچھے کام کا نہیں رہا۔ پھر اس جاہل اور کاہل قوم پر کئی وجوہات کی بنا پر احباب، رشتہ داروں اور حکومتوں کو جتنا کچھ ساری زندگی خرچ کرنا پڑے گا وہ الگ رہا۔

میسکو (حیدرآباد) Mesco کے صدر ڈاکٹر حیدر خاں نے ایک مرتبہ ایک اہم بنیادی سوال کیا کہ ہمارے اسکولوں میں غریب والدین کے بچے ہی پڑھنے آتے ہیں۔ خود والدین پڑھے لکھے نہیں اور ان کی بستیوں کا ماحول بھی تنگ و تاریک ہی نہیں بلکہ ہر برائی سے بھرپور ہوتا ہے۔ جو بچے کھاتے پیتے گھرانوں کے ہیں وہ اچھے اسکولوں میں پڑھتے ہیں جن کی تعداد بس ہمارے معاشرے کا دو چار فیصد ہو سکتا ہے یہ غریب بچے کہیں کارخانوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے کے لئے مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں۔ مدرسہ کی اہمیت سے ان کے والدین واقف نہیں۔ ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہئیے آخر مسئلہ کا حل کیا ہے؟

اوپر کی ساری تفصیل سے ایک بات ضرور سمجھ میں آگئی ہو گی کہ ہر وہ تعلیم جو بچہ کی جبلی تقاضوں Instinctive Forces کے خلاف ہو گی۔ وہ بچوں کی

نفسیات اور فطرت کے خلاف ہوگی جو قابل نفرت اور بغاوت کا پیش خیمہ ہوگی۔اس کا ایک ہی حل ہے وہ یہ کہ بچے کے فطری رجحانات، میلانات اور خواہشات کے مطابق اسکول کی زندگی کو ڈھالا جائے۔ہم سارے ملک میں آسانی سے غربت اور جہالت کے ماحول کو بدل نہیں سکتے لیکن ساری کمیونٹی کے بچوں کے لئے ایک اچھا ماحول اسکول میں دے سکتے ہیں۔ کھیل کود، تعلیمی مقابلے، اسکوٹنگ، تعلیمی تفریح وغیرہ کی سہولتیں دیجئے تاکہ بچے کی شخصیت کے جوہر پھوٹ پڑنے کے راستے نکل آئیں۔ اب دیکھئے اسکول ان کے دل کی دھڑکن اور ان کی خوشیوں کا مینار ہوگا۔اسکول کی چھٹی ہوئی تو افسوس ہوگا۔بچہ اسکول سے نہیں بلکہ اسکول کی طرف بھاگے گا۔ بھاگنے کی سمت اس طرح تبدیل ہو جائے تو تعلیم کی دنیا میں انقلاب آجائے گا۔

تدریس ایک فن ہے

(TEACHING IS AN ART)

کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ(66 - 1964) کا پہلا جملہ یوں شروع ہوتا ہے۔ THE DESTINY OF INDIA IS NOW BEING SHAPED IN HER CLASS ROOMS ہندوستان کی قسمت کی تشکیل اب اس کے کلاس رومس میں ہورہی ہے یہہ جملہ بہت معنیٰ خیز ہے۔اس رپورٹ کے تیار کرنے والوں نے بہت گہری اور بنیادی بات پر انگلی رکھ دی ہے اس ایک جملہ کی تشریح کے لیئے انھیں ایک ہزار صفحات کی رپورٹ تیار کرنی پڑی ۔ آزاد ہندوستان کی تعلیمی ، معاشی ، سماجی ، فنی ، سائینسی ، جمہوری نظام کی تعلیم و تربیت ان ہی کلاس رومس میں ہوگی۔

پڑھانے سے متعلق ایک عام غلط فہمی یہہ پھیلی ہوئی ہے کہ ہروہ شخص بچوں کو پڑھا سکتا ہے جو بچہ کی معلومات سے چند قدم آگے ہوتا ہے بچہ کو سیکھنا ہوتا ہے ٹیچر کو پڑھانا ، پڑھانے میں کیا پڑھانا ، کب پڑھانا اور کیسے پڑھانا ، یہہ چاروں باتیں اہم ہیں کیا پڑھانے کے لیئے سبق کا مواد اور تیاری ضروری ہے ۔ کب پڑھانے کے لیئے اسکول کا ٹائم ٹیبل بتادے گا۔ کس کو پڑھانا ہے ۔۔ بچوں کو ، کس عمر کے ہیں ، کس قابلیت کے ہیں ، کس ماحول سے آرہے ہیں ، ان کی کمزوریاں کیا ہیں اور ان کی صلاحیت کا معیار کیا ہے ۔اس لیئے کہا جاتا ہے کہ استاد کو نہ صرف یہہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ

اس کو کیا پڑھانا ہے، اس مضمون پر اسے کتنا عبور ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بچہ کو جاننا پہچاننا اس سے ، بھی زیادہ ضروری ہے ۔ اگر وہ بچہ یا طالب علم کو پوری طرح نہیں جانتا تو اس کی بہت سی محنت رائیگاں جائے گی بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ، غصہ اور سزا جھلاہٹ سے خود استاد کی خامیوں کو عیاں کرتی ہیں ۔

اصل سوال کیسے پڑھانے کا ہے یہی سوال اس مضمون کی جان ہے ۔ اکثر ٹیچرس پڑھاتے نہیں وہ صرف نصاب کی تکمیل کر دیتے ہیں ۔ ذاکر حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آج کل تعلیم کہاں دی جاتی ہے ۔ ٹیچر کی نوٹ بک سے طلبہ کے نوٹ بک میں منتقل ہوجاتی ہے ۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے لکھا ہے کہ تعلیم کوئی ایسا عمل نہیں جیسے کسی نے پانی ایک بکٹ سے دوسری بکٹ میں انڈیل دیا ہو ۔ جب تک تعلیم یا سیکھنے کا عمل LEARNING PROCESS طلبہ کے ذہن و دماغ بلکہ روح کے واسطوں سے نہ ہو وہ تعلیم نہیں ہو پاتی ۔

دینی درسگاہوں میں زیادہ تر بجائے غور و فکر، ذہن اور دماغ پر بار ڈالنے کے رٹنے پر زور دیا جاتا ہے ۔ یہاں پر رٹّو حافظہ کی قدر بڑھ جاتی ہے ۔ رٹنے کے لئے کسی بات کو بار بار پڑھنا اور دہرانا ضروری ہوتا ہے لیکن یہاں تعلیم کا عمل کم رہ جاتا ہے اس کا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ طلبہ کوئی تعلیمی سند تو حاصل کرلیتے ہیں لیکن ان میں وہ دانشوری پیدا نہیں ہوتی جو کسی عالم دین کی شان ہوتی ہے ۔

TALK AND CHALK METHOD OF TEACHING بات اور چاک پیس کے استعمال کا طریقہ بھی اب فرسودہ ہوچکا ہے ۔ موجودہ زمانہ میں جدید سائنٹفک طریقہ ہائے تدریس اس قابل ہیں کہ انھیں کلاس رومس میں جلد از جلد اپنا لیا جائے ۔

کلاس روم کی تعلیم میں اصل لین دین، سوال جواب، طلبہ میں سوچنے، سمجھنے اور حقیقت کے انکشاف کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔اسی ترکیب سے ان میں تعلیم کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔یہی اصل میں تعلیم کا جوہر ہے یا ESSENCE OF TEACHING ہے۔جیسا ہر فن کے سیکھنے کے بعد اس علم کو معروضی حالات پر منطبق کرنے، صحیح نتائج حاصل کرنے اور اس کی معنویت کو پانے کے لئے INTERNSHIP ضروری ہے اسی طرح ہر ٹیچر کے لئے عملی لیباریٹری۔یعنی کلاس روم میں انھیں آزمانے کی ضرورت ہے۔کسی ٹیچر یا پروفیسر کا کمال یہہ نہیں کہ وہ اپنے مضمون کا کتنا بڑا ماہر ہے بلکہ اس کا اصل کمال یہہ ہے کہ اس نے خود اپنے جیسے کتنے باکمال شاگرد پیدا کئے ہیں۔ان میں وہ جستجو اور علم کا ذوق کمال حاصل کرنے کے لئے انھیں کن کن تدابیر سے سنوارا ہے۔یہی وجہہ ہے کہ پرائمری سے لے کر گریجویشن سطح تک کوئی ساٹھ ستر اساتذہ پڑھاتے ہیں۔لیکن وہ طالب علم ان تمام میں صرف دو چار ٹیچرس کو ہی یاد رکھتا ہے جنھوں نے سچ مچ اس کی تعلیم و تربیت میں بلکہ اس کی شخصیت میں کچھ ایسا گارا اور چونا بھر دیا جس کی تفصیل اور تشریح بیان سے قاصر ہے۔

بچوں کا معیار تعلیم وہ نہیں ہے جو کبھی عہدہ دار یا انتظامیہ کے لوگ انسپکشن کے وقت معلوم کرتے ہیں۔وہ معیار پچھلے برسوں کی تعلیم کے نتیجہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔اصل معیار تعلیم ہر ٹیچر کا وہ جذبہ اور لگن ہے جو وہ اپنے طلبہ میں تعلیم سے متعلق پیدا کرتے ہیں۔اگر سب اساتذہ میں یہی جذبہ پیشہ میں کارفرما ہے تو پھر یہہ اجتماعی شکل میں بچوں کے معیار تعلیم میں نمایاں ہوجاتا ہے۔خود اس معیار کے لئے اساتذہ کی تعلیم و تربیت، تجربہ اور جذبہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ہر تعلیم ایک تجربہ ہے اور ہر تجربہ کچھ نہ کچھ سکھا دیتا ہے۔ اسی سیکھنے کی رفتار سے بچہ کی شخصیت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ شخصیت کی تشکیل، جسم و جان۔ ذہن و دماغ پر ہزاروں عوامل کے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ سیکھنے، سمجھنے اور سوچنے کے دوران بچہ کے کردار، سمجھ بوجھ اور برتاؤ میں عظیم تبدیلیاں لانے کے بعد شخصیت کا ایک نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے جس میں اعتدال، توازن، اپنی ذات پر بھروسہ یا خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک اچھے آرٹسٹ کی تخلیق آرٹ کا ایک نمونہ ہوتی ہے۔ ایک اچھے ٹیچر کا ہر سبق کا ایک فن پارہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی ٹیچر اس معیار پر اتر جائے تو وہ بھی ایک بڑا آرٹسٹ ہے۔ اس کی کسوٹی یہہ ہے کہ ایک پوشیدہ مسرت سے بچوں کے چہرے دمک اٹھیں ان کے دل میں ٹیچر کی عزت و عظمت پیدا ہو جائے اس احساس سے ٹیچر کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ خود اس کا انعام ہے جو کسی انعام اور تعریف کا محتاج نہیں۔

بچہ کی تعلیم و تربیت اور شخصیت کی تعمیر کا زمانہ دنیا کی ساری مخلوقات میں طویل ترین زمانہ ہے یہی وجہ ہے کہ جس آرٹ کے نمونہ کی تخلیق مقصود ہے وہ دنیا کے ساری مخلوقات میں طویل ترین زمانہ ہے یہی وجہ ہے کہ جس آرٹ کے نمونہ کی تخلیق مقصود ہے وہ دنیا کے سارے فنون میں سب سے اعلی ترین اور مشکل ترین فن ہے جو مختلف عوامل کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ اثر انداز ہونے والا عامل کلاس روم کی تدریس، ٹیچر کی شخصیت اور اس کے پڑھانے کا موثر انداز ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہء فن کی ہے خون جگر سے نمود

یہہ خون جگر دراصل اپنے پیشہ اور فن سے عشق یا خلوص کا نام ہے جس کی کرامات بے حساب ہیں۔

نقل کا حل کیا ہے؟

جناب عادل رفیق (پوچم پاڈ) کا ایک مضمون "طلبہ نقل کیوں کرتے ہیں" "مورخہ ۱۲/ اپریل ۱۹۹۵" سیاست" کے کالم "قارئین کہتے ہیں" میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۲۴ / اپریل کو محترمہ نفیسہ خاتون ہیڈ مسٹرس ناگارجنا ساگر کا ایک مضمون "پرچے کس طرح اوٹ ہوتے ہیں" دیکھنے میں آیا ان دونوں مضامین میں ہمارے نظام تعلیم کی بنیادی خرابیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخر میں محترمہ نے سوال کیا ہے کہ "اس مرض" کے اس زخم کو مندمل کرنے کے لئے کون سا طریقہ علاج اپنانا ہوگا؟ ان دونوں مضامین میں مزید کچھ اضافہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اس کے علاج پر غور کرنے کی بات ایک عرصہ سے ماہرین تعلیم کے زیر غور ہے لیکن کوئی بھی اس کا تیر بہدف علاج نہیں معلوم کیا جاسکا اس کی اصل وجہہ وہ انسانی کمزوریاں HUMAN WEAKNESSES ہیں جو ہر شعبہ حیات میں جاری وساری ہیں۔ زندگی کا آج کونسا شعبہ ایسا رہ گیا ہے جو ان کمزوریوں سے بچ کر پاک وصاف، شفاف اور ستھرا رہ گیا ہے۔ امتحان ہال میں بچے اور نوجوان داخل ہوتے ہیں۔ سماج میں جاری وساری خرابیوں اور فریب کاریوں سے وہ واقف ہیں۔ اس لئے اگر وہ نقل کرتے ہیں تو کیوں انھیں مطعون کیا جائے۔ اس سال دسویں جماعت کے پرچے اوٹ ہوگئے۔ یہہ طلبہ کا کارنامہ نہیں بلکہ ان کے بزرگوں کی نامعقول حرکات ہیں، شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ یونیورسٹی اعلیٰ امتحانات میں بھی نقل چلتی ہے۔ یہاں تک کہ پی۔ اچ۔ ڈی کے مقالے لکھنے کے لئے پیشہ ور پروفیسرس بازار میں مل جاتے ہیں۔ چند پیسوں کی

خاطر مقالے لکھ ڈالتے ہیں ۔اور اس شخص کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جاتی ہے جو خود مقالہ نہیں لکھتا۔اور وہ سماج میں بڑے اعزاز کا مستحق ہو جاتا ہے ۔اس کی بات اس کے میدان میں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔کیا یہ نقل کی عظیم مثال نہیں ہے۔

نقل اور اس دھوکہ دہی کا آسان علاج صرف یہی ہے کہ امتحان کی موجودہ شکل کو بدل دیا جائے میٹرک سے لے کر گریجویشن کی سطح تک جو اسناد دی جاتی ہیں اس میں کامیاب یا فیل درج نہ کیا جائے بلکہ حاضری کا معینہ فی صد اور امتحان کے محصلہ نشانات چاہے وہ دس (۱۰) ہوں یا اسی (۸۰) درج کریں ۔یہاں پر یہ بتلانا مقصود ہے کہ امیدوار اس سطح تک تعلیم حاصل کر چکا ہے ۔اس طرح امتحان کے غبارہ سے ہوا خارج ہو جائے گی ۔نہ تو کوئی ذیلی امتحان منعقد کرنے کی ضرورت ہو گی اور نہ فیل ہونے کا داغ پیشانی پر لگ جائے گا۔طلبہ اور اساتذہ کے دماغ سے امتحان کا بھوت نکل جائے گا۔اساتذہ تعلیم کے لئے پڑھائیں گے اور طلبہ کچھ حاصل کرنے اور اس ڈگری کی سطح کے وقار کو باقی رکھنے کے لئے پڑھیں گے ۔اگر نہ بھی پڑھیں تو کسی کا کچھ نقصان نہیں اس لئے کہ سرکاری ملازمتوں میں چاہے وہ مرکز کی ہوں یا ریاست کی ،چاہے وہ کوئی خانگی شعبہ ہو۔کہیں پر بھی سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر ملازمت نہیں ملتی۔ وہ خود اپنا امتحان منعقد کرتے ہیں اور انٹرویو کے بعد اپنے کام کے امیدوار کا انتخاب کر لیتے ہیں۔

آج ہندوستان میں جو نظام جاری ہے وہ نہایت ارزاں اور ملک کے حالات کے لحاظ سے معقول ہے ۔ہندوستان کے قریب ۱۵، ۲۰ کروڑ بچوں اور بالغوں کو اعلیٰ معیاری تعلیم فراہم کرنے کی باتیں محض ایک خواب اور خود فریبی ہے جو طالب علم مڈل یا میٹرک تک پڑھ لے ،اس کی ذہنی سطح اور سمجھ بوجھ جاہل اور ناخواندہ سے لازماً اونچی ہو گی ۔اس کے لئے اتنی تعلیم بھی غنیمت ہے۔

غریب ذہین طلبہ کا تعلیمی مستقبل

قریب ۴۰ سال پہلے کی بات ہے کہ راقم محض اتفاق سے ایک دولت مند امیر کبیر کی محفل میں موجود تھا۔ کچھ دیر میں ان کا ایک ملازم جو ان صاحب کے پاس تیس برس سے کام کر رہا تھا دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میرا بیٹا آج میٹرک کے امتحان میں درجہ اول سے کامیاب ہوا ہے وہ چاہتا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد انجینئرنگ کورس میں داخلہ لے۔ اس کے خیالات تو بہت اونچے ہیں لیکن میں غریب کہاں پڑھا سکتا ہوں۔ اگر آپ ماہانہ 35 ، 30 روپے وظیفہ جاری کر دیں تو یہ پڑھ کر انجینیئر بن جائے گا یہ سب سن کر صاحب کے چہرہ پر کچھ خفگی اور پریشانی کے آثار ابھر آئے۔ ان کے لئے یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی جب کہ خود ان کے لڑکے اس قابل نہیں تھے اس ملازم کا لڑکا ریاضی میں 92 فی صد نشانات لایا تھا۔ صاحب نے اس کو مشورہ دیا کہ کہیں دفتر میں اس کو ملازم رکھ دو اور وظیفہ کی بات کو وہ ٹالنے لگے۔ وہ سراپا التجا بنا ہوا تھا۔ اور لڑکا سہما ہوا تھا۔ یہ منظر اس بندہ سے دیکھا نہ گیا۔ ہمت کر کے مجھے درمیان میں کہنا پڑا میں نے کہا دیکھئے آپ بہت سے غریبوں کو ماہانہ چار پانچ سو روپے وظیفہ دیتے ہیں اور غریب لڑکیوں کی شادی میں مدد کرتے ہیں یہ سب وقتی امداد ہے لیکن اس کے لڑکے کی تعلیم کے لئے مدد ایک ایسی نہر ہے جس کا فیضان برسوں تک نہیں بلکہ کئی نسلوں تک جاری رہے گا۔ اس قسم کی دخل در معقولات پر صاحب نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا پھر کیا سمجھے کہ کہا اچھا دو سال کے لئے ماہانہ بیس روپے وظیفہ جاری کر دیں گے۔ اس زمانہ یہ بہت بڑی رقم تھی وہ طالب علم انٹرمیڈیٹ کی

بجائے پالی ٹکنیک میں شریک ہو کر پھر درجہ اول سے کامیاب ہو گیا۔ اس کو انجینرنگ کے دوسرے سال میں داخلہ مل سکتا تھا لیکن وظیفہ بند ہو جانے سے اس کی ترقی کی شاہ راہ پر دیوار کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت تلملایا لیکن کچھ نہ ہو سکا۔ بالآخر انھیں ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ اس لڑکے کی ذہانت اور ملازمت سے متاثر ہو کر صاحب نے اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ وہ ترقی کر کے ریلوے کے انجنیر بن گئے ان کے بچے میڈیسن اور انجنیرنگ میں پہنچ گئے۔

آپ نے مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، میری زبانی" ضرور پڑھی ہو گی۔ نذیر احمد اپنی غربت کی وجہ بچپن میں دہلی کی کسی مسجد میں مولوی صاحب کی خدمت میں رہ گئے۔ روزآنہ پڑھنے کے علاوہ محلہ کے کسی رئیس کے گھر سے کھانا لانے کی ذمہ داری ان ہی پر تھی۔ جب وہ اس رئیس کے مکان جاتے تو نواب صاحب کی ایک چھوٹی صاحبزادی شرارت سے ان کے کان پکڑ کر چٹنی اور مصالحے پیسنے کے لئے نذیر احمد کو بٹھا دیتی۔ چند ہی برسوں میں ان کے علم و فضل کی دہلی میں دھوم مچ گئی اسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی جو ان کے کان کھینچتی اور ستاتی تھی۔ اس قسم کی مثالیں آپ کو اپنے اطراف و اکناف میں خود آپ کے خاندان میں مل جائیں گی اور کوئی تعجب نہیں کہ اس مضمون کے اصل ہیرو آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ مصنف کی کتابوں "تعلیمی مسائل" اور تعلیم ایک تحریک میں آپ کو اس قسم کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ ہر سماج کی طرح مسلم معاشرہ میں تین طبقات موجود ہیں۔ غربت کی سطح سے نیچے۔ اوسط اور بالائی طبقہ۔ غریب طبقہ کا اوسط 40 فی صد ہو گا۔ انھیں اپنے بچوں کو پڑھانے لکھانے کا خیال ضرور ہے لیکن پنڈت نہرو کی زبان میں پہلے پیٹ بھر جائے تو غریب تعلیم کی سوچ سکتا ہے۔ گزشتہ بیس برسوں میں ایک نمایاں تبدیلی آئی

ہے وہ یہ کہ غریب امیر ہر شخص اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے فکر مند ہے ۔ یہ خوشگوار تبدیلی ایک انقلاب کی آمد کی آہٹ سے کم نہیں بہت سے غریب ماں باپ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی خواہش مند ہیں ۔ دوسرا اوسط طبقہ ہے اور اسی طبقہ سے اعلی تعلیم یافتہ ڈاکٹر انجنیر آرہے ہیں ۔ اس کے لئے بھی یہ طبقہ بہت قربانیاں دے رہا ۔ جو بالائی طبقہ ہے ہمارے معاشرہ کا دس فیصد ہو سکتا ہے ۔ وہ اپنے بچوں کے لئے تعلیم کو بھی کسی تجارتی مال کی طرح خرید سکتا ہے ۔ کیوں کہ تعلیم بھی ایک انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے اعلی تعلیم صرف انھیں ملنی چاہیئے جن میں ذہانت ۔ صلاحیت اور اس کے حصول کا جذبہ ہو لیکن آجکل دولت اور پیسہ نے تعلیم کی بنیادی قدروں کو پامال کر دیا ہے جس کو ڈاکٹر بننا تھا وہ کلرک یا ٹیچر ہے اور جس کو یہی ہونا تھا وہ ڈاکٹر یا انجینیر ہے اس میں قوم کا عظیم نقصان ہے ۔ ان میں غریب اور ذہین طلبہ اعلی پیشہ ورانہ تعلیم کے پوری طرح مستحق ہونے کے باوجود وہ داخلہ فیس اور تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اس لئے ان کی محرومیاں ان کے ذہنی اور روحانی کرب کو اور زیادہ کر دیتی ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان سے بہت پیچھے کے رینک پانے والے خانگی کالجوں میں نشستیں حاصل کر کے انجینئر، ڈاکٹر، وغیرہ بن گئے ہیں ۔

یہاں دراصل ہمارا اصل مقصد یہی ہے کہ ملت کا یہ زرخیز سرمایہ یوں ہی بنجر نہ رہ جائے ہمارے لیڈر ۔ دانشور اور علمائے دین نے اس اہم نقصان پر آج تک بہت کم توجہ دی ہے ۔ ہمارے اطراف ایسے بہت سے غریب ذہین طلبہ ہیں جنھیں مرجھاتے بجھتے سب ہی نے دیکھا ہے ۔ سارے ہندوستان میں مسلم انتظامیہ کے تحت اسکول، کالجس ، اعلیٰ پیشہ وارانہ کالج ، میڈیسن ، انجنیرنگ ، فارمیسی ، ایم ۔ بی ۔ اے کمپیوٹر کورسس کالجس آف ایجوکیشن ، پالی ٹیکنک کھل گئے ہیں جو قابل قدر خدمات

انجام دے رہے ہیں ۔ یہ وقت کا عین تقاضہ ہے کہ ہم ایسے غریب ذہین طلبہ کے لئے پالیسی کے طور پر کم از کم پانچ فیصد کی حد تک نشستیں محفوظ کر دیں ۔ جب ہم مرکزی حکومت سے ملازمتوں اور اعلیٰ فنی کالجوں میں مسلم آبادی کے لحاظ سے نشستیں محفوظ کرنے کی مانگ کر رہے ہیں تو ہمارا یہ مطالبہ خود اپنے تعلیمی اداروں میں ناواجبی نہیں کہا جاسکتا ۔ یہ دراصل ملت کی بہترین خدمت ہے جس کی طرف سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ ہماری تعلیمی کوششوں میں ایک نئی انقلابی تبدیلی آجائے گی جس کے نتائج دس پندرہ برسوں میں بہت اچھے ہوں گے ۔

RADIANCE جون ، جولائی ۹۸ء کے شمارہ میں پروفیسر شاہ منظور عالم کا ایک قابل قدر مضمون " اقلیتوں کے مسائل " سے متعلق شائع ہوا ہے ۔ اس میں تعلیم کے عنوان کے تحت موصوف نے مسلم انتظامیہ کے تعلیمی اداروں کی بے حسی اور حرص و آز کو پوری طرح آشکار کیا ہے ۔ یہ تعلیمی ، فنی ادارے اصل میں مسلمانوں کے نونہالوں کی خدمت کے نام سے قائم کئے جاتے ہیں ۔ لیکن وہ تعلیم کو فروخت کر رہے ہیں غریب ذہین طلبہ کو میرٹ کی بنیاد پر انھیں داخلہ نہیں ملتا ۔ یہ ادارے دولت مند طبقہ کی خدمت کے لئے قائم ہوئے ہیں جو تعلیم کو مارکٹ میں اور اشیاء کی طرح اپنے بچوں کے لئے اونچے دام پر خرید سکتے ہیں ۔ یہ ادارے آج بھی مسلمانوں کے غریب طبقہ کو غریب ہی رکھنے کا کام کر رہے ہیں چاہے ان میں کوئی قابل جوہر ہی کیوں نہ ہو ۔ انھیں اوپر آنے کا کوئی موقع نہیں ملتا ۔ ملت کی خدمت کے نام سے یہ بدخدمتی اور بے انصافی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے ۔ یہی مسلم قایدین مرکز اور ریاستی سرکاروں سے مسلمانوں کو ملازمتوں اور اعلیٰ فنی تعلیمی اداروں میں ریزرویشن کی مانگ کرتے جارہے ہیں لیکن خود اپنے تعلیمی اداروں میں غریب ، معاشی لحاظ سے

پسماندہ، ذہین اور میرٹ طلبہ کو کسی طرح داخل نہیں ہونے دیتے اور نہ کوئی حقیر ترین فیصد کوٹہ ان کے داخلہ کے لیئے رکھا گیا ہے۔ یہ مذموم اور قابل افسوس صورت حال سارے ملک کے مسلم انتظامیہ کی سننے میں آتی ہے۔ کاش مسلم انتظامیہ سچی خدمت کے جذبہ سے ان غریب ذہین طلبہ کے درخشان مستقبل کی جانب سنجیدگی سے عملی قدم اٹھائے تو یہ بدنصیب اپنے لیئے معاشرہ میں قابل احترام جگہ بنا سکتے ہیں۔

آخر میں مولانا سید سلمان ندوی کی یہ بات دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ ایک غریب طالب علم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دو تو پھر اس کی دوسری تیسری نسل میں کوئی غریب باقی نہیں رہے گا۔ بھارتی، ٹامل زبان کا اقبال کی طرح قومی شاعر ہے وہ کہتا ہیکہ ہزار مندروں کی تعمیر، تالاب اور سرائے بنانا ضرور ثواب کے کام ہیں لیکن ان سب سے بڑا کام ایک غریب بچہ کو تعلیم سے سنوارنا ہے۔

***

میرٹ کلاس

MERIT CLASS

ایک ہی جماعت میں عام طور پر طلبہ کی درجہ بندی کچھ اس طرح ہو جاتی ہے۔ ذہین، اوسط اور اوسط سے کم تر استعداد مختلف ہونے کی وجہ، ان کا تعلیمی معیار فہم اور سوجھ بوجھ بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے توارث Heredity اور ماحول Environment کا۔ توارث ماں باپ کا عطیہ ہے جو استقرار حمل کے بعد پھر اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہتی البتہ ہم ماحول کو جتنا چاہے مالدار بنا سکتے ہیں یہ ہمارے قابو کی چیز ہے۔ بچہ حواس خمسہ کے ذریعہ اپنے ماحول میں اطراف و اکناف میں سینکڑوں مشاہدات اور تجربات سے سیکھتا جاتا ہے لیکن موثر ماحول صرف تعلیم ہے۔ تعلیم ایک منصوبہ بند ماحول فراہم کرتی ہے۔ باجود سب کو ایک ہی قسم کی تعلیم اور یکساں توجہ کے بعد بھی طلبہ میں فرق ہو جاتا ہے۔ وہ طلبہ جن کا توارث زرخیز ہے وہ تعلیم سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں اور جن کا توارث محدود اور غریب ہے اچھی تعلیم ان کے لئے زیادہ فیض رساں نہیں ہو پاتی۔ .I.A.S کوچنگ کلاس میں ہزاروں گریجویٹس دن رات تیاری کرتے ہیں لیکن ہزار میں سے بس دو چار ہی اس اعلیٰ امتحان اور انٹرویو میں پورے اترتے ہیں۔ بائبل اور قرآن شریف میں اس کی ایک اچھی مثال دی گئی ہے۔ آسمان سے باران رحمت تو زمین پر برستا ہے۔ لیکن جو بارش پتھریلی اور غیر زرخیز زمین پر ہوتی ہے وہاں کچھ گھانس پھوس اگ آتی ہے۔ یہی

بارش جب زرخیز زمین پر ہوتی ہے تو فصل شباب پر آتی ہے اور پھول پھل دے جاتی ہے ۔یہی حال ٹیچر کے سبق یا پروفیسر کے لکچر کا ہوتا ہے ۔ذہین طلبہ تو بہت کچھ اس سے اخذ کرتے ہیں ۔کند ذہن طلبہ کے سروں پر سے یہ لکچر نکل جاتا ہے ۔

بچوں کی ذہانت کا معیار .I.Q معلوم کرنے کے لئے سائنٹفک طریقے معلوم کر لے گئے ہیں اسی طرح کسی کی شخصیت کے توازن کی جانچ کیلئے علم نفسیات میں مختلف ٹسٹ بنائے گئے ہیں ۔اگر توارث کا رقبہ وسیع ہو اور ماحول (تعلیم) بھی اچھا ہو تو ایسے طلبہ ضرور اپنے شعبہ میں کمال پیدا کرتے ہیں ۔اگر توارث زرخیز ہو لیکن مناسب اور موثر ماحول (تعلیم) نصیب نہ ہو تو وہ پودا چند دنوں بعد کھاد پانی کی کمی کی وجہ سے مرجھا کر رہ جائے گا ۔اس کے باوجود اس میں ذہنی استعداد کی کمی کی وجہ سے ساری محنت رائیگاں جائے گی ۔اعلیٰ امتحانات کے لئے عام طور پر کوچنگ ایک دو سال کے لئے گریجویشن کے بعد دی جاتی ہے ۔لیکن یہ کوچنگ بھی عام طور پر ضائع جاتی ہے ۔کیونکہ ایک دو سال میں اس پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی ۔ہوش مند اور دور اندیش لوگ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے پانچ چھ سال کی عمر سے ایک پندرہ سالہ تعلیمی منصوبے اور پروگرام کے تحت ان بچوں کو ملک کے اعلیٰ امتحانات کے لئے تیار کرتے ہیں ۔اچھے پبلک اسکول جن کی تعداد ملک میں ایک فی صد سے بھی بہت کم ہے ۔یہاں ہر بچے کو ابتدا ہی سے حکومت اور اقتدار کے لئے تیار کیا جاتا ہے ۔

ہمارے اسکولوں میں ذہین طلبہ کی بڑی مشکل یہ ہے کہ انہیں کند ذہن غبی اور لاپرواہ طلبہ جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے ، برسوں ساتھ رہنا پڑتا ہے ۔ان کے سامنے مسابقت کے لئے کوئی اچھا گروپ نہیں ہوتا وہ ان تمام طلبہ میں اپنے آپ کو لیڈر سمجھ بیٹھتے ہیں ۔ٹیچرس کو نصاب کی تکمیل کی فکر رہتی ہے وہ سب کے ساتھ

یکساں سلوک اور توجہ کے پابند ہیں۔

ذہین طلبہ جماعت کے اس ماحول اور گھٹن کو محسوس کرتے ہیں۔ ماحول کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ان کی اٹھان کو کھینچ کر نچلی سطح پر لے آتا ہے۔ یہ کیفیت قریب قریب سب ہی گورنمنٹ اور پرائیویٹ اسکولوں کی ہے۔

مثال کے طور پر شہر حیدرآباد کے پرانے محلوں میں کئی ایک اسکول ہیں، یہاں ہر جماعت میں ایک دو طالب علم ذہین مل جائیں گے۔ لیکن انہیں اچھی معیاری تعلیم دینا ایک مسئلہ ہے۔ شہر حیدرآباد کی بعض جانی پہچانی فعال شخصیتیں ایک عرصہ سے اس بات پر غور کرتی رہی ہیں کہ ایسے ذہین طلبہ جو شہر کے مختلف اسکولوں میں تعلیم پارہے ہیں اگر ان کا انتخاب کرکے، ان کے لئے اچھی معیاری تعلیم کا انتظام کردیں تو وہ معاشرہ میں اپنا ایک باوقار مقام بنائیں گے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیئے جناب حسن الدین احمد I.A.S. ریٹائرڈ نے جو ادبی علمی کاموں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں موصوف نے اس میرٹ کلاس کو چلانے کی ذمہ داری لی ہے۔ بلکہ یہہ کہنا درست ہوگا کہ یہہ ساری اسکیم آپ ہی کی فکر رسا کی مرہون منت ہے۔ مجھے اس اسکیم کے خدوخال پر غور کرنے کا موقع ملا ہے۔ جناب حسن الدین احمد کے اس تعلیمی کام سے دلچسپی بہت سے دوررس نتائج کے حامل ہوگی۔

اس کے لئے محض نظریاتی سطح پر نہیں بلکہ اس تعلیمی سال سے عملی قدم اٹھانے کے لئے اس اسکیم کا خاکہ تیار کرلیا جائے۔ انگلش میڈیم کے وہ طلبہ جو ساتویں جماعت کامیاب کرچکے ہیں تو بعد سلکشن ٹسٹ اور انٹرویو کے ۴۰ ذہین طلبہ کو چھانٹ لیا جائے اور کسی ایسے اسکول میں جس کی انتظامیہ اس میرٹ کلاس کو اپنے اسکول میں چلانے کے لئے رضامند ہوں وہیں پر، ان کی تعلیم کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔ اور

ان کی تعلیم و تربیت کا اور خاص کوچنگ کا انتظام کیا جائے۔ان طلبہ کو ٹیوشن فیس کی رعایتیں یونیفارم، کتب اور اسٹیشنری سے مدد کی جائے انہیں موجودہ دور میں صنعت و حرفت کے میدان میں جو انقلابات آئے ہیں ان سے روشناس کروانے کے لئے قرب و جوار میں جو صنعتی کارخانے ہیں مہینہ میں ایک مرتبہ ان کارخانوں کو دیکھنے کا انتظام کرنا بھی شامل کیا جائے۔

آٹھویں جماعت سے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک پانچ سال کے لئے ان طلبہ کے بہتر تعلیم، تربیت اور نگرانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔اور اس مدت میں طلبہ کی تعداد بھی ۲۰۰ ہو جائے گی۔اس کا پہلا بیاج ۹۶-۱۹۹۵ء کے تعلیمی سال سے شروع ہو کر تین سال بعد ۹۹-۱۹۹۸ء میں میٹرک کے امتحان میں شریک ہوگا۔تب ہی ایک اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان طلبہ کا معیار عام طلبہ سے کس حد تک اونچا ہے۔اس کلاس کو کسی اسکول میں چلانے کے لئے چند احتیاطی تدابیر ضروری ہیں۔کیوں کہ سمندر میں یہ ایک جزیرہ ہوگا یا صحرا میں نخلستان کچھ عجب نہیں کہ یہ جماعت طلبہ اور اساتذہ کے رشک و حسد کا شکار ہو جائے۔پھر اس جماعت کے معیار تعلیم کو مسلسل اونچی سطح پر قائم رکھنے کے لئے متعلقہ اساتذہ کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت اور پروگرام بنانا ضروری ہے۔

میرٹ کلاس کی اسکیم انوکھی اور دلچسپ ہے۔پانچ سال بعد یہ معلوم ہوگا کہ یہاں کے طلبہ کن پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلہ کے مستحق ہوئے ہیں۔یہ اسکیم ضرور کامیاب ہوگی بشرطیکہ تعلیمی پروگرام پر نہ صرف گہری نظر ہو بلکہ اس کی کامیابی کے لئے مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ کے سرپرست کا تعاون بھی حاصل ہو۔تعلیم کا کام دیرپا اور صبر آزما ہوتا ہے اس قسم کی عملی شروعات نہایت مبارک اور تعلیم کے میدان میں ایک فال نیک ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین، ممتاز ماہر تعلیم

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت ایک بلورین آئینہ خانہ کی سی تھی جس میں بیک وقت ایک ہی شخص کی سینکڑوں تصویریں نظر آتی ہیں۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے ذاکر صاحب کی بیاگرفی "شہید جستجو" لکھ کہ بڑی حد تک حق ادا کر دیا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی کوتاہیوں کا تذکرہ. تے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"یہاں تو معاملہ ذاکر صاحب کی تہ دار شخصیت کے اعمال و افکار سے متعلق ہے جن کی زندگی شعلہ و شبنم، شیشہ و سنگ کے کھیل کی ایک دلاویز اور ولولہ انگیز داستان ہے"

ذاکر صاحب بعد میں چل کر ملک کے جلیل القدر عہدوں پر فائز ہوئے لیکن وہ اول و آخر استاد تھے۔ ان کے خمیر میں استاد بننے کی صلاحیت بچپن سے موجود تھی۔ جب وہ نائب صدر جمہوریہ اور راجیہ سبھا کے چیرمین بنے تو اراکین نے بڑی گرم جوشی سے مبارک باد دی۔ اسکے جواب میں ذاکر صاحب نے کہا کہ ------- "تعلیم ہی در حقیقت ہماری جمہوری زندگی کی روح ہے۔ کوئی بھی قوم جو ہماری طرح قدیم بھی اور جدید بھی، بجا طور پر تعلیم ہی کو اپنی زندگی کی مخصوص تشکیلی قوت قرار دے سکتی ہے ---۔ اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کیوں ایک ایسے شخص کو ہندوستان کا نائب صدر جمہوریہ چنا ہے جس نے اب تک ایک اسکول ٹیچر کے کام کے علاوہ اور کوئی اہم کام نہیں کیا ہے ---"

ذاکر صاحب اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے طلبہ کی انجمن میں " طالبعلم کی زندگی " پر ایک مضمون پڑھا۔ دیکھئے اس کمسن طالب

علم کے خیالات کیا تھے ۔" دولت پیدا کرنا طالب علم کی زندگی کا بدترین مقصد ہے آرام طلبی سے کنارہ کشی کرنا چاہیئے ۔جو علم اور خیالات کے ان خزانوں سے جو ہزاروں برس میں سینکڑوں نسلیں اپنے آئندہ آنے والے وارثوں کے لئے چھوڑی گئ ہیں فائدہ حاصل کرنا چاہیئے ۔۔۔۔۔"

"کسے معلوم تھا کہ آگے چل کر یہی مضمون ان کی کتاب زندگی کا عنوان بن جائے گا" (شہید جستجو)

ذاکر صاحب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں اپنی والدہ اور اٹاوہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین کی تعلیم و تربیت کو بڑا دخل تھا ۔ان کے خاندان کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ڈاکٹر، انجنیئر یا اپنے والد کے مانند وکیل بن جائیں، اور وہ اپنی قابلیت سے اس میں بھی وہ نامور ہوتے لیکن ۔۔۔۔"پیشہ تعلیم کو ذاکر صاحب کے خیالات ، قوموں کے مد و جزر اور انسانیت کے عظیم فلسفی کے روپ میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا"

تعلیمی خیالات کی تشکیل:۔

ذاکر صاحب کی زندگی کے گہرے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ ماہر تعلیم کے لئے چند باتیں ضروری ہیں ۔ایک تو ذاتی قابلیت و صلاحیت کے علاوہ ایک طرح کا ادراک و وجدان اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا مرکب ہونا ضروری ہے ۔دوسری خوبی یہ کہ بچوں سے محبت کا فطری جذبہ اور پیشہ تعلیم سے فطری لگاؤ کا ہونا ضروری ہے ۔تیسری بات بچوں کے سیکھنے کے عمل اور اپنے تدریسی تجربوں کا اندرونی تجزیہ بہت ضروری ہے ۔جس کا حاصل ہر سبق کو ایک آرٹ کے نمونہ میں ڈھالنا ہوتا ہے ۔جس

سے بچوں کے چہروں پر خوشی کی لہریں پھیل جاتی ہیں یہی استاد کا بڑا انعام ہے۔ فروبل پستا نوری، مانٹی سوری، جان ڈیوی، ٹیگور، گاندھی جی اور ذاکر حسین اس راز سے آشنا تھے۔

ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ تعلیم معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے جرمنی گئے وہاں پر وہ مغربی مفکرین کے تعلیمی خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ برٹرنڈ رسل سے بھی وہ بہت متاثر تھے لیکن وہ لکھتے ہیں۔۔۔۔۔

میری تعلیمی فکر کا قریب قریب سارا ڈھانچہ اسی جرمن فلسفی، کیرشن اسٹائز کا منت کش ہے گو اس میں آگے چل کر گاندھی جی کے فیض صحبت سے اور ان کے بعض تعلیمی نکتوں کی تفسیر کرنے سے قوت کی گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی الفاظ ارادے بن گئے، اور ایک ناپائیدار نظری خاکہ زندگی کا مستقل جزو ہو کر رہ گیا۔۔۔۔۔

گاندھی جی سے مل کر میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے کام کو احترام کے جذبہ سے کرنا چاہئے اور اپنے اندر تواضع اور انکسار پیدا کرنا ہے۔اس کے لئے جتنا بڑا کام ہوتا ہے اسی قدر اس کے مطالبات مشکل اور محنت طلب ہوتے ہیں

کام کا مدرسہ (ACTIVITY SCHOOL)۔

جرمن فلاسفر کیرشن اسٹائز نے کام کے مدرسہ کا عملی نمونہ پیش کیا۔ تعلیمی مسئلہ کو پانچ متعین پہلوؤں کو سامنے رکھ کر حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جسمانی، ذہنی، سماجی، جمالیاتی اور اخلاقی۔کام کے مدرسہ نے کام کے تصور کو شرف بخشا کہ اس کے نزدیک یہی وہ قوت تھی جس نے انسان کو وحشی کی سطح سے اونچا اٹھایا تھا۔اور تہذیب و تمدن کو جنم دیا۔اس مدرسہ میں تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انسان کی تخلیقی قوت کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا۔۔ تمام فلسفی اس بات پر متفق

ہیں کہ ذہن انسانی کی بنیادی خصوصیت، مصروفیت اور حرکت ہے اس کا مطلب "تخلیق مسلسل"

کام کی اہمیت:۔

جس تعلیم میں ہاتھ کے کام کو صحیح مقام حاصل نہیں ہے وہ ناقص ہے ۔ اس سے انسان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا اصل حاصل نہیں ہوتا۔ کام ریاضت ہے ۔ کا عبادت ہے ۔ کام، کام ہے، جو کام بے مقصد ہو وہ کام نہیں ہو سکتا۔ ہر کام کی چا منزلیں ہیں ۔ اول کام کا نقشہ یا پلان ذہن میں یا کاغذ پر بنانا، اس کام (پراجکٹ) ک تکمیل کے لئے ضروری میٹریل (سامان) کی فراہمی، تیسرے کام کی تکمیل اور چوتھے اس بات کی جانچ کہ کام کس حد تک تشفی بخش طریقہ پر پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔

جامعہ ملّیہ کی ذمہ داریاں:۔۔

جب وہ جرمنی میں تھے، معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ پیسہ کی کمی کی وجہ بند ہونے کو ہے ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے دو ساتھیوں، عابد حسین اور مجیب سے مشورہ کے بعد اس کے چانسلر حکیم اجمل خان کو لکھا کہ جامعہ کو بند نہ کیا جائے ہم آکر اس کی ذمہ داری سنبھال لیں گے ۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ذاکر حسین اس کے وائس چانسلر، شیخ الجامعہ کا جائزہ لیا اور ۲۵ سال تک ڈیڑھ سو روپے ماہانہ پر کام کیا جس کی نظیر ہندوستان میں کسی اور جگہ نظر نہیں آتی ۔ جبکہ انہیں آٹھ سو، ہزار روپے ماہانہ کے آفر آرہے تھے ۔ وہ چاہتے تو اپنی زندگی بڑی شان اور شوکت سے گزار سکتے تھے لیکن اس مردِ مومن نے ملّت کی تعلیم کے کام کے لئے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ اس کے حوالہ کر

دیا۔اس اخلاص و ایثار اور اس عظیم مقصد کے لئے ایسی عشق و الہانہ کی مثالیں بہت کم دیکھنے یا سننے میں آتی ہیں۔جامعہ ملیہ کے ۲۵ سالہ جشن سلور جوبلی میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے جو اشعار پڑھے اس مجاہد کی زندگی کی کسی حد تک ترجمانی کرتے ہیں۔

یہی ذاکر جو پیکر تھا کبھی حسن وجوانی کا
ذرا پوچھو تو باعث کیا ہے اس کی ناتوانی کا
لہو کا قطرہ قطرہ وقف گلشن کر دیا اس نے
جمال ذات سے پھولوں کا دامن بھر دیا اس نے
کبھی ان کی نظر پڑتی نہیں اسباب زینت پر
خدا رحمت کرے ان عاشقان پاک طینت پر

بنیادی قومی تعلیم کا تصور (گاندھی جی کی وردھا اسکیم)

۲۲ / اکتوبر ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی کی ایما پر " مفت لازمی خود کفیل تعلیم" سے متعلق ایک آل انڈیا ایجوکیشن کانفرنس وردھا میں منعقد ہوئی۔گاندھی جی نے ڈیڑھ گھنٹہ میں اپنی اسکیم کے خدوخال پیش کئے ۱۔پرائمری تا ہائی اسکول کی تعلیم میں کسی حرفہ ، صنعت کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور باقی سارے مضامین اسی ضمن میں پڑھائے جائیں۔۲۔جو مدرسہ کھولے جائیں وہ اپنا خرچ آپ برداشت کریں۔طلبہ جو چیز تیار کریں گے اس کی فروخت سے اسکول کے اخراجات برداشت کیئے جائیں۔۳۔سیرت کی تشکیل کتاب کے ذریعہ نہیں ہوتی ہاتھ کے کام سے ہوتی ہے۔خالی دماغ سے کام لینا آدمی کی صفت نہیں شیطان کی صفت ہے

گاندھی جی نے آخر میں حاضرین سے رائے طلب کی۔کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ کچھ بولیں سب ان کی عقیدت سے دبے جا رہے تھے۔ذاکر صاحب اٹھ کھڑے

ہوئے ۔اور کہا کہ گاندھی جی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو ایک نئی صورت دے رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے ۔سچی تعلیم ۱۳۔برس کی عمر تک چیزوں کو بگاڑنے ، بنانے ، توڑنے اور جوڑنے کا رجحان رہتا ہے مدرسہ کو خود کفیل بنانے کے بارے میں ذاکر حسین نے برجستہ کہا کہ " استاد غلاموں کو ہانکنے والے افسروں کی حیثیت اختیار کر لیں گیں ۔ غریب بچوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں گے ۔ایسی صورت میں نکلی کتابوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگی " گاندھی جی اس تنقید پر بہت خوش ہوئے اور ذاکر حسین ہی کو سات سالہ بنیادی تعلیم کا نصاب تیار کرنے والی کمیٹی کا صدر بنادیا ذاکر حسین رپورٹ پر بہت تنقیدیں ہوئیں ۔ سینکڑوں اندیشے ظاہر کئے گئے ۔ چند ریاستوں میں اس نصاب کو بے دلی سے شروع کیا گیا ۔ ذاکر صاحب اس اسکیم کے رموز سمجھاتے سمجھاتے بہت ہلکان ہو گئے ۔ بالاخر یہ اسکیم ناکام ہو گئی ۔ یہ ایک طویل داستان ہے ۔

سیاست اور تعلیم-----

سر سیدؒ کا خیال تھا کہ تعلیم کو ہر حال میں سیاست کے شور شرابے سے الگ تھلگ رکھا جائے ۔ لیکن ذاکر صاحب کا خیال تھا اس کے برعکس تعلیم کو سیاست سے دور رکھنے کا نہیں تھا ۔ وہ کہتے ہیں کہ " تعلیم کسی طرح اتنی آسان چیز نہیں جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں ۔ اس کے برخلاف تعلیم حیرت انگیز طور پر پیچیدہ ہے ۔ تعلیمی اور سیاسی کوششوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم ایک ایسی دنیا کے افراد پیدا کر رہے ہیں جن کا اس دنیا کی تشکیل مین کوئی حصہ نہ ہوگا ۔آج سے دس برس بعد مسلم ہندوستان کو کس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہو گی ، اگر یہ نصب

العین سامنے نہیں رہاتو تعلیم ایک بے جان مشین بن کر رہ جائے گی"۔۔

1946ء مین جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی جشن میں پنڈت نہرو، مولاناابوالکلام آزاد، محمد علی جناح سب ہی شریک تھے انہیں مخاطب کر کے ذاکر حسین صاحب نے کہا۔۔

" سیاست سے ہماری دامن کشی نہ بزدلی ہے اور نہ بے لمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے۔اور تعلیم کا کام دھیمے بہنے والا امیدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلاکر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے"

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں ۲۵ سال کیا ہوتے ہیں ہاں سوئی ہوئی قوموں پر صدیاں بھی بغیر کسی قابل ذکر تغیر کے ساتھ گزرجاتی ہیں۔جن قوموں کو کچھ کرنا ہوتا ہے ان کے لئے ۲۵ سال بھی بہت ہوتے ہیں

فرد، سماج اور تعلیم۔۔

فرد، سماج اور تعلیم کے آپسی رشتے اور تانے بانے پر ذاکر صاحب نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔وہ کہتے ہیں اصل چیز سماج ہے، فرد کا وجود سماج کا محتاج ہے۔سماج کی حیثیت جسم کی ہے، فرد اس جسم کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ سماج کی مثال درخت کی سی ہے۔افراد اور ادارے پتیاں اور ٹہنیوں کے مانند ہیں۔پتیاں ہر سال گرتی جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئے کونپل اور پتیاں نمودار ہوتی ہیں۔ درخت قائم

رہتا ہے یہی حال سماج اور افراد کا ہے۔افراد ختم ہوتے رہتے ہیں لیکن سماجی زندگی کا تسلسل باقی رہتا ہے۔ہر زندہ چیز کے دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قائم رہنے کا۔جو جسم اپنے کو قائم نہیں رکھتا وہ فنا ہو جاتا ہے اور جس میں بدلتے رہنے کی طاقت نہ ہو وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ذہنی زندگی بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آسکتا ہے مگر پورے انسان کی حیثیت جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے اسکا تصور بھی ممکن نہیں۔ذہنی زندگی میں "تو" نہ ہو تو "میں" کا وجود بھی نہ ہو۔

سماج کا فرض ہے کہ نئی نسلوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے۔قومی تعلیم نہ ہو تو قومی زندگی کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے ذاکر صاحب سماج کی برائیوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے اور اس صورتحال کے متعلق کہتے ہیں ---

" اگر کوئی سماج کی برائیوں اور کربناک مناظر کو دیکھنے اور محسوس کرنے سے آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو اور بات ہے۔ورنہ اگر احساس قوی ہو تو ہر آہ سنائی دے اور ہر دکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے جیسا کوئی گھانس کی آہٹ سننے لگے۔ شائید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لاسکیں جو بپتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔

پیشہ تدریس کی اہمیت---

ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ ایسے لوگ پیشہ تدریس میں داخل نہ ہوں جنھیں اس پیشہ سے کوئی فطری لگاؤ نہ ہو۔جو شخص تعلیم کے کام کو ایک بوجھ سمجھتا ہے وہ

ساری زندگی اس بوجھ کو لادے پھرتا ہے ۔اپنی ساری زندگی بے کیف اور نامرادی سے گزار دیتا ہے وہ دو تین معصوم نسلوں کو جو اس کی کلاس سے گزر جاتی ہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے ذاکر حسین صاحب کے سامنے آجکل EDUCATION SHOPS کا شاید کوئی تصور ہی نہیں تھا جو سارے ملک میں ۱۹۸۰ء سے ترقی کر کے تعلیم بھی زراعت تجارت اور صنعت کی طرح ایک انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے ۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کوئی ذاتی قابلیت کی بناء پر آج کل ڈاکٹر انجینیر نہیں بنتا بلکہ کچھ دے دلا کر سند حاصل کرنے کے قابل بن جاتا ہے ۔اور وہ غریب ذہین طالب علم جو ملت کا زرخیر سرمایہ ہے وہ منھ دیکھتدہ جاتا ہے ۔ہمارے دانشور اور ماہرین تعلیم کا کام ہے کہ وہ اس صورت حال کا جائزہ لیں تاکہ یہ جواہر پارے کنکر پتھروں میں گم نہ ہو جائیں ۔آج وہ لوگ اسکول ، کالج اور پیشہ ارانہ کالجس کھول رہے ہیں جنھیں تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔چنانچہ ایک صاحب جو مارکٹ میں چاول کے بیوپار کا دھندا کرتے ہیں وہ دو سال تک کالج آف ایجوکیشن کھولنے کی کوشش کرتے رہے اور مجھے اسکی پرنسلی کا آفر بھی دیتے رہے ۔

تعلیم کا بجٹ :۔ راجیہ سبھا میں جب بھی مرکزی بجٹ پر بحث ہوتی ذاکر حسین کب خاموش رہتے وہ برابر قوم کے نمائندوں کو توجہ دلاتے رہے کہ تعلیم پر کم از کم قومی مجموعی پیداوار G N P کا چھ فی صد مختص کریں ۔یہی سفارش کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے ۱۹۶۶ء میں کی ۲۸ / فروری ۹۷ء / کو چدم برم بجٹ میں پورے تیس (۳۰) سال بعد صرف ایک فی صد ، یعنی دو (۲) سے تین فی صد کرنے کی کوشش کی گئی ہے ، چھ فی صد کے لئے ابھی ایکسو برس لگ جائیں گے حالانکہ یہ بات اب مسلمہ

ہے کہ تعلیم ہی ساری ترقی کی شاہ کلید ہے

اچھا استاد ذاکر صاحب خود استاد تھے ان کی خیالات اور عمل میں ایک جھلک دیکھتے جائیے ۔ تانا بانا وہی خدمت کا شوق اور بنی نوع کی محبت ہے ۔ استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم، نہیں لکھا ہوتا بلکہ " محبت کا عنوان " ہوتا ہے ۔

پستالوزی کے متعلق مشہور ہے کہ جب بچہ روتا تو اسکے آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے ۔ ذاکر صاحب ایک کند ذہن طالب علم کی خاطر دسویں جماعت میں انگریزی کا ایک سبق تین دن تک پڑھاتے رہے پھر بھی وہ طالب علم سمجھ نہ سکا ۔ اس پر ذاکر صاحب کلاس روم میں ہی رو پڑے ۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ " جب سب لوگ کسی بچہ کی تعلیم و تربیت سے مایوس ہوجاتے ہیں پھر بھی دنیا میں دو آدمی ایسے ہیں جن کا سینہ امید سے روشن رہتا ہے ایک اس کی ماں دوسرا شفیق استاد " ۔

جب پستالوزی کلاس میں داخل ہوتا تو چھوٹے بچوں کو خود سلام کرتا ۔ اس کے دوستوں نے اعتراض کیا تو اس نے جواب دیا کہ نہ معلوم میری کلاس میں کون فلسفی ، شاعر، ادیب اور پیغمبر وقت بیٹھا ہوا ہے انہیں میں آج ہی سے سلام کر لیتا ہوں، کل ان کی تعظیم کے لیئے میں زندہ نہیں ہوں گا

ذاکر صاحب کے دل میں بھی بچوں سے پیار ان کی عزت و عظمت بے حساب تھی ۔ وہ ایک چھوٹے سے پرائمری اسکول کے بچوں کو انعامات تقسیم کر رہے تھے کسی نے آکر چپکے سے خبر دی کہ آپ کی چھوٹی بیٹی، چار سالہ ، رقیہ ریحانہ کا انتقال ہو گیا ۔ لیکن وہ جلسے کے ختم تک نہایت ہی سکون واطمینان سے بیٹھے رہے تاکہ بچوں کی خوشی میں خلل نہ آنے پائے ۔

ذاکر صاحب ایک پیدائشی معلم BORN TEACHER تھے۔ان کا دل تادم حیات جامعہ ملّیہ میں اٹکا رہا۔ انہوں نے اس کے لئے بڑی تنگدستی کی زندگی گذاری تھی اور بہت کچھ اس کے لئے صحرانوردی کی تھی اور چندہ مانگنے کی ذلتیں اٹھائی تھیں تاکہ ملت کی نسلوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ایثار، اخلاص، پاک نفسی اخلاق، قومی اتحاد اور اعلیٰ مقاصد حیات کا نمونہ پیش کر سکیں شائد آئندہ چل کر کوئی ایک توی ملک میں ذاکر حسین پیدا ہوگا اور اس کے جذبہ کی حرارت قوم کی رگ و پے میں کسی حد تک بھی سرایت کر جائے تو کوئی تعجب نہیں کہ اس ملّت اسلامیہ کی زندگی میں انقلاب آجائے۔

قوم کی طرف سے ذاکر صاحب کو صدر جمہوریہ بنانا بیشک ایک بڑا قومی اعزاز تھا لیکن جامعہ سے راشٹرپتی بھون کی طرف کوچ کرتے وقت کوئی تعجب نہیں کہ ان کی زبان پر یہ شعر آگیا ہو۔۔۔۔

کعبہ سے بتکدہ کو نہ تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

—— : —— : ——

تعلیم۔ایک تحریک

(اکیسویں صدی کا اہم ترین چیلنج)

جدید تعلیم کی تحریک کا نقطہ آغاز مسلمانان ہند کی تاریخ میں سر سید کی ذات سے شروع ہوتا ہے۔غدر کے بعد کے حالات نے انھیں شاید احساس کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ایک حکیم و دانا کی طرح سر سید نے قوم کے مرض کے صحیح تشخیص کی وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلم قوم کے سارے امراض کا ایک ہی بنیادی سبب تعلیم سے محرومی ہے۔۱۸۷۵ء میں ایک کمیٹی "خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی گئ جس میں سر سید کے خاص احباب شریک تھے۔جیسے اس کمیٹی کا نام دلچسپ ہے ویسے ہی اس کی روداد بھی دلچسپ ہے۔خود سر سید لکھتے ہیں۔

"میں اس کمیٹی کا سکرٹری تھا۔خاص احباب جو ممبر تھے وہ بھی یہی کہتے تھے. کہ مسلمان اور ان کی ترقی تعلیم کا خیال ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔چندہ جمع کرنے کا ذکر ہوا تو ایک زور دار قہقہہ پڑا اس خیال کو جنون اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب اپنے ایک دوست کے بازو پر امام ضامن کی نیاز کا روپیہ بندھا دیکھا تو میں نے سوال کیا کہ مسلمانوں کی قوم سے زیادہ کوئی اور اس روپے کا مستحق ہے۔وہ سبز کپڑا جس میں نذر بندھی ہوئی تھی انھوں نے مجھ کو دیا۔جب اسکو کھولا تو ایک روپیہ اور دو

منصوری پیسے تھے۔ یہہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانہ میں ڈالا گیا۔"

اس طرح جدید تعلیم کی تحریک شروع ہوئی ۔ سرسید کے سامنے تین مقاصد تھے ۔ انگریزی ذریعہ تعلیم سے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا، ان میں سائنٹفک غور وفکر کا مزاج پیدا کرنا اور اصلاح معاشرہ کے ذریعہ فرسودہ رسم و رواج کو ترک کرنا۔ وہ اپنے خاص دوست مولانا الطاف حسین حالی سے کہہ کر " مسدس " لکھوائی مسدس حالی ایک بجلی کا کڑ کا تھا جو اس ٹھیرے ہوئے پانی میں تلاطم کا باعث ہوا۔ پہلی مرتبہ مسلم قوم میں وہ امراض جو ناسور کی طرح پھیل گئے تھے۔ حالی نے سیدھی سادھی پیغمبرانہ زبان میں وہ باتیں کہدیں جو کسی خطیب یا واعظ سے ممکن نہیں تھا اور کہا

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے   کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

انگریزی ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کا حصول صرف چند اونچے طبقہ کے لوگوں کے طلبہ تک محدود رہا مسلم یونیورسٹی سے فارغ طلبہ نے عام مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کے سلسلہ میں کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دیا سوائے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے چند ساتھی ماہرین تعلیم کے جنھوں نے سیاست کی پرشور وادی میں قدم رکھنے کی بجائے قوم کی تعلیم کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ۔ان کی مقدس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مسلم قوم میں تعلیم اور اسلامی تعلیمات کی بنیاد جب تک مضبوط نہ ہو وہ کسی طرح ترقی نہیں کر سکتی۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کی تحریک طوفان کی طرح اٹھی ۔ گاندھی جی اور علی برادران

کی قیادت میں تحریک ترک موالات بھی ساتھ ساتھ چلی۔ان کی دھواں دھار تقریروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے ہندوستان میں آتش فشان پھٹ پڑا ہے لیکن ۱۹۲۴ء میں جب "ترک ناداں" نے قبائے خلافت چاک کر ڈالی تو یہ غبارہ زمین پر بیٹھ گیا اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ کانگریس کو ہوا اور سارے ملک میں کانگریس کی قیادت کا سکہ جم گیا۔اس زمانہ میں سارے قائدین کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان ۲۵، ۵۰ برس میں آزاد ہو جائے گا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قایدین نے اس تحریک آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا۔لیکن اس سارے عرصہ میں مسلم قوم میں تعلیم کو عام کرنے کے متعلق کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ان قائدن کی تقریروں اور تحریروں میں مشکل ہی سے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے، کسی اسکول کو کھولنے یا ان کی جہالت کو دور کرنے کا کوئی منصوبہ بند پروگرام کا ذکر ملے گا۔آزاد ہندوستان کے سامنے ملک و قوم کی ترقی کا نشانہ رہ گیا جس کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کی فوج درکار تھی۔جو قوم جاہل رہ گئی وہ کس طرح حکومت کی مشنری کے کل پرزے بن سکتے تھے وہ کس طرح جمہوری طرز حکومت میں کوئی موثر رول ادا کر سکتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں سارجنٹ کمیشن نے بتلایا کہ ملک میں عام تعلیم کا فی صد صرف چھ ہے تقسیم ہند کے وقت ۱۴ فی صد مسلمانوں میں ایک آدھ فی صد تھا وہ بھی پاکستان چلا گیا پھر یہاں سے صفر فی صد سے مسلمانوں کا تعلیمی سفر شروع ہوتا ہے ۱۹۹۱ء کے اعداد شمار سے پتہ چلتا ہے کہ سارے ملک میں تعلیم کا فی صد 54.5 تھا اور مسلمانوں میں 7.4 فی صد۔ مسلم خواتین میں تعلیم کا فی صد اس طرح ایک سے بڑھ کر نہیں ہوگا۔۱۹۸۶ء میں جدید قومی تعلیمی پالیسی کے پروگرام میں مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ قرار دیا گیا۔اس وقت مسلمانوں کے تعلیمی فی صد کا اظہار بھی سرکاری رپورٹ میں کرنا مناسب نہیں

سمجھا گیا۔ یہہ اس قوم کا حال ہے جب کہ چودہ سو برس پہلے پیغمبر اسلام پر سب سے پہلی آیت پڑھنے اور لکھنے سے متعلق آئی ۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا یہہ قول قابل غور ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کا کوئی عظیم دانشور بھی یہہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آں حضرت محمدؐ صلعم جو پڑھے لکھے نہیں تھے، وحی کی پہلی آیت پڑھنے اور لکھنے سے متعلق ہوگی ۔ انیل بورڈیا سکرٹری ایجوکیشن حکومت ہند نے (۴/ فبروری ۱۹۸۹ء) کو ایک آل انڈیا سیمینار کے افتتاحی جلسہ میں فرمایا " مسلمانوں کا مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی سرمایہ اتنا شاندار رہا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان کی ہمسری نہیں کر سکتی لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اس میں تعلیم سے محرومی، جہالت اور ناخواندگی کا فی صد ملک بھر میں سب سے زیادہ ہے " یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کو شروع ہوئے کوئی ایک سو بیس برس ہوچکے ہیں ۔ اس طویل عرصہ میں تعلیم کی وادی میں ہم نے صرف دس کیلو میٹر کا فاصلہ طئے کیا ہے، ہماری خواتین پیچھے کہاں پر ہیں نہیں معلوم ۔ اس رفتار سے تعلیم کے میدان میں اہل وطن کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے ہمیں کئی سو برس لگ جائیں گے ۔

تقسیم ہند کے بعد جن مسلمانوں نے اپنے وطن عزیز کو چھوڑنا پسند نہیں کیا انھیں بے شمار مصائب برداشت کرنے پڑے ۔ ایک عرصہ تک ان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہے ۔ علی گڈھ تعلیمی تحریک کے ٹھیک ایک سو برس بعد ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ تعلیم کے میدان میں پھر کچھ حرکت کے آثار پیدا ہوئے اس سلسلہ میں ہمدرد ملت جناب سید حامد کا نام لینا ضروری ہے ۔ جنھوں نے اپنی پرمغز تقاریر اور تحریروں سے مسلمانوں میں تعلیم کی اہمیت اور اصلاح معاشرہ کے پروگرام پر توجہ دلائی اس کا اثر کسی حد تک یہہ ہوا کہ شہر اور قصبات میں تعلیمی ہل چل پیدا ہوئی ۔

اسکول کالج، فنی ادارے، دینی درسگاہوں کا قیام خوش آئندہ علامات ہیں۔ بنگلور میں الامین تحریک کی وجہ جنوبی ہند میں کوئی ایک سو سے زائد ادارے ہائی اسکول، کالج، ہاسپٹل اور پروفیشنل کالج چل رہے ہیں جن میں ۴۰ ہزار سے زائد طلبہ تعلیم پارہے ہیں "الامین" تعلیم، صحت، معیشت، بنک کاری، صلاح وفلاح کے کاموں میں ایک باوقار نام ہے۔اس کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا نام جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی علامت بن گیا ہے۔

اس سلسلہ میں ۔ ISLAMIC DEVELOPMENT BANK JEDDAH کی فیاضانہ مالی امداد کا تذکرہ ضروری ہے، اس کے سنٹرل کنوینر ڈاکٹر حیدر خان نے بتلایا کہ گونمنٹ آف انڈیا کی شرائط کے تحت IDB کے ذریعہ ایسے تعلیمی، فنی اور فلاحی اداروں کو بلڈنگس کی تعمیر یا مشنری کی خریدی کے لئے امداد دی جاتی ہے جہاں پر داخلہ سب کے لئے کھلا ہے۔ ۱۹۸۴ء سے اب تک سارے ملک میں (۱۷۰) ادارے اس اسکیم سے مستفید ہو چکے ہیں۔بہت سے اور انتظامیہ کے لوگ بھی ان شرائط کی تکمیل کے لیئے کوشاں ہیں۔

ملک میں تعلیمی شعور کے بیدار ہونے میں اس مہم کو بھی بڑی حد تک دخل ہے۔لیکن تعلیم کو تحریک میں تبدیل کرنے کے لئے ابھی کام باقی ہے۔اس نقطہ نظر سے اہل علم و دانش کے غور و فکر کے لئے چند عملی تجاویز پیش ہیں لیکن یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ اب کوئی عظیم لیڈر یا مصلح قوم کے ظہور کا انتظار بے کار ہے۔ اس جمہوری دور میں یہ کام اداروں کے قیام کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

(۱) علم کی تفسیر میں شکوک وشبہات دور کرنا ضروری ہے۔

ایک زمانہ سے عام مسلمان علم کی تفسیر میں الجھے ہوئے ہیں۔ علم صرف دینی

تعلیم ہے باقی سب جہل ہے ۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں یہہ بات آگئی ہے کہ جدید تعلیم دنیا کے حاصل کا ذریعہ ہے جو اصل مقصود نہیں ہے ۔ یہہ تفسیر قرآن کی آیات سے میل نہیں کھاتی وعلّم آدم الاسماء کلّھا اللہ تعالیٰ نے آدم (انسان) کو ان ساری اشیاء کا علم دیدیا جو زمین و آسمان کے درمیان ، نیچے اور اوپر موجود ہیں ۔

علم الانسان مالم یعلم ۔ ہم نے انسان کو سب کچھ سکھادیا ہے جو وہ نہ جانتا تھا ۔ اس میں دین و دنیا کی سب تعلیم آگئی ۔ سائنس کی ایجادات ، انکشافات ، دنیا کی ساری اشیاء کی ماہیت کی دریافت اور ہر وہ علم جو انسان کی ترقی کا ضامن ہے اور جو آج معلوم اور جو کل معلوم ہوگا ان سب کا احاطہ ان آیات نے کر دیا ہے ۔ دین و دنیا کے علم کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دینے سے جدید ذہن تذبذب کا شکار ہو چکا ہے اگر ایک مرتبہ اس قسم کا شک وشبہ دل و دماغ میں بس جائے تو کوئی طالب علم اپنے شعبہ کے علم کی انتہا تک پہنچنے کے خیال کو ترک کر دیتا ہے ساری مسلم قوم کے لئے یہ ایک نفسیاتی بریک ہے ۔ اس کے لئے ہندوستان کے علمائے دین ، دانشور حضرات اور تبلیغی جماعت کے امیر ایک نکتہ پر جمع ہو کر غور فرمائیں اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیں کہ دینی اور عصری تعلیم میں ایسی کوئی دوری نہیں ہے اگر ایک مرتبہ یہ ذہنی تذبذب دور ہو جائے تو علم کے ہر میدان میں ترقی کی راہیں کھل جائیں گی ۔

(۲) مسلم ایجوکیشن فنڈ کا قیام : ۔ MUSLIM EDUCATION FUND

سارے ملک میں مختلف اداروں کے تعلیمی اور فلاحی ٹرسٹ قائم ہیں اور بعض اہل خیر

کے فیملی ٹرسٹ تعلیم اور فلاحی کاموں میں مدد دینے کے لئے قائم ہیں ۔لیکن کوئی ایسا مرکزی ٹرسٹ یا ریاستی سطح پر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ٹرسٹ قائم نہیں ہے ۔ملک کی با اثر باوقار، قابل اعتماد شخصیتوں کے ذریعہ اس قسم کا تعلیمی فنڈ چند کروڑ روپے کی رقم کی حد تک قائم ہو جانا کچھ محال معلوم نہیں ہوتا ۔لیکن آج تک ریاستی یا آل انڈیا سطح پر اس قسم کی کوشش نہیں کی گئی ۔اس قسم کی ہر تجویز کو ہم پہلے ہی ناممکن کے گمان سے شروع کر نہیں پاتے ۔اس وقت اہل خیر کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے لیکن اہل ہمت مخلص بندوں کا قحط ہے جو صدا لگانے سے شرماتے ہیں ۔اگر ہر ریاست میں اس قسم کا پانچ دس کروڑ کا تعلیمی ٹرسٹ قائم ہو جائے تو مسلمانوں کے تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو جائے گا جو ریڑھ کی ہڈی کی طرح سارے ڈھانچہ کو سنبھالے رہے گا ۔ہمارے سارے اچھے پروگرام پیسہ کی کمی کی وجہ درمیان ہی میں دم توڑ دیتے ہیں ۔

یوم آزادی ۱۵ / اگست ۹۵ء کو ہمارے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی بھلائی کے لئے ۵۰۰ کروڑ کی خطیر رقم مختص کی جائے گی ۔ہر ریاست کو اس میں سے حصہ ملے گا یہ رقم کس طرح آئے گی اس سے قطع نظر اگر اس بھاری رقم کا پانچواں حصہ اقلیتی ایجوکیشن فنڈ کے طور پر محفوظ کر لیا جائے تو مسلمانوں پر دوسری اقلیتوں کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہیں کھل جائیں گی ۔شاید حکومت ہند کو ایسی تجویز کی معقولیت سے انکار نہیں ہوگا بشرطیکہ اقلیتی کمیشن اور مسلم دانشور اور سیاسی قائدین اس تجویز کو موثر انداز میں پیش کریں ۔

(۳) تعلیمی کاروان:۔

اترپردیش میں جناب سید حامد کی قیادت میں اب تک چار مرتبہ تعلیمی کاروان نکالے

گئے جو مختلف اضلاع کا دورہ کر چکا ہے ۔ اس کاروان میں شہر کے پروفیسر ڈاکٹر، انجنیر، ایڈوکیٹس ، ماہرین تعلیم ، صنعت کار، سوشیل ورکرس شامل رہے ان کے جانے سے دیہات ، قصبات اور اضلاع میں کافی روشنی آئی ۔ اس کاروان کا اصل مقصد تعلیم کی تحریک کو پہنچانا اور اصلاح معاشرے کے کاموں پر توجہ دلانا تھا ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کے نہایت مفید نتائج سامنے آئے ہیں اس قسم کے کاروان ہر شہر سے نکالے جاسکتے ہیں ۔ اس کے اثرات بہت دور رس ہوں گے ۔ لکھنے اور بولنے سے زیادہ اس قسم کے تعلیمی کاوران سے اس تحریک کو بڑی تقویت ہو گی ۔

تعلیم ایک منفرد قسم کا ادارہ ہے جس کے لئے مقامی لیڈر شپ کو متحرک کرنے اور مقامی وسائل استعمال کرنا ضروری ہے ۔

(۴) دینی تعلیمی کونسل کا تجربہ :۔

ہماری مسلم آبادی کا ۶۵ فی صد حصہ دیہات میں رہتا بستا ہے عام طور پر شہروں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی دلچسپی اپنے اطراف و اکناف کے تعلیمی مسائل سے رہتی ہے ۔ اصل کام ان دور درواز دیہات کی مسلم آبادی کا ہے جن میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب برائے نام ہے ۔ اترپردیش میں تعلیمی کونسل نے گذشتہ چالیس سال کے عرصہ میں دیہات میں کوئی تیس ہزار اردو میڈیم پرائمری اسکول کھول لیئے ہیں جہاں پر پانچویں جماعت کے بعد یہہ طلبہ سرکاری یا خانگی اسکولوں میں جہاں ہندی یا انگلش میڈیم ہے ، شریک ہوجاتے ہیں اس پروگرام میں مقامی آبادی کو بڑی حد تک متحرک کر دیا گیا ہے ہندوستان کی آزادی کے بعد دیہات میں تعلیم کا جال پھیلانے میں دینی کونسل کا یہہ قابل ستائش کارنامہ ہے ۔

اس اسکیم کو کارنامہ کہنے کی وجہہ یہ ہے کہ ساری دنیا کے ماہرین تعلیم کا اس

ایک بات پر اتفاق ہے کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم گیارہ سال کی عمر تک اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیئے ۔ دینی تعلیمی کونسل نے مادری زبان اردو میں پانچویں جماعت تک تعلیم کا انتظام کر دیا ہے ۔ اور اپنے مذہب اور کلچر کو بھی اس ابتدائی دور ہی میں محفوظ کر لینے کا انتظام کر لیا یہ بچے بڑے بھی ہو جائیں چاہے وہ کسی ذریعہ تعلیم سے آگے تعلیم پائیں اور کیسے ہی ماحول میں نشو نما پائیں، وہ اپنے ہی خاندان اور اپنے ہی لوگوں میں اجنبی نہیں رہیں گے اور نہ اسلامی تعلیمات سے وہ دور ہو جائیں گے ۔ دوسری طرف دستور ہند کی دفعہ کا منشاء بھی پورا ہوتا ہے کہ اقلیتوں کو اپنی مادری زبان، کلچر اور مذہب کی حفاظت کے لئے وہ خود اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں مسلمانوں میں انگریزی میڈیم یا مقامی زبانوں میں تعلیم کا مسئلہ الجھن کا باعث رہا ہے اس کا ایک معقول حل دینی تعلیم کونسل کا یہی تجربہ ہے ۔

(۵) تعلیم کو تحریک میں تبدیل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قصبات اور اضلاع میں تعلیمی کمیٹیاں بنائی جائیں جس کے اراکین ہر سیاسی اور مذہبی جماعت کے ہو سکتے ہیں ۔ عوامی ذرائع ابلاغ، اور پریس موثر رول ادا کر سکتے ہیں ۔ آپ کی انفرادی کوششیں بھی بہت کام کی ہیں ۔ اپنے محلہ یا خاندان کے غریب اور بے یار و مددگار بچوں کو کسی قریبی اسکول میں شریک کروائیں ممکن ہو تو ان کی کاپیوں، کتابوں، اور فیس سے مدد کریں ۔ چاہے وہ ایک طالب علم ہی کیوں نہ ہو ۔ اس قسم کی امداد سے معاشرہ میں ایک تحریک اور تعلیم سے دلچسپی پیدا ہوگی ۔

حکومت ہند کو دیر ہی سے ہی اب اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ بہترین سرمایہ کاری انسانی وسائل کے فروغ میں ہے اور انسانی وسائل کی ترقی تعلیم کے بغیر کسی حال ممکن نہیں اس لیئے بہترین سرمایہ کاری کا شعبہ تعلیم ہی ہے جو ملک و قوم کی ہمہ

جہتی ترقی کا ضامن ہے۔اس کی خاطر قومی آمدنی کا ۶ فی صد حصہ مختص کیا جائے گا اس کی خاطر دیہات کے بچوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے دوپہر کے کھانے کی اسکیم کا آغاز کیا جا چکا ہے، تعلیم بالغان، اکشرا جیوتی، بال واڑی، آنگن رواڑی، قسم کی کئی تحریکیں چل رہی ہیں مسلمان ان سب اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں جب تک کہ تعلیم کو مسلمانوں میں عوامی تحریک کے طور پر تبدیل نہ کیا جائے اور یہ کام حکومت کا نہیں اپنوں کے کرنے کا ہے اکیسویں صدی کا اہم ترین چیلنج تعلیم ہی ہے اگر ان باتوں پر عملاً غور کیا جائے تو 2015 تک مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط قابل لحاظ حد تک بڑھنے کی توقع ہے۔

مرض کی شناخت اور بے علاج

ہفتہ وار "ندائے ملت" (لکھنؤ) ۱۷/ مارچ ۱۹۹۱ء سامنے ہے اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے رشحات قلم اکثر پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہوتے ہیں مندرجہ ذیل نوٹ پڑھ کر بہت دیر تک سوچ میں ڈوب گیا۔

"خدا معلوم اسلام کی وہ کونسی تعلیمات ہیں جس کے نتیجہ میں اچھے بھلے انسانوں کو معذور اپاہج اور بے مصرف و بے توفیق بنانے کا جواز حاصل ہوگیا ہے دین کیلئے طاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اسلام کے ابتدائی دور میں دونوں چیزوں کو عمومیت حاصل رہی

مسلمانوں کے پاس سب سے بڑا ایٹم بم کفر کا فتویٰ ہے۔ کسی مسلمان نے جدید علوم سیکھنے کی بات کی اس پر یہ ایٹم بم داغ دیا۔"

ڈاکٹر صاحب نے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بڑی گہری حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں کہ آپ مرض کی شناخت کر لیں اور کوئی نسخۂ کیمیا اس مرض سے نجات کے لئے تجویز نہ کریں۔ اس مرض کے آثار اب اتنے واضح ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی حکیم امت اس مرض سے شفا پانے اور نجات حاصل کرنے کے نسخے بھی بتلا دے تو شاید بہت جلد اس افسردہ قوم میں کچھ زندگی کے آثار پیدا ہوجائیں اور وقت کا شدید ترین تقاضا بھی یہی ہے۔

علامہ شبلی نے دیار مغرب کی سیر کے بعد کسی جگہ کچھ اسطرح اس گہری حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ وہ کیا بات ہے کہ مغربی اقوام سارے عالم پر اپنی برتری

قائم کیئے ہوئے ہیں اور ساری دنیا میں عزت سے دیکھی جاتی ہیں۔علامہ کا بیان ہے کہ ہمارے اسلامی مدارس سے جو طلباء نکلتے ہیں انہیں کچھ اسطرح کی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ بہت ہی مسکین، شرمیلے، صابر و قناعت پسند اور دنیا سے کنارہ کش رہنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ان کے برخلاف انگریز قوموں میں جدوجہد، اشیاء کی کھوج، سائنس اور علوم میں کمال حاصل کرنے کا جذبہ جدت پسندی اور مہم جوئی کا حوصلہ اور جوش بے حد پایا جاتا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ ان قوموں نے سائنس ٹکنالوجی، انجنیرنگ میں اتنا کمال حاصل کرلیا کہ ساری دوسری قومیں ان کی ایجادات اور کمالات پر نہ صرف حیران ہیں بلکہ ان کی سائنس اور علوم کی طاقت کے سامنے ساری دنیا زیر و زبر ہے کسی دانشور کا یہہ کہنا درست ہے کہ دراصل اسلامی طاقت کا زوال سترھویں صدی کے وسط سے انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد سے شروع ہوا۔یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں مذہب اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے علوم و فنون میں ترقی کا بڑا دخل ہے۔ پروفیسر مجیب نے "دنیا کی کہانی" میں یہ بات لکھی ہے کہ انگریزوں کا کہنا ہے کہ بے شک مسلمانوں نے مغرب کو بہت سے علوم و فنون سے روشناس کرایا لیکن مسلمانوں نے مزدوروں کا سا کام کیا ہے۔وہ ان سارے علوم و فنون کا بوجھ سر پر لاد کر لائے اور یورپ کی منڈیوں میں اتار کر دور بیٹھ گئے کوئی چھ سو برس سے اس قوم پر جمود طاری ہے۔اس کی کوئی ایجاد ہے اور نہ کارنامہ کسی علم و سائنس میں دیکھنے یا سننے میں آیا۔اب اس کے دریا میں نہ طلاطم ہے نہ طوفان۔

ان کے ذہن و فکر کی سمت زیادہ تر خانقاہی نظام زندگی کی طرف ہے اپنے آپ کو سمیٹنے اور پیچھے رہ جانے پر زیادہ زور ہے۔یہ زیادہ تر اب رحم و کرم کے طالب ہیں یہ ذہن مسلمانوں میں برسہا برس میں تیار ہوا ہے سنتے ہیں کہ جب نیا نیا لاوڈ اسپیکر

ایجاد ہوا تو اسکے مساجد میں استعمال کے خلاف فتوے دئے گئے۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید اپنی تقاریر میں کہتے تھے کہ یہ لایعنی بحث دس برس تک جاری رہی جبکہ اس مدت میں روس نے اپنے دو پنج سالہ منصوبے مکمل کرلیئے۔

ایک اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلمان نوشتہ دیوار پڑھنے سے بہت کتراتے ہیں آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند رکھتے ہیں سب کچھ کانوں سے سنتے ہوئے بھی سننا نہیں چاہتے قریب قریب دنیا کے اکثر مسلم ملکوں کا یہ حال تھا کہ صدام حسین کی تائید میں زبان خشک نہیں ہوتی تھی وہ سالار اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی ہوگا جو امریکہ اور اسرائیل کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ جنگ ہرگز ہرگز نہیں ہوگی۔ اگر ہوگی تو دس برس جاری رہے گی۔ اور تب تک امریکہ خاک میں مل جائے گا۔ جب یہ غبارہ ۴۲ دن کی جنگ کے بعد ہی پنکچر ہوکر شرمناک شکست سے دو چار ہو گیا تو سارے مسلمانوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں اب کوئی اس عنوان کا تذکرہ بھی نہیں کرتا اور ہر طرف خاموشی ہے۔ حقائق کی دنیا میں مسلمان جینا نہیں چاہتے وہ حد سے زیادہ بھولے پن کا ثبوت دیتے ہیں اور ہر بڑے واقعہ کا بہت سرسری تجربہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ جس نے اپنی سخت ناعاقبت اندیشی، ضد اور عناد سے لاکھوں کی جان و مال کو برباد کیا، اپنے ملک اور اپنی قوم کو افسوس ناک تباہی سے دوچار کر دیا اسکے خلاف کوئی چند جملے بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ یہی حال چھوٹے پیمانے پر حیدرآباد کے نادان لیڈر قاسم رضوی کا تھا۔

فسادات کا چکر ایک مستقل روگ بن گیا ہے۔ یہ فسادات کوئی اتفاقی حادثات نہیں، بلکہ بہت سوچے سمجھے پلان کے تحت یہ فسادات کروائے جاتے ہیں۔ اس کے لئے پچاس برس سے تیاریاں ہورہی ہیں چھوٹے چھوٹے بچوں کے دلوں میں

نفرت کی آگ بھردی جاتی ہے۔یہی بچے اب بڑے ہو کر ہر شعبہ زندگی میں اور ہر محکمہ میں موجود ہیں۔ہر منزل پر مسلمان کو ان کی نفرت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ باتیں اب کھل کر ہر اسٹیج میں سننے میں آتی ہیں کہ مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو اسپین میں ہو چکا ہے ان سب باتوں کو سامنے رکھکر دیکھئے تو ہماری تیاریاں صفر کے برابر ہیں۔

اکثر مسلمان تائید غیبی کے منتظر ہیں۔تائید غیبی کے سب سے زیادہ مستحق مولائے کائنات حضور اکرم صلعم تھے۔آپ کو نہ تو جنگ بدر میں جانے کی ضرورت تھی نہ جنگ احد میں، ۷۲ صحابہ شہید ہوئے اور نہ اس جنگ میں شکست اٹھانی پڑتی اور نہ جنگ خندق کی تیاریوں کے لئے مدینہ کے باہر خندقیں کھودنی پڑتیں رسول اکرمؐ نے اپنی امت کے لئے زندگی کے ہر پہلو کے لئے ایک زندہ نمونہ پیش کر دیا ہے۔ ورنہ کیا عجب تھا کہ آپ کفار ومشرکین کے لئے بددعا کر دیتے اور وہیں پر دشمن کا لشکر تباہ ہو جاتا۔ایسا کبھی نہیں ہوا۔جنگ بدر میں فرشتوں کی مدد میدان جنگ میں آئی۔ جنگ سے پہلے ہی مدد نہیں کی گئی۔مولانا یعقوبؒ بھوپالی کا کہنا تھا کہ انسان اپنی والی پوری جدوجہد کرے اور پھر جب وہ اپنے ہر سہارے اور کوشش سے مایوس ہو جاتا ہے تب اللہ کی مدد آتی ہے۔

حضور اکرمؐ لوگوں کو شمشیرزنی، شہسواری اور تیر اندازی میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے رہے اور جہاد کے لئے سامان تیار کرنے کا حکم دیتے حجتہ الوداع کے موقع پر حاجیوں کو "رمل" کرنے کی ہدایت دی۔طواف کعبہ کے پہلے تین چکر اکڑ کر سینہ تان کر شانے اچھال کر چلنے کا حکم آج بھی ہر حاجی کے لئے ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کفار پر رعب طاری ہو جائے اور انہیں یہ گمان نہ ہو کہ مسلمان کمزور،

نحیف ولاچار ہیں۔ یہ سب اسی لئے تھا کہ دین کی طاقت کا اظہار ہو آج دین کی طاقت کے اظہار کے پیمانے بدل چکے ہیں، لیکن رسول اکرمؐ کے اصل مشن کی اسپرٹ اور روح وہی ہے۔ آج سائنس، فن، ٹکنالوجی، ریسرچ، علم و دانش و بصیرت کا دور ہے جو قوم ہر لحاظ سے محتاج و اپاہج ہو چکی ہو، دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کے لئے تیار ہو جائے تو ظاہر ہے کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو خلیفتہ اللہ کہلانے کا مستحق سمجھ سکتی ہے۔ نہ تو دین اسلام کی تعلیم ہے اور نہ اسلام کا اصلی روپ ہے۔ کسی طرح لشتم پشتم زندگی بسر کر لینا مسلمان کی خودداری اور مذہب کی روح کے خلاف ہے۔

اب اس مرض کا تریاق بھی صاحب مسند ارشاد کے پاس ہی ہے علمائے دین ہی اس ذہن کو نیا موڑ اور مثبت پہلو دے سکتے ہیں کاش کوئی حکیم امت اس پہلو پر غور کرے اور اس مردہ و افسردہ قوم میں نئی روح پھونکے اور انھیں جدید تقاضوں سے آشنا کر دے۔

میسکو ٹیلنٹ سرچ اسکیم

MESCO TALENT SEARCH - SCHEME

مسلم ایجوکیشنل ، سوشیل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن (MESCO) کو قائم ہوئے چودہ سال کا عرصہ ہو گیا۔اس کے نام اور کام سے بہت سے لوگ واقف ہو چکے ہیں یہاں پر ان سب فلاحی کاموں کا تعارف کروانا نہیں ہے بلکہ ایک خاص اسکیم جو ذہین طلباء کی تعلیم کوچنگ اور رہنمائی کے سلسلہ میں شروع کی گئی ہے اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالنا ہے۔

عام تعلیم کے ساتھ گذشتہ دس برس سے یہہ بات شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ پروفیشنل کورسس میں شرکت ہو یا آل انڈیا سرویسس کے مسابقتی امتحانات ہوں ۔ محض اسکول یا کالج کی تعلیم کی بنیاد پر کسی سلکشن میں آجانا ناممکن ہے جب تک ان امتحانات میں شرکت کے لئے خاص قسم کی کوچنگ نہ لی جائے ۔ اسکولوں اور کالجوں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ کوچنگ سنٹرس کا جال بھی پھیلتا رہا ہے۔ یہہ دراصل ایک قسم کا متوازی نظام تعلیم ہے جہاں پر ان کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو انفرادی توجہہ کے محتاج ہوں اور اس سے آگے بڑھ کر مسابقتی امتحانات کے لیئے انھیں تیار کیا جاتا ہے۔لیکن اس شعبہ پر خانگی اجارہ داری ہے۔

میسکو ٹیلنٹ سرچ اسکیم وقت کا تقاضہ اوز ایک اہم ضرورت ہے۔اس اسکیم کے تحت آٹھویں جماعت سے انٹرمیڈیٹ (2 + 10) کامیاب کرنے تک پانچ

سالہ مدت کے لئے ان سو (100) طلباء کو وظائف دئے جاتے ہیں جو Talent Search Test میں کامیاب ہو جائیں۔ان میں پہلے دس طلباء کو ہر سال 1500 روپے اسکالر شپ دیا جائے گا اور باقی (90) طلباء کو پانچ سال تک 200 روپے سالانہ کتب خریدی کے لئے دئے جائیں گے۔پانچ سال کے عرصہ میں (500) طلباء یہہ وظائف پانے کے مستحق ہوں گے۔اس طرح ہر سال ان ذہین طلباء پر خطیر رقم خرچ کی جائے گی۔اس کا دوسرا اہم پہلو یہہ بھی ہے کہ ان طلباء کے لیئے توسیعی لکچرس، اکسپرٹ گائیڈنس اور ورک شاپس کا انتظام کیا جائے گا تا کہ انھیں ابتداء ہی سے ماحول، وہ تخیل اور وہ نظر حاصل ہو جائے جو مسابقتی امتحانات میں شرکت کے لئے ضروری ہے۔اس اسکیم کی ندرت سے یہاں خاص طور پر بحث ہے۔ایک عرصہ سے اس ضرورت کو محسوس کیا جا رہا تھا کہ کوئی فلاحی ادارہ اس بات کی کوشش کرے کہ

SEARCH THE TALENT CATCH THEM YOUNG

کے تحت ذہین طلباء کو بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں ڈھونڈ نکالے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کرے بلکہ ان کی راہیں بہت پہلے ہی متعین کر دے جو لوگ اپنے بچوں کو ایمسٹ امتحانات کے لئے انٹر میڈیٹ کے بعد کوچنگ کا انتظام کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنے ذہین بچوں سے سخت مایوس ہو جاتے ہیں۔اس میں بچوں سے زیادہ ماں باپ کا قصور ہے۔وہ اس بات کو سمجھ نہیں پاتے کہ ایک آدھ سال کی کوچنگ سے ان مسابقتی امتحانات میں اعلیٰ نشانات لانا آسان نہیں ہے۔ہمارے پاس ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ بعض والدین یہ شکایت لے کر آتے ہیں کہ میٹرک امتحان سے قبل دو تین سال تک ٹیوشن پڑھتا رہا لیکن پھر فیل ہو گیا۔وہ بے چارے اس راز سے واقف نہیں کہ ایک آدھ سال کی خاص توجہ سے اس پتھر میں جونک لگنے والی نہیں۔تعلیم کا

کام بڑا صبر آزما اور دس پندرہ برس تک بچوں کے تعلیمی ریکارڈ، ترقی اور ان کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیئے منصوبہ بند تعلیمی پروگرام پر عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس پس منظر میں Mescu Talent Search Scheme کی اہمیت اس لیئے ہے کہ کسی خانگی ادارہ نے کوئی ایسی اسکیم مرتب نہیں کی ہے۔ کم از کم یہہ بات اپنے علم میں نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے وظائف دینے کی اسکیمات بہت سی ہیں لیکن آٹھویں جماعت سے پانچ سال تک، انٹرمیڈیٹ کامیاب ہونے تک وظائف دینے کی کوئی اسکیم دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک وظیفہ تو وہ ہے جو ہونہار طالب علم کو میڈیسن یا انجنیرنگ میں شریک ہوتے ہی مل جاتا ہے۔ مگر میسکو کا وظیفہ ان کورسس میں شرکت کے قابل بنانے کے لیئے ہوتا ہے۔ یہی اس کی ندرت اور جدت ہے۔ ہمارے ہاں اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ ایسے بہت ذہین طلباء کی مثالیں آپ کے سامنے ہوں گی جنھیں وقت پر تھوڑی بہت مالی امداد نہ ملنے پر یا صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہہ وہ مایوس ہوکر تعلیم ہی چھوڑ بیٹھے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بات قابل غور یہہ ہے کہ اکثر طلباء (بلکہ بعض بزرگ) خود اپنی اپنی صلاحیتوں سے ناواقف رہتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے پوشیدہ خزانوں سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ ایسی واقفیت کو SELF REALISATION یا CONCIOUSNESS کہتے ہیں۔ ان ہی ہیروں کی تلاش کے لیئے مغربی ممالک میں Guidance & counselling cells ہوتے ہیں۔ جہاں پر طالب علم کی ذہانت اور طبعی رجحان کی جانچ کرکے ماہرین انھیں صحیح راستہ پر لگا دیتے ہیں جس میں وہ آگے چل کر کمال پیدا کرتے ہیں۔

آجکل یہہ بات از حد ضروری ہوچکی ہے کہ بچہ کے رجحانات ، قابلیت و ذہانت کا برسوں پہلے ٹھیک اندازہ کرلیا جائے اور اسی نہج پر اسکی تعلیم و تربیت کی جائے ۔ ورنہ اس کے دوہرے نقصانات ہوں گے جو بچہ ڈاکٹر یا انجنیر نہیں بن سکتا ، بے وجہہ والدین نے اپنا روپیہ ضائع کیا اور ساری عمر حیران و پریشان رہے ۔ بلکہ بچہ بڑا ہوکر فلم ایکٹر بن گیا یا اور کچھ ۔ ان کی امیدیں پوری نہ ہوسکیں ۔ دوسرا نقصان یہہ ہوا کہ کوئی طالب علم میں یہہ قابلیت تھی کہ وہ .I.A.S کا امتحان سر کر جاتا لیکن احساس کمتری اور خود اعتمادی کی کمی کی وجہہ وہ کوئی چھوٹی ملازمت پر قانع ہوگیا ۔ دونوں صورتیں معاشرہ کے لیئے نقصان دہ ہیں ۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ میسکو کی اس اسکیم کے خدوخال سے جو بہت بالغ نظر سے تیار کی گئی ہے اضلاع کے فلاحی ادارے فائدہ اٹھائیں اور ان ہی خطوط پر ہر ضلع کی سطح پر کم از کم پہلے سال دس طلباء ہی کو وظائف دے کر یہ بنیادی اور ٹھوس کام شروع کردیں ۔ دیکھیئے کس طرح معاشرہ میں حرکت پیدا ہوجائے گی ۔ اور یہہ سلسلہ تعلیم کو تحریک میں تبدیل کرنے میں بے حد معاون ہوگا ۔

اقلیتوں کے لیے

وزیراعظم کے پندرہ نکاتی رہنمایانہ اصول

حکومت ہی ذمہ دار نہیں

مسلم قیادت اور دانش وروں کا فرض!

ملک کی اقلیتوں کے لیئے وزیراعظم کا پندرہ نکاتی ہدایت نامہ DIRECTIVE شائع ہو چکا ہے۔ جو کسی غلط فہمی سے پروگرام کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے اس کے چند ایک اہم نکات سے بالخصوص مسلم اقلیت کا واقف ہونا ضروری ہے۔ ان رہنمایانہ اصولوں کے جاری کرنے کی چند ایک سیاسی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں لیکن ہمیں ان وجوہات سے بحث نہیں اتنی بات تو ضرور ہے کہ مرکزی حکومت نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ملک میں ایک بڑی اقلیت ایسی ہے جو غربت اور جہالت کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور ملک گیر ترقی کے دوران جو فوائد ہر شعبہ میں اکثریتی طبقہ نے حاصل کیے ہیں ان میں مسلم طبقہ کا حصہ برائے نام ہی رہا ہے۔ خود اس ہدایت نامہ کے جاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طبقہ کے ساتھ مسلسل ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں۔ چند دن قبل ہمارے وزیراعظم راجیو گاندھی نے دہلی میں ابوالکلام آزاد صدی تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا کہ آزادی کے بعد سے ملک میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ کھلا اعتراف وزیراعظم کی وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔ آزادی کے چالیس برس بعد آج مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پستی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب اس کے لیے کوئی خاص سروے اور اعداد و شمار جمع کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

جدید قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کے ایکشن پروگرام کے چودھویں باب میں، جو اقلیتوں کے تعلیمی پروگرام سے متعلق ہے، یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ مسلمان اور نیو بدھسٹ تعلیمی لحاظ سے قومی سطح پر پسماندہ طبقات ہیں۔ " مساوات اور سماجی انصاف کا تقاضہ ہے کہ ان طبقات کی تعلیمی ترقی پر زیادہ توجہ دی جائے" (صفحہ ۱۱۵)۔ سارے ہندوستان میں تعلیم کا فی صد ۳۷ ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فی صد (۲۰) کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اقلیتی طبقات پانچ ہیں۔ کل آبادی کا 17.5% فی صد ہیں۔ ان میں مسلمان 11.4% عیسائی 2.4% سکھ 2% بدھسٹ 0.7% جین 0.5% فی صد ہیں دوسری اقلیتوں کے افراد میں وہ تعلیمی پستی اور معاشی بدحالی نظر نہیں آتی جو مسلمانوں میں عام ہے۔

اہم نکات:

اس پندرہ نکاتی رہنمایانہ اصول میں (۷) نکات فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام سے متعلق ہیں، (۵) ملازمتوں میں بھرتی نمائندگی اور تعلیم سے متعلق ہیں اور باقی (۳) عام نوعیت کے ہیں۔ جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے، آزادی کے بعد سے کوئی سولہ ہزار فسادات ہوئے اگر انھیں آزاد ہند کی مدت پر پھیلا دیا جائے تو ہر دوسرے تیسرے روز ایک فساد ہوا ان نکات میں خاص طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (کلکٹر) اور پولیس کے اعلیٰ عہدہداروں کو ان فسادات کی روک تھام کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور ہدایت دی گئی ہے کہ فسادات سے متاثرہ حساس علاقوں میں ایسے عہدیداروں کو تعینات کیا جائے جن کا ریکارڈ ان فسادات کی روک تھام کے لیے اچھا رہا ہے اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر عہدہ دار اپنے فرائض منصبی سے

کوتاہی کرتے ہیں ۔ جن عہدہ داروں کا ریکارڈ اچھا ہوگا ان کی ترقی کے وقت خاص خیال رکھا جائے گا ۔ جب فسادات کی روک تھام ان کے فرائض میں داخل ہے تو پھر انکی ترقی اور تقرر کس طرح پندرہ نکات کا جزو بن سکتے ہیں ۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ بہار میں اکثر ہندو مسلم فسادات عید و تہوار کے زمانہ میں ہوا کرتے تھے ۔ انگریز گورنر نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ جہاں کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوگا اسی تاریخ سے حکام وہاں اپنے آپ کو معطل سمجھ لیں احکام آتے رہیں گے اور تحقیقات ہوتی رہے گی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو برس تک وہ انگریز گورنر رہا اور کسی دن کوئی فساد کی اطلاع نہیں آئی ۔ ہماری مرکزی حکومت بھی بجائے (۷) نکات جاری کرنے کے صرف ایک بات یہ کہہ دیتی کہ جہاں کہیں جس ضلع میں فساد ہوگا وہاں کے متعلقہ عہدہ دار فوری معطل کر دیئے جائیں گے ۔ چاہے اس پر عمل ہوتا یا نہ ہوتا، لیکن اس کا اثر دیکھنے لائق ہوتا ۔

تعلیم کی پسماندگی کی جانب ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں ۔ اعلیٰ عہدوں میں مسلمانوں کی نمائندگی دراصل اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہی کی ہو سکتی ہے ۔ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں (۱۰۰) میں صرف (۲) ہیں ۔ باقی ۲۰ فی صد میں (۱۸) افراد ایسے ہیں جنھیں ، خواندہ ، یا " حرف شناس " کہا جا سکتا جو شد بد پڑھنا لکھنا جانتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ عہدوں کے لیے ان کا مسابقت میں آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔

خاص طور پر ریلوے ، قومیائے ہوئے بنکوں اور پبلک سیکٹر کے تحت قائم شدہ صنعتوں میں اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔ ان شعبوں میں ہر سال دس ہزار آسامیاں خالی ہوتی ہیں ۔ لیکن ملک کے ایک اہم شعبہ ڈیفنس یا فوج کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے ۔ حالاں کہ دفاعی خدمات میں مسلمانوں کی

نمائندگی بڑی اہمیت کی حامل ہے صرف سکھ ایسی اقلیت ہے جو آبادی کا صرف دو فی
ہونے کے باوجود دفاعی خدمات میں ان کے نمائندگی ان کے فی صد سے کئی گنا ز
ہے۔جہاں تک پولیس اور دوسرے زمروں کا تعلق ہے ریاستی حکومتوں سے خواہ
کی گئی ہے کہ اقلیتوں کا خیال رکھا جائے۔ان نکات کے علاوہ اقلیتی امیدواروں کے
مسابقتی امتحانات میں شرکت کے لیے کوچنگ کا خاص خیال کیا جائے سلکشن کمیٹیو
میں اقلیت کو نمائندگی دی جائے اور مرکزی وزارت داخلہ میں ایک سکشن ہوگا جو
سال ان ہدایات پر کہاں تک عمل ہو پایا ہے اس پر نظر رکھے گا۔

ہمیں ان نکات کی سنجیدگی اور اخلاص پر کوئی شبہ نہیں ہے لیکن جہاں تک
کے نفاذ یا عمل آوری کا سوال ہے۔وہ نہایت مشکوک ہے حال ہی میں حیدر آباد
سب انسپکٹر پولیس کی (۴۰۰) سے زائد جائیدادوں پر بھرتی ہوئی جس میں (۱۷) مسـ
امیدواروں کو لیا گیا۔پولیس کے ذمہ دار عہدہ داروں نے تنقیدوں کا جواب د
ہوئے کہا ہے کہ ۳۸ فی صد مسلم امیدواروں کا تقرر کیا گیا۔یہ فیصد مسلم آبادی
نہیں بلکہ ان امیدواروں کا ہے جو اس امتحان اور ٹسٹ میں شریک رہے۔یہ ایک
خاص نکتہ ہے جس پر ہمارے لیڈر اور دانشوروں کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک ہمارے اعلیٰ ادارے، فنی اور پیشہ وارانہ کالجوں کا تعلق ہے وہا
مسلم طلبہ کی تعداد بڑی تشویش ناک حد تک گر چکی ہے۔بعض اعلیٰ کورسس میں
پانچ برسوں میں ایک مسلم امیدوار بھی منتخب نہیں ہوسکا۔

ان سب باتوں کا صرف ایک ہی حل رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کو انکی سرکار
جائیدادوں میں (۱۰) فی صد نشستیں اور جائیدادیں مختص کردی جائیں کیرالا
کی ریاستی حکومت نے کسی حد تک مسلم امیدواروں کو رزرویشن دیتا۔

کر لیا ہے۔

جو کچھ اقلیتوں کی بھلائی بہبود کے لئے ہدایت نامہ جاری کیا گیا ہے ان پر عمل کروانا خود حکومت کے بس کی بات نہیں ہے۔ حکومت کی مشنری اتنی پیچیدہ ہے کہ ان نکات پر عمل کروانا آسان نہیں ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ مسلم لیڈر شپ اور دانش وران نکات پر غور کریں اور اس مطالبہ کو منوانے کی کوشش کریں جو موجودہ حالات اور طویل تجربہ کے بعد یہی ایک قابل عمل حل نظر آتا ہے ورنہ چند برسوں میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پستی کہاں پہنچ جائے گی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

وزیر اعظم کے اس DIRECTIVE میں یہہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہیں لیکن تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے کوئی ایک بھی نکتہ اس پروگرام میں شامل نہیں ہے۔

دو تین سال قبل جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر یونیورسٹی علیگڈھ) کی قیادت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی تاکہ یہہ معلوم کر سکیں کہ اس ہدایت نامہ پر کہاں تک عمل ہوا ہے۔ خود صدر کمیٹی سید حامد نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ دس بارہ برس میں وزیر اعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام کے ایک شوشہ پر بھی عمل نہیں ہوا۔ ریاستوں کے چیف منسٹرس، اضلاع کے بعض کلکٹرس کو اس قسم کے کوئی ہدایت نامہ کا علم ہی نہیں ہے۔ اس میں کچھ تو ہمارے لیڈروں کی غفلت، حکومت کی مشنری کی سرد مہری، اور حکومت کو وعدے کرنے کی عادت نے اس پروگرام کو پوری طرح بدنام اور تباہ کر دیا ہے۔ اب اس پروگرام کو پروگرام کسی طرح کہنا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔

تعلیم کے چند بنیادی کام؟

روزنامہ سیاست، میں ایک بہت ہی مفید بحث چل رہی ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمان کیا کریں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر ایم اے مجید خان اور ڈاکٹر بیگ احساس کے متوازن مضامین پڑھنے میں آئے جو ان حضرات کی دانشوری کا ثبوت دیتے ہیں، ان پر تبصرے بھی بہت خوب تھے۔ بابری مسجد کے حادثے کے بعد کئی ایک دانش ور، صحافی قایدین اور دردمند لوگوں نے مضامین لکھے ہیں۔ہر محفل و مجلس میں ان باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ان سب باتوں کا اثر دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے لیکن ابھی ہاتھ پاؤں میں حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ فکر و دانش کی اتنی باتیں سامنے آچکی ہیں کہ اب صرف عمل کا میدان رہ گیا ہے جو ابھی تک بنجر ہی رہ گیا ہے ہم نیند میں کچھ کلبلانے لگے ہیں۔ابھی اٹھنا اور چلنا باقی ہے کام کرنے کے بہت ہیں اور دور نہیں اپنے گھر کے باہر ہی ہیں اور ہمارے اطراف و اکناف میں ہیں چند ضروری کام اجمالاً پیش ہیں۔ بس بسم اللہ کیجئیے اور کام شروع کر دیجئیے جس سے جو ہوسکتا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ بہت بڑا پراجکٹ ہی لے کر اٹھیں۔ہر چھوٹا بڑا کام جو ملت کے لئے آپ کریں گے وہ خود بڑا کام ہے۔

۱۔ ہر دردمند یہ ارادہ کرے کہ وہ روزآنہ ایک دو گھنٹہ مسلمانوں کے فلاحی کاموں کے لئے وقت دے گا۔اتنا نہیں ہوسکتا تو ہفتہ میں دو گھنٹے پوری تندہی کے ساتھ فلاحی کاموں میں عملاً حصہ لے۔

۲۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی سال بھر کی آمدنی کا کم از کم ایک فی صد ملت کے فلاحی کاموں کے لئے خوشی سے دے دے ۔ سنتے ہیں کہ کرسچن مشنری اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والے طلباء اپنی آمدنی کا پانچ تا دس فی صد مشنریز کی انتظامیہ کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور یہ ادارے اسکولوں اور دواخانوں کے ذریعے جو ملک کی خدمت کر رہے ہیں اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ۔

۳۔ اپنے محلہ، قصبہ میں ایسے بہت سے بچے ہیں جن کے ماں باپ اپنی غربت و جہالت کی وجہ سے کبھی انھیں قریبی اسکولوں میں شریک کروانے کا خیال ہی نہیں آتا ایسے بچوں کو قریبی اسکولوں میں لے جا کر شریک کروائیں ۔ اگر توفیق ہوئی تو ان کی فیس، کتابوں، کاپیوں اور یونی فارم کا انتظام کر دیجئیے ۔ دیکھنے میں یہ کام بہت معمولی ہے لیکن یہ بچے جب بڑے ہو جائیں گے تو آپ کو یاد کریں گے کہ زندگی ان کی کیا سے کیا ہو گئی ۔ یہ کام محلہ واری ایجوکیشن سوسائیٹی منظم طریقے پر بھی کر سکتی ہے ۔

۴۔ مسلمانوں میں سوشل سروس تنظیموں کا قحط ہے ۔ ہر محلے، قصبات اور اضلاع میں سوشل سروس تنظیموں کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر قائم ہوں اور وہ عام مسلمان آبادی بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی ہمدردی کے کام کر کے سماج میں اپنی عزت و وقار بڑھا سکتے ہیں ۔

۵۔ مسلمانوں کی ۸۰ فی صد آبادی پڑھی لکھی نہیں ہے ۔ سارے

ملک میں ہم تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ تعلیم کا میدان اتنا وسیع ہے کہ اگر کچھ لوگ اپنی زندگی کا مشن بنالیں تو اچھا ہے اس میں گزشتہ دس برس سے بہت کام ہو رہا ہے۔ یہ سب ساری مسلم قوم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں لیکن یہ سب کام دس پندرہ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔

۶۔ مسلمانوں کا انگریزی روزنامہ نہیں ہے، جو قومی سطح کا ہو جس کا معیار بھی اونچا ہو۔ اگر ہماری آبادی ۱۲ کروڑ ہی مان لی جائے تو ان کی آواز، ان کے خیالات اور احساسات سے اہل وطن بے خبر ہیں۔ جہاں تک اردو اخبارات کا تعلق ہے سید حامد کے الفاظ میں "ہم ہی لکھتے ہیں اور ہم ہی پڑھ لیتے ہیں" (بلکہ ہم ہی خوش بھی ہو جاتے ہیں) ڈسمبر ۹۲ء کے واقعات کے بعد انگریزی پریس کا احسان ماننے کے ان اخبارات نے ایسے اچھے اداریے اور مضامین شائع کئے کہ شاید کسی مسلمان سے بھی یہ ممکن نہ تھا۔

دو چار برس پہلے مولانا ابوالحسن علی ندوی اور سید حامد نے قومی سطح پر ایک انگریزی اخبار نکالنے کی تحریک چلائی تھی، جس کے لئے ایک کروڑ پندرہ لاکھ روپے کی ضرورت تھی اور چندہ کی اپیلیں سارے ملک کے مسلمانوں سے کی گئی تھیں۔ افسوس ہے کہ صرف ساڑھے سترہ لاکھ روپیہ جمع ہوا۔ ساتھ لاکھ روپے حیدرآباد سے جناب عابد علی خاں کی کوششوں سے وصول ہوئے اور باقی سارے ملک سے دس لاکھ اور یہ ساری اسکیم ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ بارہ کروڑ

سے زیادہ کی آبادی سے اتنا نہیں ہوسکا کہ وہ اتنی حقیر رقم بھی لتنے بڑے کام کے لئے جمع کرسکے۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارا اس زمانہ میں ذرائع ابلاغ میں کوئی حقیر حصہ بھی نہیں ہے۔ ہم سے ضرور سیکڑوں افراد ایسے موجود ہیں جو بغیر کسی مدد کے اکیلے یا چند حضرات مل کر بھی ایک اچھا انگریزی اخبار جاری کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہم کس کو قصوروار ٹھیرائیں۔

۷۔ مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم پنپ نہیں سکتی۔ دور جمہوریت کا ہے، جمہوری نظام میں عددی اکثریت کا بول بالا ہے۔

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا ہنیں کرتے

(علامہ اقبالؒ)

اس وقت پورے شعور کے ساتھ ہمیں ان سیاسی جماعتوں کا ساتھ دینا چاہیئے جو حکومت بنا سکتے ہیں۔ پسماندہ طبقات، شیڈولڈ کاسٹس اور اقلیتوں کا اتحاد ۸۲ فی صد آبادی کا متحدہ محاذ بن سکتا ہے۔ اپنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے بھی ہم ان کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہ بات تو اب نوشتہ دیوار ہے کہ مسلمان اگر آنے والے دنوں میں ووٹ کی قوت جو جمہوری نظام حکومت میں " سیاسی ایٹمی طاقت " Political Atomic Power کی حیثیت رکھتی ہے، بغیر کسی پروگرام اور واضح منصوبے کے استعمال کریں تو اس طاقت کو ضائع کردیں گے۔ سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہوئے مسلمانوں نے سخت غفلت کی اور اس کی سزا بھی آجتک بھگت رہے ہیں۔ سیاست

ایک کڑوا کسیلا پھل ہے جسے ملت کی صحت کے لئیے ضروری ہے ۔اہل وطن کے ساتھ ربط ضبط بڑھائیں اور ان کی غلط فہمیاں دور کریں ۔وہ سیاست کے راستے سے بہت آسان ہے، باقی سب طریقے اسی کے تحت آجاتے ہیں ۔

کونسا ذریعہ تعلیم مناسب ہے

چند مہینوں سے اخباروں میں بحث جاری ہے کہ مسلم طلباء کے لئے کونسا ذریعہ تعلیم مناسب ہے اس پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ مضمون تشنہ ہی رہ گیا ہے۔ یہ مسئلہ صرف مسلم طلباء یا ایسے بچوں کا نہیں جن کی مادری زبان اردو ہے بلکہ یہ ایک بنیادی ہمہ گیر تعلیمی مسئلہ ہے جس کا راست تعلق والدین اور بچوں سے ہے چاہے ان کی مادری زبان کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

"بچہ مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے" (ذاکر حسین) یہ زبان ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ بچہ کے جسم و جان کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ فطرت کی ایک دین ہے۔ ہر بچہ مادری زبان جس تیزی کے ساتھ ابتدائی عمر میں سیکھتا ہے، باقی ساری عمر کوئی اور زبان اس تیزی کے ساتھ نہیں سیکھ پاتا ابتداء میں تو وہ چیزوں کو دیکھتا ہے اور پھر ان کے نام سے واقف ہوتا ہے۔ پانی، روٹی، انڈا، اشیا کا مشاہدہ اور زبانکی علامت جب اس شئے کے ستھ جڑ جاتی ہے تو اس کی ماہیت اور خصوصیت سے بھی وہ واقف ہو جاتا ہے، مٹھائی کے نام سے اسکے مزہ کا بھی احساس کرنے لگیا ہے رفتہ رفتہ وہ غیر مشاہد باتوں کو بھی سمجھ جاتا ہے جن کا تعلق سماج میں اقدار تہذیب و روایات سے وہوتا ہے، سچ جھوٹ، ہمدردی، محبت، دھوکا وغیرہ ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کا تعلق لوگوں کے عمل سے ہوتا ہے۔ پھر وہ رفتہ رفتہ زنان کی نزاکتوں اور لطافتوں شعر و شاعری اور ادب سے واقف ہو جاتا ہے۔ اگر اس میں صلاحیت ہو تو ادب کے مختلف شعبوں میں کمال پیدا کرتا ہے۔ ان سارے مراحل کے طئے کرنے

میں بچہ کو بڑا ہونے تک کسی خاص پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی اور نہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سارے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچہ کی تعلیم صرف مادری زبان میں ہونی چاہئے اگر یہ ماہرین تعلیم اس بات پر متفق بھی نہ ہوتے ہر صاحب سمجھ کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ مادری زبان ہی میں تعلیم نہایت آسان اور موثر طور پر دی جا سکتی ہے اس کے بعد کوئی اور ذریعہ تعلیم لیپا تھوپی اور مصنوعی رنگ میں ہوتی ہے چاہے وہ ذریعہ تعلیم کی قیمت مارکیٹ میں کتنا ہی اونچی ہو اسکی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان کی گود اس قوم کی تہذیب رواریات، مذاق اور شائستگی سے مالامال ہوتی ہے جو اس زبان کی نصابی کتب میں صاف نظر آتے ہیں تلگو کی کتاب میں رام سیتا کے قصے، دیو مالائی کہانیاں ضرور ہوں گی ان کتابوں میں ہارون رشید کے دربار کے قصے، مولانا روم کی کہانیاں، شیخ سعدی کے لطیفے ڈھونڈنا عبث ہے۔ اسی طرح انگریزوں کی قدامت پسندی گہری حس مزاح طورح طریقہ اور ان کی مجلسی کا عکس انگریزی کتابوں میں ضرور ہوگا۔ بعض باتیں اور جملے ان کتابوں میں عجیب و غریب معلوم ہوں گے جیسے BIG PIG یہ جملہ اپنے ماحول اور مذہبی رنگ سے بہت غیر مانوس ہے ایک زمانہ میں A سے APPLE دیہات کے بچے پڑھتے تھے اور سیب کی شکل و صورت اور اس کے مزے سے کوئی واقف نہیں تھا بچے تو کیا ان کے بڑے بھی سیب نہیں دیکھا تھے ہمارے بی۔ اے، کے کورس میں ایک مضمون " سرروجرڈی کاورلی " میں ایک جملہ یہ تھا فیشن کئی مرتبہ بدلتا گیا لیکن اس سرروجر (نائٹ یا نواب) کا کوٹ نہیں بدلا اور ہم اس زمانے میں سوچتے رہ گئے آخر فیشن کیا چیز ہے اور اس کوٹ کے نہ بدلنے کی اہمیت کیا ہے جب کہ ہندوستان میں کوٹ کسی کو میسر نہیں گویا یہ بات آسانی سے حلق سے نہیں اترتی تھی لیکن یہ جملہ ہر امتحان میں

حوالہ متن کے تحت پوچھا جاتا یہ بات کچھ ایسی ہے جیسے اکبرالہ آبادی نے بہت خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

قصہ منصور سارا سن کے بولی شوخ مس
کیسا جاہل لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

اس شوخ مس کا کوئی قصور نہیں تھا وہ لاکھ کتابیں پڑھ جائے فلسفہ وحدت الوجود اسکی اہمیت مذہبی روایات و عقائد تک نہیں پہونچ سکتی جو بات اس شوخ کے لئے بہت مشکل ہے وہ ہر اس بچے کے لئے مشکل ہے جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں تعلیم پاتا ہے

اس تمہید کے بعد اب اصل مسئلہ کی طرف آئیے اردو ذریعہ تعلیم کے مسئلہ کو حقائق کی دنیا میں سونچنا اور سمجھنا چاہے۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ زبان کی بھی تقسیم ہو گئی اردو پاکستان کی ہندی ہندوستان کی سرکاری اور قومی زبان ہو گئی سرکار کی زبان کا اثر سارے ملک اور لوگوں پر پڑتا ہے۔ چار و ناچار لوگ قومی زبان سیکھنے پر مجبور ہیں جو نہیں سیکھیں گے وہ سخت گھرٹے میں رہیں گے یہ بات نہیں کہ ہم اردو کو نہیں چاہتے بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کو اس ملک میں سب کے ساتھ رہنا اور جینا ہے تو ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے جہاں پر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا دشوار ہو چکا ہے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ریاستی (مقامی) قومی اور انگریزی زبانوں کی اہمیت پر سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے دستور ہند میں ریاستی زبانوں کو تسلیم کر لیا گیا ہے ہر ریاست کے لوگ اپنی زبان کو ترقی دینے کے لئے دل و جان سے لگ گئے ہیں اور مقامی زبانوں کو یونیورسٹی تک پہنچا چکے ہیں مقامی زبان ہر ایک کو سیکھے بغیر چارہ نہیں کیونکہ یہ سرکار کی دفتری زبان ہے اس زبان کو سیکھنا ہی نہیں بلکہ اردو

داں طبقے کو اس میں مہارت بھی حاصل کرنے کی ضرورت ہے ہندی چونکہ قومی زبان ہے سنٹرل گورنمنٹ کے ہر شعبہ میں اسکا سکہ چلتا ہے ہندی کا جبر غیر محسوس طریقے پر آپ ہر جگہ محسوس کریں گے اس زبان کے دباؤ کے خلاف جنوبی ہند کی ریاستیں احتجاج بھی کرتی آئی ہیں لیکن اس کے باوجود ہندی سیکھے بغیر کام نہیں چلے گا ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ ہندی زبان کا پرچار صبح اور شام چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ اردو کے ڈرامے کہانیاں مشاعرے سب ہندی کے نام سے نشر ہوتے ہیں اردو کے بہت سے الفاظ اب ہندی میں بے تکلف جذب ہو چکے ہیں جیسے خود اردو میں بہت سے الفاظ ہندی کے آچکے ہیں اب اردو کا حاشیہ سکڑتا جارہا ہے ممتاز دانشور جناب ہاشم علی اختر کے مطابق یہ اب "کانوں کی زبان" رہ گئی ہے بول چال میں عام ہے لیکن لکھنے اور پڑھنے سے موجودہ نسل دور ہوتی جارہی ہے معلوم ہوا کہ علیگڈھ یونیورسٹی میں ایم ۔ اے اردو پرچوں کے جوابات طلباء ناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں کوئی زمانہ یا نہ مانے آج سے پچاس برس بعد اردو کے پڑھے لکھنے والے خال خال ہی رہ جائیں گے انگلش میڈیم کے اسکولوں کی بہتات کچھ تو تجارتی اغراض کی وجہ سے ہے اور کچھ تو انگریزی زبان کی مسلمہ اہمیت کی وجہ سے تعلیم ویسے آج کل انڈسٹری میں تبدیل ہوچکی ہے تاجر وہی مال مارکٹ میں لائے گا جس کی مانگ زیادہ ہے ۔ یہ کہنے کو تو بہت اچھی بات ہے کہ ہمارے مذہب ثقافت کا اصل سرمایہ اردو زبان میں محفوظ ہے اسلئے اردو داں اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھائیں لیکن اکثر ایسا کہنے والے بھی اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں ہی میں پڑھاتے ہیں ۔ انگریزی زبان کی اہمیت تو یہ ایک بین الاقوامی زبان ہونے کی وجہ سے ہے دوسرے یہ کہ سائنس، ٹکنالوجی، میڈیکل، انجینیرنگ سب اعلیٰ فنی علوم کا مخزن انگلش ہے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگریزی

زبان میں مہارت حاصل کئے بغیر کوئی چارہ نہیں دنیا کی اور زبانوں کے مقابل سب سے کم ۲۶ حروف تہجی ہیں اور کوئی اچھی کتاب، مقالہ، ریسرچ، کا کام دنیا کے کسی زبان میں شائع ہوجائے اس کا مستند ترجمہ پندرہ دن کے اندر اندر انگریزی میں اپ کو مل جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے انگریزی کو لائبریری زبان کے نام سے اسکو مستقل حیثیت دی ہے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا تو چند ہندی پریمیوں کا وفد ہندوستان کے مشہور رڑکی انجنیرنگ کالج کے پرنسپل کے پاس پہنچا اور مطالبہ کیا کہ کالج میں ہندی میڈیم جلد سے جلد جاری کر دیں پرنسپل اس کا جواب دئے بغیر اس وفد کو کالج کی لائبریری ہال میں لے گئے جہاں فرش تا چھت ہزاروں کتابیں الماریوں میں لگی ہوئی تھیں اور کہا کہ آپ ان سب کا ہندی میں ترجمہ کر دیجئے پھر ہندی میڈیم شروع کیا جاسکتا ہے۔لیکن یاد رکھئے کہ ان سب کتابوں کے ترجمے کے لئے پچاس برس بھی کافی نہیں ہوں گے اور اس عرصہ میں اس سے زیادہ کتابوں کا انبار لگ جائے گا ہندی پریمی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے انگریزی زبان کے الفاظ دوسری زبانوں میں اتنے عام ہو چکے ہیں کہ اب ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم انگریزی الفاظ بے تحاشہ استعمال کرتے جارہے ہیں مثال کے طور پر سیکل ہی کو لیجئے دیکھئے اس میں کتنی اردو کے اوزار ہیں۔ ٹائر، ٹیوب، رم، چین، سیٹ کیاریر، پائڈل، ہینڈل، ہب، بیرنگ، اسٹاہنڈ، فریم، وال، ربر، بریک یہ سب انگریزی الفاظ ہیں۔ہوسکتا ہے اردو کے چھرے اور گھنٹی ہوگی، ڈنڈا تو تلگو ہے کسی ماہر لسانیات کو صرف، اسٹانڈ اور بریک کا ترجمہ اردو میں کرنے کے لئے کہیئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی پرشانی ہے کسی صاحب نے ٹرین کا ترجمہ "تخت رواں" کیا تھا لیکن لوگوں کی زبان پر ریل ہی چلتی رہی لوگ اپنے بچوں کو

اردو میڈیم اسکولوں میں نہیں شریک کرواتے کیں کہ انہیں معلوم ہے کہ ان اسکولوں کا رزلٹ ہر سال وہی تین چار فیصد رہتا ہے۔ ایسا حال کیوں ہو گیا ہے ان وجوہات پر آئے دن ہر جگہ بحث ہوتی رہتی ہے لیکن ان باتوں کو دہراتے رہنے سے ہم وقت کے دھارے کو موڑ نہیں سکتے ہیں ان حالات میں ہمارے لئے کونسا لائحہ عمل مفید ہو سکتا ہے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ا) مسلمان طلباء ہوں یا اور کوئی لسانی اقلیت ہو انہیں چار زبانی فارمولا اختیار کرنے کے سواء اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے ہندی کے علاقہ کے لوگوں کے لئے یہ دو زبانی فارمولا ہے کیوں کہ ہندی مادری زبان ہے پھر اسی ریاست کی قومی زبان بھی ہے۔ انہیں صرف ایک نئی زبان انگریزی سیکھنی ہے جن لوگوں کی مادری زبان علاقائی زبان ہوگی ان کے لئے ہندی اور انگریزی سیکھنا ہوگا اسطرح ان کے لئے سہ لسانی فارمولا ہے اردو کے لئے چار فارمولایوں ہوگا۔ مادری زبان اردو علاقائی زبان (تلگو) قومی زبان (ہندی) بین الاقوامی زبان انگریزی سیکھنا ضروری ہے یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ بچہ دو چار زبانیں بارہ برس کی عمر تک نہایت ہی آسانی سے سیکھ جاتا ہے۔ اس پر کوئی زبان بوجھ نہیں بلکہ بوجھ اس وقت بن جاتی ہے جبکہ خاندان کے بڑے لوگ آپس میں دوسری زبانوں کا تذکرہ حقارت سے کرنے لگتے ہیں بچوں میں غیر محسوس طریقہ پر اس زبان کے خلاف تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس زبان کے سیکھنے سے دلچسپی باقی نہیں رہتی اب وہ زبان امتحان کے خاطر پڑھتا ہے اب رہا مادری زبان خود بخود صحن مسجد اور مکتب میں پہونچ چکی ہے مساجد کمیٹی کے اراکین قابل مبارک باد ہیں کہ وہ محلے اور قصبے کے بچوں کو عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم سے ابتدائی جماعتوں کا بھی انتظام کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں یوپی کی

دینی تعلیمی کونسل نے گزشتہ تیں چالیس برس میں جو کام کیا ہے وہ سارے مسلمانوں کے لئے قابل تقلید ہے ۔ اس کونسل نے سارے صوبے میں پانچویں جماعت تک اردو اسکولوں کا خانگی طور پر جال پچھادیا ہے جہاں پر مذہبی تعلیم کے ساتھ پانچویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس کے بعد ان طلباء کو ہندی میڈیم سرکاری اسکولوں میں چھٹی جماعت سے شریک کرادیا جاتا ہے بچے کی ابتدائی عمر میں مادری زبان میں تعلیم کی وجہ تعلیم کی مضبوط بنیاد قائم ہوجاتی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ جو بچہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا ہے وہ دوسری زبانیں بہت تیزی سے سیکھ جاتا ہے اور پھر یہ طلباء آگے چل کر اپنے دین و لمان سے اجنبی نہیں ہوجاتے ۔

مختصر یہ کہ ہمیں ہوش وحواس کے ساتھ بے جا تعصب کو ختم کر کے اپنے بچوں کو علاقائی قومی اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دیں اپی مادری زبان کے تحفظ کے لئے حکومت سے زیادہ خود اپی تنظیموں پر بھروسہ کر کے پانچویں جماعت تک اردو میڈیم اسکول قائم کرلیں پھر اسکے بعد سب دروازے کھلے ہیں خود مسلم تنظیمیں علاقائی زبانوں کے اسکول کھولیں تو اچھا ہے ۔

تعلیمی اداروں کا معیار تعلیم

کسی محفل میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا ذکر چل پڑا کوئی نہ کوئی صاحب یہ تبصرہ کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں کرسچین مشنری اسکول کا معیار تعلیم بہت اونچا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کا پست کسی ہائی اسکول کا نتیجہ ہر سال صفر ہے تو کسی اور اسکول کا دس پانچ فی صد برسوں سے یہ ادارے اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں جس شخص کی زندگی کا سارا تعلق تعلیم ہی سے رہا ہو وہ اس بحث کا اولین مخاطب ہوتا ہے کبھی کبھی کسی تعلیمی ادارہ نے اس احقر کو معیار تعلیم پر کچھ کہنے کی دعوت دی لیکن ایسے وعظ و نصیحت سے معیار تعلیم اونچا ہونے کی کوئی توقع نہیں۔

کرسچین مشنری اسکولوں کی تعداد کہا جاتا ہے کہ اس وقت سارے ملک میں چالیس ہزار کے قریب ہے۔ یہ سب اسکول بظاہر وہی نصاب وہی زبان وہی قابلیت کے ٹیچرس ہوتے ہیں جو ہمارے اسکولوں میں ہوتے ہیں لیکن معیار تعلیم میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ آخر کچھ تو بات ضرور ہوگی جو ہم سے آج تک راز ہی راز رہ گئی ہے جس کا سمجھنا اور پانا مشکل ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کی غرض بھی یہی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کو پتہ چل جائے کہ آخر اس امتیاز کی وجہ کیا ہے۔

کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے کہ حیدرآباد کے ایک نامور اسکول " لٹل فلاور " کے پرنسپل سے ایک نجی ملاقات میں بات چیت کا موقع ملا۔ میں پوچھ بیٹھا کہ آپ کا اسکول کوئی پچاس برس سے اعلی معیار تعلیم کے لئے مشہور ہے۔ آپ کالج کیوں نہیں کھول لیتے۔ آپ کو منظوری سرکار سے لانا چند گھنٹوں کی بات ہے اس لیے کہ سارے سکریٹریز اور ڈائرکٹرز کے بچے آپ کے اسکول میں ہیں " برادر " نے جواب دیا

کالج کی ہمیں کیا ضرورت ہے۔ دیکھئے اس سال انٹر میڈیٹ میں ایک سو طلباء بیٹھے۔ ۹۸ درجہ اول آئے اور صرف ۲ درجہ دوم میں۔ ان میں ۲۱ میڈیکل کالج ۲۹ انجینئرنگ کالج، ٹی IIT ۔ای ۔ای چند زرعی کالج اور وٹرنری وغیرہ میں شرکت کے مستحق ہوئے باقی رامنتاپور پالی ٹکنک میں نمبر ایک تا پندرہ سرفہرست ہمارے ہی طلباء کا قبضہ ہے۔

تعلیمی معیار کا اندازہ چند باتوں سے ہو جاتا ہے۔ بچوں کے سیکھنے کی رفتار مضامین پر ان کی گرفت ہوم ورک کا سلیقہ طلباء کا ذوق وشوق اساتذہ کی دلچسپی پبلک امتحان کے نتائج جو ہر اسکول کے معیار تعلیم کے لیے بیارو میٹر کا کام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول کا ڈسپلین تعلیمی مصروفیات اسپورٹس گیمس ڈرامے تقریری و تحریری مقابلوں سے طلباء کی تعلیم اور تربیت کا اندازہ ہو جاتا ہے محض بچوں کے یونیفارم وزنی اسکول بیگ اونچی فیس اور ٹیپ ٹاپ سے یہ سمجھ لینا کہ تعلیمی معیار بہت اونچا ہو گا غلط فہمی ہے۔ البتہ یہ باتیں اسکول کے ڈسپلن اور معیار تعلیم میں معاون ہو سکتی ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اس اسکول سے کامیاب طلباء نے کس حد تک پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلہ لیا ہے کیونکہ اکثر فرسٹ کلاس طلباء کو آرٹس کالجس میں بھی داخلہ نہیں ملتا۔

اچھی معیاری تعلیم مہنگی ہوتی ہے۔ غیر معیاری تعلیم سستی ہوتی ہے۔ ویسے تعلیم "ایجوکیشن انڈسٹری" میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اعلیٰ معیاری شئے کے لیے بازار میں قیمت زیادہ دینی پڑتی ہے۔ اسی لیے بعض تعلیمی ادارے EDUCATION SHOPS میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ گورنمنٹ اسکول میونسپل اسکول پست تعلیمی معیار کے لیے مشہور ہیں۔ غریب ماں باپ ان ہی اسکولوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان میں برسوں میں ایک آدھ کوئی کسی پیشہ ورانہ کالج

میں داخلہ کا مستحق ہوتا ہے

معیار تعلیم کا انحصار:۔

کسی بھی تعلیمی ادارے کی کارکردگی اور معیار تعلیم کا انحصار مندرجہ ذیل سات عناصر کے باہمی خوشگوار اور گہرے ربط و ضبط پر ہے جس کو ہم "زنجیری مجموعی اثر یا انگریزی میں CUMULATIVE EFFECT کہتے ہیں ۔ (۱) ادارہ کے قیام کا مقصد (۲) انتظامیہ کی کارکردگی (۳) اساتذہ کی قابلیت اور دلچسپی (۴) داخلہ کے شرائط (۵) والدین کا تعاون (۶) مادی سہولتیں (۷) پرنسپل کی شخصیت ۔یہاں پر ان سب پر تفصیل سے بحث کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ضرورت لیکن ایک اجمالی خاکہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ معیار تعلیم میں ان عناصر کی کیا اہمیت ہے ۔(۱) تعلیمی ادارہ کے قیام کا مقصد تجارتی یا ذاتی منفعت ہو سکتا ہے ۔یا پھر اپنی کمیونٹی کی خدمت یا ایسا اسکول قائم کرنا جس میں صرف اونچے طبقہ کے لوگ ہی اس کا رخ کر سکیں ۔ داخلہ فیس اتنی رکھی جائے کہ عام لوگ ادھر کا خیال ہی نہ کریں وہ ادارے جو عام غریب طلبہ کے لیے قائم کیے جاتے ہیں وہ سوشیل سرویس کے جذبہ اور مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں ۔یہاں پر تعلیم کا کچھ انتظام ضرور ہو جاتا ہے لیکن معیار تعلیم بہت دور رہ جاتا ہے ۔

(۲) کرسچین مشنری اسکولوں میں انتظامیہ کہاں ہے کسی کو پتہ نہیں اور نہ ان تک پہنچ آسان ہے سارے اسکول کا ذمہ دار پرنسپل اپنے کام کے پکّے اور سچّے ہوتے ہیں ۔ سارا اسکول مشین کی طرح چلتا ہے مشین کے ہر پرزہ پر پرنسپل کی نظر ہوتی ہے کوئی ناقص ٹیچر ان اسکولوں میں چھ سات مہینوں سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔

اب ذرا ہمارا حال دیکھئے انتظامیہ کے رکن کی پہنچ ٹائم ٹیبل سے لے کر بچوں

کے نمبر بڑھانے تک ہے ۔ سارے ٹیچر کسی نہ کسی ممبر کے منظور نظر ہیں ۔ پرنسپل صرف پوسٹ آفس ورک کرتا ہے ۔ کبھی اس کی شکایت کبھی اس کی شکایت ۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ اس صورت حال کی خرابی یہ ہے کہ اسکول چلانے کی ذمہ داری پرنسپل یا صدر مدرسہ کی ہے لیکن اسے کوئی اختیار نہیں جن کے ہاتھوں میں اختیار ہے وہ ذمہ دار نہیں اسی کو لارڈ کلائیو کی دو عملی پالیسی کہا جاتا ہے ۔ وہ مال گزاری وصول کرتا لیکن انتظام کا ذمہ دار نہیں تھا جو انتظام کے ذمہ دار ہیں وہ بے بس ہے اس صورت حال کی عملی مثالیں ہمارے تعلیمی اداروں میں کثرت سے مل جائیں گی ۔

انتظامیہ کے بعض اراکین کی انا EGO بہت گہری ہوتی ہے بعض تو احساس کمتری میں مبتلا تھے اب انہیں کوئی سیٹ مل گئی تو ان کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے اکثر تو تو ہو جاتی ہے ۔ پھر یہ باتیں فلٹر ہو کر اسٹاف روم میں آتی ہیں ۔ چند اساتذہ کے گروپ بن جاتے ہیں ۔ اسکول سیاست خوب کام کرتی ہے ۔ وہ جو پڑھانے کی بات تھی نصاب کی تکمیل وغیرہ سب بھول جاتے ہیں ۔ سب کچھ ہے مگر تعلیم نہیں ہے جس کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا ۔

(۳) کسی بھی تعلیمی ادارہ کا معیار تعلیم اچھے اور قابل اساتذہ پر ہی ہوتا ہے اگر اسکول میں سب کچھ ہے اچھے ٹیچر نہیں ہیں تو سب بے کار محض ہے مشنری اسکولوں میں SISTERS اور NUNS ہوتی ہیں جنہیں خدائی خدمت گار کہا جاتا ہے ۔ انہیں دنیا کے دھندوں سے کام نہیں بچوں کی تعلیم ہی ان کا ایمان اور زندگی ہے ۔ ان میں بلاشبہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنہیں DEDICATED کہا جاسکتا ہے ۔ انہوں نے اس پیشہ کو خدمت خلق اور مذہب کے پرچار کا ذریعہ بنالیا ۔ ان کے کام اور لگن کو

دیکھیے تو رشک آتا ہے۔ یہ ٹیچر اسکول کا نمک ہیں۔ ان کا وجود اس ادارہ کے لیے باعث فخر اور دوسروں کے لیے قابل تقلید۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے ہمارے پرائمری اسکول سے لے کر کالج، یونیورسٹی کی سطح تک دوچار اساتذہ ضرور ایسے مل جائیں گے جنہیں ہم DEDICATED کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ فلاں لیڈر، فلاں منسٹر ابتدا میں ٹیچر رہ چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے سیاسی شعبدہ بازی کے ٹریننگ سنٹرس ہیں دیہات میں شاید ہی کوئی ایسا ٹیچر ہوگا جو کسی نہ کسی پارٹی کا سرگرم کارکن نہیں ہے۔ الکشن کے زمانہ میں انؑ کی حاضری اسکولوں میں مہینوں برائے نام رہتی ہے۔ جب ان کا لیڈر کامیاب ہو گیا تو دوسرے الکشن تک اس سے جائز و ناجائز کام کے لے کر یہ اپنی آمدنی بڑھاتے ہیں۔ اصل تعلیم کا مسئلہ کہاں رہ گیا خود انہیں بھی نہیں معلوم۔

پیشہ تعلیم اکثر اساتذہ کے لیے ان کے مزاج اور ذوق سے بہت دور کی بات ہے۔ ساری زندگی یہ لوگ اس پیشہ کا بوجھ پیٹھ پر لادے چلے جاتے ہیں تعلیم کا کام اکثر وجدان اور روحانی نوعیت کا ہوتا ہے جہاں تک ان بے چاروں کی پہنچ نہیں۔ جو کام لشتم پشتم چلتا رہا وہاں تعلیم کے معیار کا تذکرہ بے کار ہے۔

ہمارے مدارس میں ایک اور مرض عام ہے۔ اساتذہ کو تنخواہیں بہت کم دی جاتی ہیں۔ گورنمنٹ سے گرانٹ جو ملتی ہے وہ ٹیچر کو نہیں دی جاتی وہ دستخط تو کرتا ہے لیکن تنخواہ کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جو ہر ٹیچر کے سینہ میں سلگتی ہے وہ اس کا بدلہ معصوم بچوں سے لیتا ہے آنے والی ساری نسل کی قابلیت کا انحصار اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے کسی ماہر تعلیم نے سچ کہا ہے کہ جو ٹیچر مالی پریشانیوں سے بدحال رہتا

ہے وہ ملک کو اتنا نقصان پہنچاتا ہے جو کسی بیرونی دشمن سے ممکن نہیں۔

A DISSATISFIED TEACHER CAN HARM THE COUNTRY MORE THAN THE ARMY OF A FOREIGN ENEMY

دینی مدارس میں اساتذہ کی معاشی حالت قابل رحم ہوتی ہے بیشک دین کا کام ثواب کا ہے لیکن محض تعریف و توصیف ایثار و قربانی کا درس دیتے رہنے سے ٹیچر کا حال درست نہیں ہو سکتا انہیں حکومت کے معیار کی تنخواہیں دینا لازمی ہے تب ہی انہیں سکون حاصل ہو گا تعلیم کا معیار بلند ہو گا۔

ایک عرصہ سے مغربی ممالک میں ایک نئی اصطلاح چل پڑی ہے " فروغ انسانی و سائل میں سرمایہ کی مشغولیت " INVESTMENT IN HUMAN RESOURCES یہ بات اب مسلّمہ ہو چکی ہے کہ سرمایہ کا بہترین استعمال انسانی وسائل کی ترقی کے لیے ہی ہو سکتا ہے۔ اس راز کو جاپان نے پالیا۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک تباہ شدہ ملک نے پرائمری اور سکنڈری ایجوکیشن پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اچھی تعلیم کے لیے اچھے ٹیچرس کی ضرورت ہے حکومت نے ان کی تنخواہوں کو پرکشش بنا دیا اور ٹیچرس کو وہی سہولتیں دیں جو منسٹر کو نصیب ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ بس تیس چالیس برس میں جاپان دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بچے ملک کا اصل سرمایہ ہیں۔ ہم چاہے ملک کی دولت کتنے ہی شعبوں پر صرف کرتے ہیں تعلیم پر اگر خرچ نہ کیا جائے تو سو برس بعد بھی وہیں ہوں گے جہاں آج ہیں۔ اساتذہ کی تنخواہوں سے بہتر کوئی اور انسانی وسائل میں سرمایہ کی مشغولیت نہیں ہو سکتی ہمارا ملک تعلیم پر سالانہ بجٹ سے صرف ۲.۵ فی صد خرچ کرتا

ہے اور دفاع پر ۲۴ فی صد کو ٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے ۱۹۶۶ء میں ملک کی کل پیداوار GNP کا چھ فی صد مختص کرنے کی سفارش کی تھی لیکن آج تک تعلیم کا حصہ یہاں تک نہیں پہنچ سکا۔

(۴) طلباء کا داخلہ اور والدین کا تعاون:۔

مشنری اسکولوں کے اعلیٰ معیار تعلیم کا چرچا ہر شہر میں ہے ۔ ہر سال ہزاروں لوگ آدھی رات سے درخواستوں کے فارم حاصل کرنے کے لیے دروازے ہی پر سو جاتے ہیں ۔ وہ بچوں سے زیادہ ماں باپ کا انٹرویو لیتے ہیں ۔ قسمت سے آپ کے بچہ کو داخلہ مل گیا تو سارے خاندان میں آپ کا وقار بڑھ گیا ۔ اب اس وقار کو قائم رکھنے کے لیے لاکھ جتن کیے جاتے ہیں ۔ اسکول کی پڑھائی ۶۰ فی صد ہے تو گھر کی محنت ۴۰ فی صد ۔ اس طرح ان اسکولوں میں خس و خاشاک جمع ہونے نہیں پاتا ۔ تعلیم کا معیار اونچی سطح پر قائم رہتا ہے ۔

مادی سہولتوں میں بلڈنگس کلاس روم فرنیچر تجربہ گاہیں لائبریری کینٹین کھیل کے میدان پانی اور ٹائلٹس وغیرہ کی سہولتیں شامل ہیں ۔ اکثر مدارس میں ان سب باتوں کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا ۔ اس کا اثر بھی تعلیم پر پڑتا ہے ۔

ان سب کے درمیان پرنسپل کا عہدہ اہم اور کلیدی ہوتا ہے قابل اور تجربہ کار امانت دار ہونے کے علاوہ اس میں اساتذہ سے کام لینے اور طلباء میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے ہنر سے اس کا واقف ہونا ضروری ہے اسکول کی فضا کو خوشگوار بنائے رکھنا ایک مشکل کام ہے ۔ یہ ایک نہایت لطیف فن ہے یہیں پر آکر بعض اچھے اچھے قابل لوگ ناکام ہو جاتے ہیں ۔ پرنسپل کا تعلق انتظامیہ ، اساتذہ ، طلبہ اور والدین سے آئے دن رہتا ہے ان سب کے مسائل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں ۔ اس کو بڑے حوصلے

سے کام کرنا پڑتا ہے اس کے کام جذبہ نیک نیتی اور اخلاص کا اثر سارے اساتذہ اور طلباء پر پڑتا ہے۔اس کا امانت دار ہونا نہایت ضروری ہے کیوں کہ اسکول کا ڈسپلین جب بگڑتا ہے تو اکثر اس کی وجہ (CASH BOOK) کیاش بک" ہوتی ہے چھوٹی بڑی بے لمانی پیسہ کے بارے میں پرنسپل کی اعلی صفات اور قابلیت پر پانی پھیر دیتی ہے۔اساتذہ کی بغاوت اور لاپروائی بڑھ جاتی ہے اس کا اثر طلبہ کے ڈسپلن اور اسکول کے معیار تعلیم تک پہنچ جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان سات عناصر میں کوئی ایک کڑی بھی کمزور ہو تو معیار تعلیم پر اس کا اثر پڑے گا۔اگر انتظامیہ ہوش مند ہو اور پرنسپل دور مند تو معیار تعلیم ضرور ترقی کر کے رہے گا۔

اسکولوں میں غریب بچوں کے داخلہ کی مہم

ایک بنیادی کام توجہ سے محروم

اپنے بچوں کا مختلف اسکولوں میں داخلہ کا سلسلہ ایک دو ماہ سے جاری ہے۔ ختم جون تک داخلے مکمل ہو جائیں گے۔ داخلوں کا یہ موسم ہر سال آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ لیکن ہر محلہ میں بہت سے غریب والدین اور ان کے بچے ایسے رہ جاتے ہیں جنھیں اس موسم کی آمد کا نہ تو احساس ہے نہ انتظار نہ اس کی اہمیت کا ادراک۔ یہ بچے قریب کے ریپیرنگ شاپس، ہوٹل اور دکان پر معمولی اجرت پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح آج سارے ملک میں پانچ کروڑ بچے "بچہ مزدور" ہیں جنھیں دھوپ اور باد و باراں میں روزانہ دس گھنٹے کام کرنے کے پانچ چھ روپے مل جاتے ہیں۔ اس کام کے لئے آجر کو بڑے مزدور کو پچاس ساٹھ روپیے دینے پڑتے ہیں۔ غربت افلاس اور مجبوریوں کے یہ مناظر ہم سب دیکھ کر گزر جاتے ہیں اور انہیں کوئی قابل توجہ نہیں سمجھتا اگر کسی کا دل افسوس کر کے رہ جاتا ہے تو آخر وہ ان کے لئے کر بھی کیا سکتا ہے۔

تعلیم کے پھیلانے کا کام بہت اہم ہے جب تک بنیادی سطح پر نہایت وسیع پیمانہ پر اس کا انتظام نہ ہو، اعلیٰ تعلیم کا اہرام PYRAMID اونچا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات کئی ایک سروے رپورٹس میں آچکی ہے۔ کہ مسلم طلبہ میں ڈراپ اوٹس DROP OUTS کا فی صد بہت زیادہ ہے۔ اگر ایک سو طلبہ پہلی جماعت میں داخلہ لیتے ہیں تو صرف دس طلبہ میٹرک کی سطح تک پہنچ پاتے ہیں ان دس برسوں میں یہ پت جھڑ برابر جاری رہتی ہے۔ ڈگری سطح پر ایک ہی طالب علم رہ جاتا ہے اور

پوسٹ گریجویٹ سطح پر %5. 0 نصف طالب علم رہ جاتا ہے۔یہاں ان وجوہات سے بحث کرنا نہیں ہے لیکن اس بنیادی کام کی طرف توجہ دلانا ہے۔جس کے لئے آج تک کوئی کام نہیں ہوا ہے۔خوش قسمتی سے آج کل ہر شہر اور بڑے قصبات میں بہت سے درد مند حضرات اور تعلیمی انجمنیں ایسی ہیں جو غریب طلبہ کی اعانت، ٹیوشن فیس کتابوں اورکاپیوں کے لئے مستحق طلبہ کی ہر سال مدد کرتی ہیں۔یہہ ایک فال نیک ہے گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران سرپرست سوائے اپنے بچوں اور اپنے خاندان کے افراد کی تعلیم کے کسی کو قوم کے بچوں کی تعلیم کی کوئی فکر نہیں تھی۔وہ تو ملّت کے بہی خواہوں نے تعلیم کی اہمیت کا بیج بویا۔اب وقت کا تقاضہ ہے کہ مساجد کمیٹیوں کے ممبران، لیڈران، قوم، سوشیل ورکرس، محلہ کے بڑے لوگ، وظیفہ یاب حضرات سب ہی اپنے محدود دائرہ ہی میں سہی گندی بستیوں SLUM AREAS اور محلّوں میں گھر گھر جاکر ایسے بچوں کو تلاش کریں جن کی عمریں پانچ برس کی ہوچکی ہیں اور اس سے زیادہ عمر کے بچے بھی ہوں گے، انہیں قریب کے کسی اسکول میں شریک کروادیں۔اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا اور محنت بھی زیادہ نہیں ہے لیکن اندرونی جذبہ کی ضرورت ہے تاکہ قدم گھر سے باہر نکل سکیں۔

اس مہم میں سب سے مشکل کام سرپرستوں کو سمجھانے بجھانے کا ہے کیوں کہ ایک تو ماہانہ ڈیڑھ دو سو روپے کی آمدنی بند ہوجائے گی تو دوسری طرف بچہ کے تعلیمی اخراجات بڑھ جائیں گے اس طرح وہ دوہرے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اگر ہر محلہ میں مسجد کمیٹی یا کسی اور طرح ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل دی جائے جو دس بیس بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت کرلیں تو ہر شہر کے سینکڑوں بچے اسکولوں میں شریک ہوسکتے ہیں۔ہمارے سامنے ایسی بھی مثالیں ہیں کہ بعض

حضرات اور خواتین نے ایک دو بچوں کی تعلیمی فیس اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری دو سال تا پانچسال تک لے لی ہے ۔جو شہر کی تعلیمی کمیٹیاں پہلے سے یہ کام خاموشی کئے جارہے ہیں وہ مبارکباد کے قابل ہیں ۔

آندھراپردیش میں چار اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکولس ہیں ۔ان اسکولوں میں ہر سال طلبہ کی کمی کی وجہ داخلہ کا مسئلہ تشویشناک ہوتا جارہا ہے ۔ پانچویں جماعت میں 36 نشستوں کے لئے چوتھی جماعت کامیاب طلبہ کے لئے ایک ENTRANCE TEST داخلہ امتحان ہوتا ہے جس میں کامیابی کے لیئے صرف پندرہ نمبرات رکھے گئے ہیں جن کے سرپرستوں کی سالانہ آمدنی بارہ ہزار روپیئے سے بڑھ کر نہ ہو ۔شہر حیدرآباد کے اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکول لاڑ بازار میں شرکت کے لئے امیدواروں کی دلچپی برائے نام ہے ۔ اردو داں طبقہ کی بے اعتنائی ، اردو کے بہی خواہوں کی عدم توجہہ افسوسناک ہے ۔شہر حیدرآباد میں اردو میڈیم طلبہ کی تعداد 30 تا 40 ہزار ہوگی لیکن اس اسکول میں داخلہ امتحان میں کامیاب 36 طلبہ آسانی سے نہیں ملتے داخلہ امتحان میں ساٹھ ستر طلبہ شریک ہوتے ہیں اور 15 نمبر لینے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہوتی ہے ۔ ریاست آندھراپردیش میں تلگو میڈیم رزیڈنشیل اسکولوں کی تعداد) 117 ہے ۔ اس سال ساری ریاست میں میٹرک کے امتحان میں اول آنے والا طالب علم کرن کمار ، سرویل (نلگنڈہ) کا ہے ۔اس اسکول میں پانچویں جماعت میں شرکت کی 36 نشستوں کے لئے اسی ضلع کے ہر سال پانچ ہزار طلبہ داخلہ امتحان میں شریک ہوتے ہیں اور ۔80 نمبرات سے اوپر والوں کو داخلہ ملتا ہے ۔ان اسکولوں میں تعلیم رہنا ، کھانا سب مفت ہے ۔خود اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکول لاڑ بازار کے میٹرک نتائج گذشتہ دس برس سے صدفی صد اور (90) فیصد فرسٹ کلاس آتے رہے ہیں

ہماری ریاست ہی میں نہیں ہندوستان کی کسی ریاست میں کسی اردو میڈیم اسکول کے نتائج شاید ہی اتنے شاندار ہوسکتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں گذشتہ دس برسوں سے محدود پیمانہ پر ہی سہی محترمہ عائشہ بیگم جناب رشید قریشی اور جناب قمرالدین صابری مسلسل "محفل علم وفن" کی جانب سے کوشش کئے جارہے ہیں ضرورت ہے کہ اردو کی انجمنیں اور اردو دوست حضرات صرف ایک ماہ کے لئے چوتھی جماعت کامیاب طلبہ کو داخلہ امتحان کے پرچوں کے ماڈل پر کوچنگ کا انتظام کریں اور والدین کے ذہن سے یہ خیال نکال دیں کہ ہم اپنے بچہ کو یتیم خانہ میں نہیں شریک کرواتے یہاں سے کامیاب طلبہ میڈیسن، انجنیرنگ، کمپیوٹر انجنیرنگ، زراعت وغیرہ کے شعبوں میں آسانی سے پہنچ جاتے ہیں ۔

ہمارے تعلیمی اداروں کے مسلم انتظامیہ کے پاس مقاصد کی فہرست میں کوئی ایک دفعہ ایسی نہیں ہے کہ ہر سال پانچ تا دس فیصد غریب ذہین میرٹ لانے والے طلبہ کے لئے داخلہ مفت رہے گا اور ان کے تعلیمی اخراجات بھی ایجوکیشن سوسائیٹی ہی برداشت کریگی ۔ سارے ملک کی اکثر ریاستوں میں میڈیکل انجنیرنگ کالجس، کالجس آف ایجوکیشن، کمپیوٹر انجنیرنگ، پالی ٹکنک ITI کے کئی ادارے مسلم انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہیں ۔ بے شک انہیں قائم کرنے اور اثاثہ جات کی تعمیر و ترقی کے لئے لاکھوں کروڑوں روپیے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جب تک یہ ادارے ابتدائی دس بارہ برس تک کوئی ڈونیشن فیس نہ لیں وہ اپنے اداروں کو ترقی نہیں دے سکتے چنانچہ کورسس کے لحاظ سے پانچ لاکھ سے لے کر ساٹھ ستر ہزار روپے کیاپٹیشن فیس اب عام بات ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شکایت اب عام ہوچکی ہے کہ غریب اور ذہین طلبہ میرٹ لانے کے بعد بھی اس کورس کو خرید نہیں سکتے ۔ ان کی حیرت

حسرت اس وقت بڑھ جاتی ہے جبکہ سینکڑوں رینک پیچھے کے امیدوار کو داخلہ مل جاتا ہے اور وہ محروم رہ جاتا ہے۔ ایسی بھی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ان کورسس میں داخلہ کے لئے بعض نے اپنے رہائشی مکانات فروخت کر دیئے اور اس عرصہ میں اس سیٹ کا بھاؤ دوگنا ہو گیا۔ اس طرح وہ گھر سے بے گھر ہو گئے اور اپنے ہونہار کا مستقبل بھی تاریک ہو گیا۔

ہمارے عمائدین ملت کی زبانیں ایک عرصے سے اس بارے میں خاموش ہیں اگر یہ تعلیمی ادارے پانچ تا دس فیصد غریب، ذہین طلبہ کا داخلہ مفت رکھیں اور ان کے تعلیمی اخراجات کی بھی کفالت کسی حد تک کریں تو یہ ملت پر بڑا احسان ہوگا۔ انھیں ضرور کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ یہودی شیلاک SHYLOCK کا رول ادا کرے اور بڑی بے دردی سے ملّت کے لاقیمت ذہین سرمایہ کو یوں اپنے ہی ہاتھوں برباد کر دے جو ملّت کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر اجتماعی طور پر نہ کسی تعلیمی کانفرنس میں غور کیا گیا ہے اور نہ اسکی اہمیت پر سنجیدگی سے گفتگو ہو پاتی ہے۔ ان غریب طلبہ کی شرکت اور ساتویں جماعت تک ان کے تعلیمی ضروریات کی پابجائی ایک منصوبہ بند پروگرام کی طالب ہے۔ بظاہر یہہ ایک معمولی سا کام نظر آتا ہے لیکن آج کرنے کا کام یہی ہے باقی سب کام تعلیمی میدان میں دوسرے تیسرے درجہ پر آتے ہیں۔

تعلیم میں مسابقت کا جذبہ

COMPETITIVE SPIRIT IN EDUCATION

منشی پریم چند نے اپنے کسی افسانہ میں قدیم زمانہ، کا حال لکھا ہے جب کہ تعلیم نام کو نہ تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ لوگ داستان گل بکاولی، گلستان پڑھ کر تحصیل دار ہو جاتے تھے ۔ کوئی پچاس برس پہلے تک بھی مسابقت کے متعلق عام طور پر لوگوں کو اتنا احساس نہ تھا جیسا کہ آج زندگی کے ہر شعبے میں مسابقت Competition کا چرچا ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ تعلیم یافتہ حضرات کو اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق کہیں نہ کہیں ملازمت مل جاتی ۔ بعض اعلیٰ ملازمتیں ایسی ضرور تھیں جن کے لئے اثرات اور سفارش، رسوخ اور دوسری باتوں کا عمل دخل ہو وہاں تعلیمی مسابقت کی بات سوچنے کی ضرورت ہی نہ تھی ۔

ناانصافیوں کا شکوہ ہر زمانے میں رہا ہے ۔ دولت وثروت، عزت وشہرت شان وشوکت کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا ۔ لوگوں میں کوئی تعلیمی قابلیت نہیں ہوتی لیکن ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت اوپر پہنچ جاتے ہیں ۔ معاشرہ میں اصل مسئلہ ان ذہین طلباء کا ہوتا ہے جو قابلیت و صلاحیت رکھتے ہوئے بھی مسابقتی امتحانات میں پیچھے رہ جاتے ہیں، اس کی چند عام وجوہات یہاں درج ذیل ہیں

۱۔ گھر کے ماحول پر اگر غربت اور جہالت کا سایہ ہو تو بچہ ابتداء ہی سے کسی اونچے عہدے اور اعلیٰ معیار تعلیم تک پہنچنے کے متعلق بہت کم سوچتا ہے ۔ وہ ابتداء ہی سے اپنے اطراف واکناف کے لوگوں اور رشتہ داروں کو اپنا آئیڈیل بنائے رکھتا ہے ۔ اس کے فکر کی اڑان اپنے گھر کے چند کامیاب لوگوں سے آگے نہیں جاتی ۔

۲۔ ہر طالب علم کو اسکول میں اپنے ہم جماعت طلباء سے روز ہی سابقہ پڑتا ہے جو طلبہ اچھے پڑھے لکھے خوش حال گھرانوں سے آتے ہیں وہ نسبتاً ذہین ہوتے ہیں ۔ وہ کلاس میں جوابات دینے میں ، ہم جماعت طلباء سے آگے رہتے ہیں اس طرح وہ اپنی قابلیت کا رعب اپنے ساتھیوں پر جمانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے جو آگے چل کر خطرناک حد تک زندگی میں ناکامیوں کا سبب بن جاتا ہے ۔

۳۔ ہمارے خیال میں سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ہر طالب علم کو میٹرک کامیاب کرنے سے پہلے پندرہ سال کی عمر تک اسے اپنی صلاحیت قابلیت کا ادراک ہو جانا چاہئے جسے ہم خود آگہی یا Self - Realisation یا Self Conciousness بھی کہتے ہیں ۔ اکثر ذہین طلباء کو یہ معلوم ہی نہیں ہونے پاتا کہ وہ کس قابلیت اور صلاحیت کے مالک ہیں ان میں کون سی مہمات کو سر کرنے کی صلاحیت پوشیدہ ہے ۔ بعض حضرات جن کی عمریں چالیس پچاس برس کی ہو چکی ہیں آپ انہیں کہتے ہوئے سنیں گے کہ اگر میں آئی ۔ اے ۔ ایس (I.A.S) کے امتحان میں بیٹھ جاتا تو ضرور کامیاب ہو جاتا یا پھر کبھی کا منسٹر بن جاتا یا پھر ڈاکٹر یا انجنیئر بن جاتا ۔ انہیں پندرہ سال کی عمر میں جس بات کا ادراک ہونا چاہیئے تھا وہ پچاس برس کی

عمر میں ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسکول ہی کے زمانہ میں ماہرانہ رہنمائی اور مشورے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں Counselling and Guidance کا انتظام ہے۔ہمارے ہاں عام طور پر اسکولوں میں اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ کچھ اچھا پڑھ لے گا تو کچھ بن جائے گا۔ طلباء پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں، انھیں راستے کی تلاش ہے اور نہ منزل کا پتہ ہے، ماں باپ کو ایک ہی رٹ لگی رہتی ہے کہ لڑکا ڈاکٹر یا انجنیئر بن جائے، ان کا میلان طبع، ذہنی صلاحیت چاہے کچھ ہو یہی وجہ ہے کہ اکثر طلباء والدین کو سخت مایوس کر دیتے ہیں۔اس میں طلباء سے زیادہ خود والدین قصور وار ہیں۔

۴۔احساس کمتری ایک نفسیاتی مرض ہے اور بہت سارے طلباء اس کا شکار رہتے ہیں بعض بڑی عمر کے لوگوں میں بھی یہ مرض عام ہے وہ وقت بے وقت اپنے کارناموں کا اشتہار کرتے نظر آتے ہیں، بعض احساس برتری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ دراصل احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔اکثر طلباء پہلے ہی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس اعلیٰ امتحان میں شریک ہونے کے اہل نہیں ہیں۔جب نتیجہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اونچے درجے میں کامیاب ہوئے۔آپ نے اکثر سنا ہو گا مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ میں گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیا گیا ہوں۔

جو ذہین طلباء پہلے ہی سے یہ سمجھ چکے ہوں کہ وہ اس امتحان میں ناکام ہو جائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے بہت پہلے اپنی شکست ناکامی اور نامرادی کو تسلیم کر لیا ہے۔ادھر دن رات بظاہر امتحان کی تیاری بھی ہے اور دل میں یہ خیال بھی آتا رہتا ہے کہ ناکام ہونا تو مقدر میں ہے ان مخالف قوتوں Contradictory Forces کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناکام ہو کر ہی رہے گا۔جو

طالب علم صرف یہ جانتا ہے کہ وہ اس مہم کو سر کر کے ہی رہے گا۔اس کے جذبے اور عام طالب علم کے جذبے میں زمین وآسمان کا فرق پڑجائے گا۔ایک امریکی خاتون ماہر تعلیم نے بہت اچھی مثال دی ہے۔گھوڑا اپنے سوار کو پیٹھ پر بیٹھتے ہی پہچان لیتا ہے۔ جو شہہ سوار نہیں ہے اس کی پریشانی، گھبراہٹ Nervousness گھوڑے کی رگوں میں دوڑ جاتے ہیں اور وہ آسانی سے اسے زمین پر پٹک دیتا ہے اور جو سچ مچ شہہ سوار ہوتا ہے اس کے بیٹھتے ہی وہ اس کی خود اعتمادی کو بھانپ لیتا ہے اور وہ شرارت کرنے نہیں پاتا۔یہی بات اعلیٰ مسابقتی امتحانات کی ہے اور یہی بات کرکٹ ہو یا کبڈی کا کھیل ہو سب پر صادق آتی ہے۔جب تک یہ خود اعتمادی نہ ہو کوئی مہم کامیاب نہیں ہو سکتی۔

خود اعتمادی بس یوں ہی نہیں آجاتی، اس کے لئے تین عناصر اہم ہیں۔ بھرپور تیاری کرنا، صحت کو قائم رکھنا اور عام معلومات وخیالات کا صحیح تجزیہ کرنے کی صلاحیت کے ساتھ مزاج میں توازن کا ہونا ضروری ہے۔خود مزاج میں توازن بھی، تعلیم، غور وفکر اور بحث ومباحثہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

۵۔ مسابقتی امتحانات میں تحریری امتحان کامیاب کر لینا کافی نہیں ہے۔انٹرویو انتخاب کا لازمی جز ہے تحریری امتحان میں بہت سے امیدوار کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن انٹرویو میں ناکام ہوجاتے ہیں۔انٹرویو میں امیدوار کی شخصی وجاہت Personality کی جانچ کی جاتی ہے۔مختلف سوالات کے ذریعے اپنے مضمون میں مہارت۔کسی مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کی قابلیت اور تجزیئے کے بعد نتائج نکالنے کی صلاحیت، جس کو Expression کہتے ہیں ان سب باتوں کو جانچا جاتا ہے۔انٹرویو لینے والے اپنے فن کے اکسپرٹ ہوتے ہیں۔چار پانچ سوالات کے بعد ہی وہ بھانپ لیتے ہیں کہ امیدوار

کتنے گہرے پانی میں ہے ۔ وہ بہت آسانی سے سمندر کی تہہ سے موتی نکال لیتے ہیں جو کنکر پتھر ہیں وہ خود بہت جلد سطح آب پر آکر تیرنے لگ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امتحان کی تیاری کے ساتھ ساتھ Mock Interviews کا بھی کوچنگ سینٹرس میں انتظام کیا جاتا ہے ۔

میری ایک نواسی حیدرآباد کے ایک اچھے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی ہے ایک مرتبہ اس نے مجھے خط لکھا کہ میں اپنی چھٹی جماعت کے تینوں سیکشن میں ہمیشہ فرسٹ آتی رہی اب کی مرتبہ مجھے ایک مضمون میں تین نمبر کم دے کر ایک ٹیچر جو مجھ سے جلتی ہیں ، دوسری نمبر پر لائی ہے ۔ اس سے مجھے بہت دکھ ہوا ۔ خط انگریزی میں تھا میں باہر تھا اور فوراً اسی روز جواب دیا کہ اگزامنر کے لئے بڑی مشکل اس وقت پڑتی ہے جب کہ کئی امیدوار ایک ہی سطح کے ہوں ان کے لئے آسانی اس وقت ہوتی ہے جبکہ فیل ہونے والوں کی تعداد یا اوسط طلباء بہت ہوں ۔ ان باتوں کا زیادہ اثر لینا نہیں چاہیئے ۔ اکثر طلباء اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کو نبھانے کے لئے ہم ممتحن کی ذات پات ، ذہنیت وغیرہ پر حملے کر بیٹھتے ہیں ۔ ہمیں دوسروں پر الزام رکھنے سے بڑا سکون ملتا ہے ۔

جناب سید حامد صاحب جو انڈین پبلک سروس کمیشن کے رکن رہے ہیں وہ ایک مرتبہ کہہ رہے تھے کہ آئی ۔ اے ۔ ایس کے انٹرویو میں کوئی مسلم امیدوار نہیں آرہا تھا ۔ اس کے چیرمین جناب سید حامد سے مخاطب ہو کر کہنے لگے :

" حامد صاحب ! انٹرویو میں کوئی مسلم امیدوار آہی نہیں رہا ہے تاکہ ہمیں کچھ تو تعصب بتلانے کا موقع ملتا " ۔

یہ جملہ معنیٰ خیز ہے ۔ اصل میں اگر امیدوار میں قابلیت وصلاحیت اور خود

اعتمادی ہو تو اس کو نااہل قرار دینا خود انٹرویو لینے والوں کے لئے بھی آسان نہیں ہے اس کی ایک اچھی مثال حال ہی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک رٹائرڈ پروفیسر کی زبانی سننے میں آئی۔

"کسی مضمون میں ایک لکچرر کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ خود بحیثیت ایکسپرٹ کے اس انٹرویو بورڈ میں شریک تھے۔ان کا بھی اپنا ایک امیدوار تھا۔ ویسے ہر ایک کو کسی نہ کسی ایک امیدوار میں دلچسپی رہتی ہے بہت سے امیدوار انٹرویو میں شریک تھے۔ اس میں ایک اسکول کے ٹیچر معمولی کرتے پاجامے اور چپل پہنے ہوئے داخل ہوئے۔ اس ہیئت کذائی پر سب کو تعجب ہوا، کیوں کہ انٹرویو میں ہر ایک امیدوار، سوٹ بوٹ اور ٹائی میں تھا۔اس امیدوار نے انٹرویو میں اپنے جوابات اور معلومات کی گہرائی سے اراکین کو ششدر کر دیا پہلے تو سارے ممبروں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر بھی ایک ممبر نے دبی زبان سے کہا کہ کلاس ڈسپلن کے لئے شخصیت اور اچھا لباس بھی ضروری ہے۔ وائس چانسلر نے کہا انھیں ایک شیروانی اور سوٹ سلوا کر پہنا دیجئے طلباء کا فائدہ ہوگا۔ لباس اچھا ہو لیکن قابلیت واجبی سی ہو تو طلباء کا نقصان ہی نقصان ہوگا۔ چنانچہ اس ٹیچر کا انتخاب ہو گیا۔ تمام ممبران اسکی ذہانت اور قابلیت پر دنگ رہ گئے۔ اسے کسی بہانے نااہل قرار دینا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔

انٹرویو میں شخصی وجاہت کے علاوہ عام معلومات، اطراف واکناف کے ماحول کا ادراک، تجزیہ کرنے کی صلاحیت اور خود اعتمادی دیکھی اور پرکھی جاتی ہے۔ بعض

سوالات پر آپ کی ذہانت و قابلیت کی چمک ہی کام آسکتی ہے جسے انگریزی میں Resourcefulness یا Spark of Intellegence کہتے ہیں ۔ یہیں پر اکثر امیدوار پریشان ہوجاتے ہیں ۔ ایک آدھ جواب ایسا ویسا دے دیا تو Nervousness اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ اس کی ایک بہترین مثال شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے کے ایک قصے سے سمجھ میں آجائے گی ۔ ہوا یہ کہ:

شہنشاہ کے زمانے میں کسی راجہ کا انتقال ہوگیا ۔ اس کا بیٹا پانچ چھ سال کی عمر کا تھا اس کا چچا چاہتا تھا کہ اس بچے کی کم سنی سے فائدہ اٹھاکر خود راجہ کی گدّی پر قبضہ کرلے لیکن راجہ کے وزیر کی کوشش تھی کہ کسی طرح یہ تخت و تاج اس کم سن بچے کو ملے جو اس کا حق دار ہے ۔ وہ اس لڑکے کو لے کر شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں حاضری کے لئے روانہ ہوا ۔ دوران سفر وہ راستہ بھر لڑکے کو سمجھاتا گیا کہ اگر شہنشاہ یہ سوال کریں تو یہ جواب دینا اور یہ سوال کریں تو ایسا جواب دینا ۔ لڑکا خاموش سنتا رہا ، بالآخر بول اٹھا اگر اس میں سے ایک سوال بھی نہیں آیا اور کوئی نیا سوال ہو تو پھر میں کیا کروں اس بات پر وزیر دنگ رہ گیا ۔ اس کا جواب وزیر نے اس طرح دیا "جس ذات نے اس وقت یہ سوال تیرے دل میں ڈال دیا ہے وہی اس کا جواب بھی سمجھادے گا" ۔ محل میں پہنچ کر شہنشاہ کو اطلاع دی گئی ۔ اس وقت اورنگ زیب پانی کے حوض میں نہارہے تھے ۔ وزیر اور ننھے راج کمار کو وہیں بلالیا ۔ بچہ تو حوض کے کنارے دونوں پیر پانی میں چھوڑ کر لاپروائی سے بیٹھ گیا ۔ وزیر ادب

سے کھڑا رہا۔ شہنشاہ اس بچے کی معصومیت اور لاپروائی کو دیکھ کر
کچھ متعجب ہوا اور اس کے نزدیک آکر بچے کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے
اور کہا ابھی تجھے اس حوض میں ڈبو دیتا ہوں ۔بچہ ہنسنے لگا۔ پوچھا اس
میں ہنسنے کی بات کیا ہے ؟ جواب میں بچے نے کہا جب آپ میرے
دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں تو میں پانی میں کیسے ڈوب سکتا ہوں ؟
شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر بچے کی ذہانت سے متاثر ہوا اور راج
گدی کا پروانہ اسی بچے کے نام لکھ دیا۔

دیکھئے دوران سفر وزیر کی ساری کوچنگ بے کار گئی ۔جو چیز کام آئی وہ لڑکے کی ذہانت و فطانت ہے جو اسی لمحہ بجلی کی طرح چمک گئی بس یہی Resourcefulness ہے ۔یہ محض حاضر جوابی یا wit نہیں ہے بلکہ اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔

اگر آپ اسکول اور کالج لائف میں مختلف مصروفیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ناکامیوں سے مایوس نہ ہوں تو زندگی میں ہر مسابقت کا سامنا کرنا آسان ہوجائے گا۔ اولمپک گیمس میں ساری دنیا کے ہزاروں اسپورٹس مین شریک ہوتے ہیں لیکن میڈلس حاصل کرنے والے چند ہی ہوتے ہیں جو عالمی شہرت اور اعزاز کے مستحق ہوجاتے ہیں ۔ان گیمس میں شریک ہونے والوں کا بھی اعزاز کچھ کم نہیں ۔اگر یہ شریک ہی نہ ہوتے تو پھر مقابلہ کس سے رہ جاتا اس طرح ہم ان امیدواروں کا احسان مند ہونا چاہیئے جنھوں نے اس مسابقت میں انعام پانے کا مستحق بنایا ۔جس کے دل میں اپنے مقصد کو پانے کا سچا عزم اور جذبہ ہو، سخت محنت کا خوگر ہو اخلاص ہو تو وہ اپنے مقصد کو پا کر رہے گا۔

ایک طالب علم کا نادر سوال

ہر ماہ کے آخری اتوار کو اردو گھر مغل پورہ میں "میسکو" کی جانب سے عوام کی دلچسپی کے کسی نہ کسی عنوان پر لکچر س کا اہتمام رہتا ہے۔ ۲۵/ مئی کو وقت کی اہم ضرورت کے طور پر " طلبہ کا مستقبل، میٹرک کے بعد " رکھا گیا تھا کنوینر ڈاکٹر قمر حسین انصاری نے اس سوال کا جواب دینے کے لئے ایک پیانل بنایا تھا جس میں یہہ راقم بھی شریک تھا۔ ایک کالج کی نو عمر انگلش کی لکچرار مسز انوپما اردو، اور انگریزی میں تقریر اور جوابات کی وجہہ سارے منظر پر چھائی رہیں۔ ان ہی سولات میں ایک طالب علم نے یہہ سوال کیا کہ " میں ایک بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں اور دنیا میں بہت عزت و شہرت کا خواہش مند ہوں، اس کی کیا ترکیب ہے۔"

مسز انوپما نے جواب دیا کہ مخلوق کی خدمت کو اپنا وظیفہ بنالو تم بڑے آدمی بن جاؤ گے یا پھر کوئی ایسا کام کر دکھاؤ جو عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہو۔ یہہ دونوں جواب بہت معقول تھے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

دس بارہ برس کی عمر سے لے کر تیس برس کی عمر تک یہہ سوال اکثر بچوں اور نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ وہ اس عمر کے دوران ان کامیاب افراد کے متعلق بہت کچھ سنتے رہتے ہیں جن کا تذکرہ اکثر خاندن کے لوگوں میں رہتا ہے یا پھر محلہ، شہر، اخبار ار ٹی وی پر یہ لوگ نظر آتے رہتے ہیں۔ جو شخص جتنا بڑا اور اہم ہوگا اس کا تذکرہ بھی لوگوں کی زبان پر اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ ہر ایک کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ چاہے وہ محدود دائرہ ہی میں کیوں نہ ہو اس کو جانا جائے اور اس کو کچھ مقام حاصل ہو، اس کی تعریف ہو یہہ ہماری " انا " کا ایک لازمی جزؤ ہے۔ آدمی کی یہہ

کمزوری کہیئے یا خود فریبی، اس میں چھوٹا بڑا سب ہی گرفتار ہے۔

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

عزت و شہرت تین طریقوں سے ملتی ہے۔(۱) ایک تو وہ کسی معزز گھرانے میں پیدا ہوا ہو جیسے بادشاہ کا بیٹا روز اول ہی سے عزت و شہرت کا مالک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی دولت مند یا صاحب شہرت و وجاہت کے گھر کی اولاد۔ لیکن جمہوریت نے ایسے بہت سے پرانے سانچوں کو توڑ ڈالا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے اپنے لڑکے کو خط لکھتے ہوئے کہا ہے کہ کوئی نہیں پوچھتا کے اس کا باپ کون تھا، دادا کیا تھا۔ آدمی صرف اپنے فن و کمال اور ذاتی قابلیت و صلاحیت کی وجہ مشہور ہوتا ہے

(۲) دوسری صورت عزت و شہرت خداد وقابلیت و صلاحیت کی وجہ سے ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں، غالب و اقبال، ٹیگور اور شیکسپیر، تان سین و لتا منگیشکر کو شاعری، ڈراموں اور موسیقی کی خداداد و صلاحیت کی وجہ شہرت و عزت نصیب ہوئی اسی میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ وہ قسمت کے دھنی ہوتے ہیں جو آسمان شہرت پر ستارہ کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ ان کی شہرت عارضی نہیں لافانی ہوتی ہے۔

(۳) تیسرے وہ اشخاص ہیں جنھوں نے کسی ایک فن کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا چاہے وہ کوئی معمولی سا ہنر ہی کیوں نہ ہو۔ اسی میں نام پیدا کیا۔ دور دور سے لوگ ان کے لئے آنے لگے۔ انجنیر بہت سے ہیں لیکن کوئی ایک بہت مشہور ہے ڈاکٹر بہت ہیں لیکن کوئی ایک اپنے فن میں کمال رکھتا ہے ان لوگوں نے برسوں ریاض کیا ہے۔ انھیں اپنے پیشہ اور فن کے سواء کسی اور شعبہ میں دلچسپی نہیں رہی۔ بعض سائنس

داں اور موجد ایسے بھی گذرے ہیں کہ انھیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تب ہی ایڈیسن نے ساری دنیا کو بجلی کے بلب سے منور کر دیا۔ نیوٹن نے انسانیت کے علم کو آگے بڑھادیا ۔ ہر سال نوبل انعامات کی فہرست چھ سات خوش نصیبوں کے حصہ میں آتی ہے جن کا نام ہم نے کبھی اخباروں میں دیکھا نہ سنا لیکن وہ اچانک دنیا کی اہم خبروں کا حصہ ہو جاتے ہیں یہہ سائنس داں اور ادیب پچاس ساٹھ برس تک اپنے کام میں لگے رہے ۔ وہ گوشہ گمنامی میں رہ گئے لیکن انھیں اس کی پرواہ نہیں رہی اور شائد انھیں نوبل انعام نہ بھی ملتا تو ایسے سرفروشوں کی گمنامی بھی شہرت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے یہہ دراصل انسانیت پران کے عظیم احسان کا انعام ہے

ہندوستان کے پہلے نوبل انعام یافتہ سر۔ سی ۔ وی رامن ۱۹۶۵ء میں جامعہ عثمانیہ میں کسی جشن کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لائے تھے ۔ وہ بنگلور میں اپنی لیابریٹری میں، ہیروں کی ماہیت پر ریسرچ کر رہے تھے ۔ کسی طالب علم نے سوال کیا کہ آپ ہمیں ہیرے بنانے کی ترکیب کیوں نہیں بتلاتے سر۔ سی ۔ وی رامن نے جواب دیا اس کی ترکیب تو بہت آسان ہے ۔ آپ چار کول (کوئلہ) کو ایک ہزار فیٹ زمین کے اندر دفن کر دیجئے اور ایک ہزار سال تک انتظار کیجئے تا کہ زمین کے اندر اس گہرائی کی تپش سے وہ ہیرا بن جائے ۔ یہاں پر ہمارے کام کی بات یہہ ہے کہ اگر آپ بھی ہیرا بننا چاہتے ہیں تو مسلسل جدوجہد ، صبر اور تپش کی منزلوں سے گذرنا پڑے گا

۱۹۵۲ء کے لگ بھگ پنڈت نہرو نے کسی سائنس کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اب ہندوستان آزاد ہو چکا ہے سائنس داں اب اپنے IVORY TOWERS یسم اللہ کی گنبد سے باہر آجائیں اور عوام کی فلاح کے لئے کام کریں ۔

دوسرے ہی دن سر۔سی۔وی رامن نے اس کا بہت معقول جواب دیا۔پنڈت نہرو کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم زمین کا نمک ہیں WE ARE THE SALT OF THE EARTH ۔ ہم اپنی تجربہ گاہوں میں خاموشی سے وہ کام کر رہے ہیں جو انسانیت کے لئے بے حد فیض رساں ہیں۔دنیا کی ترقی ہماری وجہہ سے ہے نہ کہ سیاست دانوں کی وجہہ۔کچھ عرصہ بعد جب دونوں بنگلور میں ملے تو آپس کی نوک جھونک پر بہت مسرور ہوئے سمجھاں کام کی بات یہ ہے کہ اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق اپنا راستہ اور منزل مقرر کر لینا چاہیئے۔

گاندھی جی، پنڈت نہرو مولانا آزاد اور اسی قد وقامت کے لیڈروں نے اپنی منزل متعین کرلی تھی وہ تھی ہندوستان کی آزادی جس کے لئے انھوں نے عظیم قربانیاں دیں اور وہ قوم کے بڑے لیڈر بن گئے۔

یہہ بہت بڑے لیڈروں کی باتیں ہیں ہمارے ہاں لیڈر کے معنی سیاسی قائد کے ہیں لیکن امریکہ میں ہر وہ شخص جو اپنے فن میں کمال حاصل کرلیتا ہے اس کو اس فن کا لیڈر مانتے ہیں۔اس طرح ہر شعبہ میں لیڈر ہوتے ہیں آپ اپنے محلہ میں کسی الکٹریشن، پلمبر، کارپنٹر کی تلاش میں نکل جائیں اور دو چار سے پوچھنے کے بعد سب ایک ہی کا نام بتلائیں گے آپ اس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے کسی اور سے مشورہ کئے بغیر اس تک پہنچ جائیں گے۔کیوں کہ نہ صرف اس کو اپنے فن میں مہارت حاصل ہے بلکہ اس کی دلچسپی اور دیانت داری کی وجہہ اس نے ایک محدود معاشرہ ہی میں سہی اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ع

کمی نہیں قدرداں کی اکبر کرے تو کوئی کمال پیدا

یہہ کوئی ضروری نہیں کہ آپ کا نام چار دانگ عالم میں پھیل جائے ۔آپ کے اپنے خاندان ، محلہ ، بستی اور شہر میں بھی آپ کے کام اور نام کی شہرت ہو سکتی ہے ۔ عزت و شہرت پر ہمارا کوئی اختیار نہیں اسکا انحصار دوسروں پر ہے ۔ سستی شہرت دیر پا نہیں ہوتی ۔ لوگ بہت جلد کھرے اور کھوٹے کو پہچان لیتے ہیں وہ خود نقارہ خدا بن جاتے ہیں

آپ کے سامنے اطراف و اکناف اور تاریخ کے صفحات پر اسی قسم کے سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی ۔یہہ کوئی راز نہیں ہے ۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے کہ اکثر آدمی کسی اچھے کام کو شرع کرنے کے لئے بہت سونچتا ہے اور آج کل میں عمر کا بہت سا حصہ ضائع کر دیتا ہے جب کچھ کرنے پر بالاخر آمادہ ہو جاتا ہے تو ہاتھ پیر جواب دینے لگ جاتے ہیں اور کوئی قابل ذکر کام کئے بغیر وہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے ۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے پہلا قدم اس راستہ میں اٹھایا اور چل نکلے لیکن ایسے لوگ بھی دنیا میں کتنے ہیں ۔

سرسید کی یاد میں

ایجوکیشنل ٹرسٹس کا قیام وقت کا تقاضہ

سرسید کی تاریخ پیدائش 17 / اکتوبر 1817 ہے۔ اس دن علی گڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن (جس کی شاخیں ساری دنیا کے بڑے شہروں میں قائم ہیں) کی جانب سے بڑے اہتمام سے "یوم سرسید" منایا جاتا ہے اور سرسید ڈنر بھی یادگار ڈنر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ روایتی تقریب برسوں سے چلی آرہی ہے۔ تقسیم ہند سے قبل تک ہندوستان کی ساری ریاستوں میں علی گڑھ برادری کے سپوت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اقتدار، دولت، عزت و شہرت ان کا طرّہ امتیاز رہا۔ سرسید کے زمانہ ہی سے علی گڑھ مسلم یونیورٹی کی اعلیٰ تعلیم بڑی حد تک مسلمانوں کے متوسط طبقہ تک پہنچ گئی۔ لیکن غریب مسلم آبادی کا وہ ساٹھ فی صد طبقہ آج بھی اسی طرح اچھوت اور محروم ہے جیسا کہ وہ ڈیڑھ سو برس سے محروم چلا آرہا ہے۔ وہ تعلیم کو دولت کی طرح قسمت کی بات سمجھتا ہے۔

سرسید 81 برس کی عمر پاکر 28 / مارچ 1898ء کو وفات پاگئے۔ / 27 مارچ 1998ء کو پورے ایک سو برس ہوجائیں گے۔ سرسید کا اہم ترین کارنامہ ایک کالج کھولنا نہیں ہے جو بعد میں چل کر یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا بلکہ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے ذریعے تعلیم کی اہمیت کو نہ صرف عام کرنا بلکہ تعلیمی شعور بیدار کرنا اور "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کی لگاتار کوشش کرنا اہم

ترین کارناموں میں سے ہے۔ یہ اسی پیر دانا کا احسان ہے کہ آج ساری قوم میں تعلیمی شعور بیدار ہو چکا ہے۔ غریب طبقات میں تعلیم کی اہمیت کا احساس دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے لیکن ان کی غربت اور معاشی مجبوریاں ان کے راستہ کے پتھر ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب دانش نے 28 / مارچ 1998ء سے مارچ 1999ء تک ایک سال کے لیئے سرسید کی صد سالہ برسی منانے کا فیصلہ کیا ہے اور ایک بسوط پروگرام بھی ترتیب دیا گیا ہے۔ پروفیسر ابو لکلام قاسمی۔ مدیر "تہذیب الاخلاق"، کا یہ کہنا درست ہے کہ "سرسید صدی تقاریب کا پورا سال ایک معنیٰ میں سرسید تحریک کا احیاء اور نشاۃ ثانیہ کا سال بن جائے گا"۔

اس سارے پروگرام میں جس کمی کا شدت سے احساس ہوا وہ سرسید کے تعلیمی مشن کو جاری و ساری رکھنے کیلئے ہر ریاست، ضلع اور تعلقہ میں مسلم ایجوکیشن ٹرسٹس کے قیام کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے پچاس سال بعد بھی مسلم معاشرہ میں ساٹھ فی صد ناخواندگی کے باوجود چند ایک نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگی ہیں۔ معاشی لحاظ سے پسماندہ طبقات کے بچوں کا، درمیان ہی سے تعلیم ترک کر دینا ان کی تعلیم سے عدم دلچسپی نہیں بلکہ ان کی معاشی مجبوریاں ہیں جو رفتہ رفتہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ دوسرا متوسط طبقہ ہے جن کے بچوں میں اعلیٰ فنی تعلیم کا بے حد شوق پیدا ہو چکا ہے۔ اور وہ مسابقتی امتحانات میں حصہ لینے لگے ہیں۔ عام طور پر قوم میں کسی حد تک ملی احساس پیدا ہو چکا ہے۔ ہر کام میں اس۔ احساس کا پیدا ہو جانا ہی بہت غنیمت ہے۔ وہ اچھے کاموں میں کسی حد تک حصہ لینے لگے ہیں۔

6 / ڈسمبر 1992ء کو بابری مسجد کی شہادت تاریخ اسلام کا ایک

تاریک ترین باب ہے لیکن یہ حادثہ مسلم قوم کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوا ہے۔ اس واقعہ نے پہلی مرتبہ ساری قوم کو جگا دیا ہے اب وہ کچھ۔

ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سوتے میں کچھ کلبلانے لگے ہیں
دھوئیں کچھ دلوں سے نکلنے لگے ہیں
کچھ آرے سینوں پر چلنے لگے ہیں

(حالیؔ)

مسلمانوں میں آج دس فی صد لوگ ضرور ایسے ہیں جو کروڑوں کے مالک ہیں اور یہ ملت کے بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنی عافیت اسی میں دیکھتے ہیں کہ ان کی اور ان کے افراد خاندان کی زندگی نہایت عیش و آرام سے گذر جائے اور وہ خدمت خلق کے کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتے۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی قوم کی ترقی کے لئے زبردست ایثار سے کام لیتے ہوئے تعلیمی اور فلاحی اداروں کو ہر سال کئی ملین ڈالر دیدیتے ہیں۔ اگر مسلمان ڈھائی فیصد زکوۃ ہی نکالنے لگیں تو یہ رقم ایک ہی سال میں کروڑوں تک پہنچ جائے گی۔

سرسید چاہتے تو بڑے طمطراق کی شاندار زندگی گزار سکتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی وفاداریوں کے سلسلہ میں انگریزوں نے انھیں بڑی زمینداری اور تعلقہ داری کا پیش کش کیا۔ لیکن سرسید کو بڑی غیرت اور شرم آئی کہ سارے مسلمان تو گردش ایام کی چکی میں آٹے کی طرح پسے جا رہے ہیں اور وہ خود عیش و عشرت میں موج کریں ان سارے انعامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سرسید نے ایک حکیم دانا اور طبیب مستند کی طرح قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا

وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلم قوم کے سارے امراض کا ایک ہی بنیادی سبب تعلیم سے محرومی ہے۔ غدر کے بعد کے حالات کی وجہ ساری مسلم قوم کے ہوش و حواس جا چکے تھے۔ اسی مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں سر سید نے ایک تعلیمی کمیٹی "کمیٹی خواستگار و ترقی تعلیم مسلمانان" کے نام سے قائم کی جیسا کہ اس کمیٹی کا نام دلچسپ ہے اس کی روداد بھی دلچسپ ہے۔ 24 / مئی 1875ء کو مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد رکھا گیا۔ اس تقریب کی مختصر روداد آپ بھی سر سید کی زبان میں سن لیجئے۔

"جب سوسائٹی قائم ہو گئی تو میں اس کا سکریٹری تھا۔ خالص احباب جو ممبر تھے بھی کہتے تھے کہ مسلمان اور ان کی ترقی تعلیم کا خیال ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ جب چندہ جمع کرنے کا ذکر آیا تو ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ وہ اس خیال کو جنون اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب اپنے دوست کے بازو پر، امام ضامن کی نیاز کا روپیہ بندھا دیکھا تو میں نے سوال کیا کہ مسلمانوں کی قوم سے زیادہ کوئی اور اس روپے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ وہ سبز کپڑا جس میں نذر بندھی ہوئی تھی انھوں نے مجھ کو دیا جب اس کو کھولا تو اس میں ایک روپیہ اور دو منصوری پیسے تھے۔ یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانہ میں ڈالا گیا۔"

(تعلیم ایک تحریک ۵۶)

سر سید کے زمانہ میں چندہ کا کام بہت مشکل تھا اور آج بھی کچھ آسان نہیں اس کام میں عزت نفس کو بالائے طاق رکھنا اور ذلتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اب تعلیمی مشن چلانے کیلئے سرمایہ کی سخت ضرورت ہے۔ دیکھئے طلبہ کی جانب سے ڈرامہ کا اسٹیج تیار ہے، کچھ دیر میں ایک مرد درویش گھنی ریش مبارک کے ساتھ فقیروں کا پھٹا پرانا لباس پہنے تہمد باندھے ہوئے سر پر میلی ٹوپی، کاندھے سے

جھولی لٹکی ہوئی، ہاتھ میں کشکول لئے اسٹیج پر آتا ہے۔اس کی آنکھوں میں وہی مایوسی ہے اور اس کے گالوں میں وہی قحط نمایاں ہے جو فقیروں کی صورت میں عیاں ہوتا ہے زبان پر غالب کا یہ شعر ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اور وہ صدا لگاتا ہے۔صاحبو! قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک پیسہ ہی خیرات کر دو آپ اس منظر کو کچھ دیر کیلئے اپنی آنکھوں کے سامنے لائیے۔عجب نہیں اس منظر کو دیکھ کر ناظرین کے آنسو نکل پڑے ہوں۔(تعلیمی مسائل صفحہ ۹۰)

سرسید کے تعلیمی مشن کو جاری رکھنے کے لئے علی گڑھ کے طلبہ نے کوئی خاص نمایاں کام نہیں کیا ہے سوائے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کے۔ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب کے۔ان ہی میں حیدرآباد کے ڈاکٹر حامد علی اولڈ بوائے کا نام سنہری حروف میں لکھنے کا قابل ہے جب کہ انھوں نے 1944 ء میں اپنی زندگی کی ساری پونجی چھ لاکھ روپے کی رقم قوم کے بچوں کی اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم میڈیسن اور انجنیرنگ طلبہ کو وظائف دینے کے لئے وقف کر دی۔یہ اس زمانہ کی رقم ہے جو آج کے چھ کروڑ کے برابر ضرور ہوگی۔53 برس پہلے اتنی بڑی رقم کا کسی مسلمان دانشور کا ملت کے ہونہار طلبہ کے لئے ٹرسٹ کا قائم کر دینا اس زمانہ میں، طلسم ہوشربا کے قصہ سے کم نہ تھا۔فرد واحد کی طرف سے اس ایثار کی مثال سارے ملک میں آج تک بھی نایاب و کمیاب ہے۔

چند برسوں سے مختلف ٹرسٹ اور فاونڈیشن کے قیام کی خبریں سننے میں آرہی ہیں۔حکومت ہند کا ابو لکلام آزاد ایجوکیشن ٹرسٹ دہلی 25 کروڑ کا قائم ہو چکا ہے۔

اور کام شروع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ہمدرد ایجوکیشن ٹرسٹ ہے۔ حیدرآباد میں مدینہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیر سوسائٹی کے سکریٹری نے "ملت فاونڈیشن" تقریباً تین سال پہلے قائم کیا ہے۔ عبدالقادر جیلانی کا ہاشم فاونڈیشن، خاموشی سے اب تک دو چار کروڑ روپیہ تعلیم اور فلاحی کاموں میں خرچ کر چکا ہے۔ "دیانت چیریٹیبل ٹرسٹ" ملک پیٹھ سے ہر سال چھٹی جماعت سے میٹرک تک کے طلبہ کو ایک لاکھ روپے کی کتابیں، کاپیاں، پنسل وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ بشیرالدین بابو خاں اور غیاث الدین بابو خاں کا یونائیٹڈ اکنامک فورم اور زکوۃ فنڈ سے بہت سے حاجت مندوں کی مدد کی جاتی ہے۔ جناب عابد علی خاں کے قائم کردہ ادبی ٹرسٹ سے ادیبوں اور شعراء کی مدد کی جاتی ہے حضور نظام نے نہایت دور اندیشی سے "نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ" بارہ کروڑ کا قائم کیا جس سے ہزاروں بیوہ اور ضرورت مند وظیفہ پاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر کے ٹرسٹ سے کئی طلبہ وظیفہ پاتے ہیں اور بھی ایسے کئی ذاتی اور فیملی ٹرسٹ ضرور ہوں گے جن سے راقم الحروف واقف نہیں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اپنا بھی ایک ذاتی چھوٹا سا بے نام کا پچاس ہزار روپے کا ٹرسٹ ہے۔ اس ٹرسٹ سے ہر سال آٹھ دس ہزار روپے کی کاپیاں پنسل، ربر، کمپاس بکس اپنے گاؤں، دیہات کے بچوں کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ جون کے مہینہ میں یہ کاپیاں طلبہ میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔ دو تین سال کے عرصہ میں والدین اور طلبہ سے بات کرنے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ کسی حد تک تعلیمی شعور جاگ چکا ہے۔

سارے ملک میں ایسے ذاتی، فیملی، محلہ واری، قصبات اور شہروں میں چھوٹے بڑے ٹرسٹس قائم کرنے کی شدید ضرورت ہے ہمارے تجربہ میں یہ بات ہے

کہ بعض حضرات قیمتی جائیدادوں اور بینک بیالنس کے مالک ہیں اور بعض تو لاولد ہیں۔ وہ اپنی نجی محفلوں میں اکثر یہ تذکرہ برسوں سے کرتے آرہے ہیں کہ وہ ساری جائیداد اور پونجی قوم کے نام وقف کردیں گے۔ لیکن وہ اسی منصوبہ میں رہ گئے اور دنیا سے کوچ کرگئے۔ ان کی لاوارث جائیداد دوسروں کے حوالے ہوگئی حقیقی وارث محروم ہوگئے۔

انٹرمیڈیٹ کے اعلیٰ پیشہ وارانہ اور فنی تعلیم کے بہت سے وظائف ہیں ان طلبہ کے ساتھ رشتہ دار، دوست احباب کی ہمدردیاں بھی ہیں لیکن جو طلبہ سب سے زیادہ آج تک محروم ہیں وہ مڈل اور ثانوی درجہ کے غریب ذہین طلبہ ہیں۔ اگر وقت پر ان کی تھوڑی بہت مدد کی جائے تو یہ سب بہت آگے آسکتے ہیں۔ محض مالی مجبوریوں سے تنگ آکر یہ ترک تعلیم پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ ایک میڈیسن کے طالب علم کو ہر سال 75 ہزار روپے ٹیوشن فیس دینی پڑتی ہے۔ لیکن اتنی ہی رقم میں (50) طلبہ کو سال بھر کی فیس اور اسٹیشنری کے لئے کافی ہوجائے گی۔ جب تک ہمارے فنڈ یا ٹرسٹ اس طرف توجہ نہ کریں ملت کا یہ زرخیز سرمایہ یوں ہی بے فیض ہوکر رہ جائے گا۔ آزادی کے پچاس سال بعد بھی ہمارا ساٹھ فیصد طبقہ ایسا ہے جو تعلیم کی شدید ضرورت سے واقف نہیں۔ ان کے درمیان ضرور ایسے جواہر پارے مل جائیں گے جو بالآخر تعلیم نہ ہونے سے کنکر پتھروں میں گم ہوجاتے ہیں۔ ایک عام بے حسی کے سبب اس کا احساس زیاں بھی بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

سرسید کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایسے تعلیمی ٹرسٹس کا قیام ہی اس محسن قوم کی اچھی یادگار ہوسکتی ہے۔ جیسے پانی کی ایک شفاف نہر ہے جو کئی نسلوں کو سیراب کرتی رہے گی۔

مقامی زبان

اردو میڈیم طلباء کیلئے تیسری جماعت سے تیلگو کی تعلیم نہایت مفید اور دورس نتائج کی حامل رہیگی۔ وجوہات مندرجہ ذیل ہیں (۱) تیسری جماعت میں پہنچنے تک طلباء کی عمر ۸ سال ہو جاتی ہے۔ بچے تین چار سال کی عمر سے ۱۳، ۱۴ سال کی عمر تک چار پانچ زبانیں آسانی سے سیکھ جاتے ہیں کیونکہ اس دوران بچوں کا حافظہ (Rote Memory) بہت تیز ہوتا ہے۔ جس زبان کی بنیادیں اس عمر میں قائم ہو جاتی ہیں اس سے آئندہ چل کر بہت فائدہ ہوتا ہے اور اس زبان میں وہ آسانی سے مہارت حاصل کر سکتے ہیں تیرہ چودہ سال کی عمر کے بعد کسی زبان کے سیکھنے کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے۔ بچوں کے ذہنوں پر چار زبانیں سیکھنے سے کوئی بار نہیں پڑتا یہ ایک غلط فہمی ہے۔ بچوں کے ذہنی اپچ اور قابلیت اس بیان کی تصدیق نہیں کرتی۔ بچے آسانی سے مادری زبان، تیلگو، انگریزی اور ہندی اس عمر میں آسانی سے سیکھ جاتے ہیں۔ (۲) جہاں تک مادری زبان اردو کا تعلق ہے وہ بچے پانی کی طرح پی جاتے ہیں مادری زبان جسم و جان کا حصہ ہوتی

ہے۔ یہ بچہ کے ماحول، جذباتی اور روح کی زبان ہے اس لئے دنیا کے سارے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی پرائمری درجہ کی تعلیم دس بارہ سال لازماً مادری زبان میں دی جائے۔ اسکے باوجود ہم بچوں کو .K.G سے انگریزی میڈیم میں پڑھنے کے لئے مجبور کرتے ہیں حالانکہ یہ میڈیم غیر فطری، مصنوعی اور زیادہ تر رٹنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پر کوئی احتجاج نہیں کرتا (۳) ریاست حیدر آباد میں گاؤں دیہات میں اردو میڈیم تحتانوی (پرائمری) مدارس تھے لیکن تیلگو زبان کی تعلیم کا انتظام جماعت اول سے تھا جو طلباء اس زبان میں ساتویں جماعت تک تلگو پڑھے ہوئے تھے سیاسی حالات کی تبدیلی کے بعد انہیں اتنی تلگو دانی سے فائدہ ہوا۔ (۴) یہ تو نوشتہ دیوار ہے کہ ریاست کی سرکاری زبان تلگو ہے۔ اس زبان سے کسی طرح فرار کی کوشش ہمارے بچوں کیلئے سخت نقصان دہ ہے اسکے خلاف احتجاج کرنا خود ہماری نسل کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ حکومت کی تلگو تعلیم کی پالیسی اردو داں طبقہ کے عین مفاد میں ہے اسکو کسی طرح اقلیتوں کے دستوری حقوق میں دراندازی نہیں کہا جاسکتا۔ آندھرا پردیش کے قیام کو قریب 40 سال کا عرصہ ہو گیا۔ ابھی تک اس ریاست میں اردو داں طبقہ کچھ اجنبی سا رہ گیا ہے۔ زبان سے دوری سیاسی، معاشی اور تہذیبی دوریوں کیلئے راہیں ہموار کریں گی جو ہمارے مفاد میں نہیں ہونگے۔ تعلیم کے اس خالص مسئلہ کو سیاسی اور جذباتی انداز میں نہ سونچا جائے تو بہتر ہے۔ اس پالیسی کے خلاف احتجاج کی باتیں ناقابل فہم ہیں۔ ہر وہ زبان جسکے سیکھنے کے لئے کسی طرف سے جبر کا عنصر شامل ہو تو معصوم ذہنوں میں اس سے دوری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ حکومت نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے بلکہ رائے دریافت کی گئی ہے۔ اس پالیسی

پر جذباتی انداز سے غور کرنے کے بجائے محض تعلیمی مفاد کے نقطہ نظر سے ماہرین تعلیم غور کر کے کوئی ایک متفقہ رائے دیں تو مناسب رہے گا۔ اصل مطالبہ جو کرنے کا ہے وہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ہر تلگو اور انگلش میڈیم اسکول میں دس طلباء بھی ہوں تو ایک اردو پنڈت کا تقرر ہے اور اردو کی سینکڑوں جائیدادیں دس بارہ برس سے خالی پڑی ہوئی ہیں انکے پر کرنے کا سوال ہے اور طلبہ کو کتابیں اور فرنیچر فراہم کرنے کا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد قومی اردو یونیورسٹی
(چند ابتدائی مراحل کی اہمیت)

کسی کا یہ ریمارک کہ جب بچہ پیدا ہو چکا ہے تو پھر یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اس کی پرورش، صحت اور تعلیم کا انتظام کریں، یہی بات اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے بڑی حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں کانگریسی حکومتوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اردو کے چمن کو ریگستان میں تبدیل کر دیا اس صحرا میں جلیل پاشا کا یہ خیال کہ ملک میں ایک اردو یونیورسٹی ہونی چاہیئے۔ صدا بصحرا کی بولی نظر آئی۔ اردو کے ساتھ حکومتوں کے اس تاریخی ریکارڈ کی موجودگی میں کسی کو یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن پچھلی حکومت نے دو برس پہلے اردو یونیورسٹی کے قیام کی بات چھیڑ دی تاکہ اردو کے پرستاروں کی زبان کا ذائقہ قائم رہے۔ متحدہ قومی حکومت نے اس یونیورسٹی کا بل پاس کر کے ضرور اردو والوں کو ایک عظیم تحفہ دیا ہے۔ لیکن یہ تحفہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قحط زدہ علاقے میں مرنے والوں کے لئے بجائے غذائی پیاکٹس کی سپلائی کے انھیں پھولوں کا گلدستہ دیدیا گیا ہے۔ سید حامد نے اردو یونیورسٹی کا بل پاس ہونے پر یہ ریمارک کیا تھا کہ بغیر ستونوں کے پہلے چھت ڈالنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ دہلی کے کسی دانشور نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک بڑے درخت کو بغیر جڑوں کے زمین پر ایستادہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جب تک درخت کی جڑیں زمین کے اندر دور دور تک نہ پھیلی ہوں وہ کھاد اور پانی کو کیسے جذب کر سکے گا۔ جو اس کی زندگی، پھول، پھل اور

ہری پتیوں کے پھوٹنے کے لئے ضروری ہیں، یہی چند وجوہات ہیں کہ عام طور پر اردو کے پرستاروں کی جانب سے آج تک اس یونیورسٹی کا کوئی پرجوش خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ بلکہ عام طور پر اس عظیم پراجکٹ کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ ہے۔ کچھ اندیشے ہیں اور کچھ شبہات ہیں، وہ محض خیالی نہیں ہیں۔

یونیورسٹی بل میں جو اہم مقاصد بیان کئے گئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یہ یونیورسٹی مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے موسوم ہوگی۔ پہلی مرتبہ مولانا آزاد کی خدمات کا اعتراف اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔

۲۔ یہ یونیورسٹی حیدرآباد میں قائم ہوگی شاید حیدرآباد سے بہتر کوئی اور مقام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے تاریخی کردار، ملک میں پہلی اردو میڈیم یونیورسٹی تالیف و ترجمہ کا ورثہ، اور اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے باقیات الصالحات ابھی شہر حیدرآباد میں موجود ہیں۔ تہذیبی اور جذباتی لحاظ سے بھی شہر حیدرآباد کو حق تھا کہ اس جامعہ کو اس کی گود میں پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔

۳۔ روایتی مضامین کے علاوہ فنی حرفتی اور صنعتی تعلیم

VOCATIONAL AND TECHNICAL EDUCATION

اردو میڈیم سے دی جائے گی۔

۴۔ فاصلاتی تعلیم کا یہ مرکز ہوگا۔

۵۔ خواتین کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے گی۔ یہ جو عام خیال ہے کہ اس یونیورسٹی کے تحت میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور زرعی کالجس وغیرہ بھی کھولے جائیں گے ان باتوں کا تذکرہ منظورہ بل میں کہیں نہیں ہے۔ ممکن ہے آئندہ چند برسوں بعد اردو یونیورسٹی مظبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گی۔ تو ان کالجوں کے شروع کرنے کا امکان

ہے۔ فی الحال اعلیٰ پیشہ ورانہ کالجس کھولنے کا خیال مختلف وجوہات کی بناء پر بعید از قیاس ہے۔

پروفیسر جعفر نظام کا ایک مضمون "سیاست" میں جامعہ عثمانیہ کی یادوں سے متعلق شائع ہوا تھا۔ پھر اس کا سلسلہ چل پڑا۔ بڑے اچھے مضامین کی وجہ اس زمانے کے علمی ماحول کی یاد تازہ ہو گئی۔ لیکن یہ سب اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ بہت کم حضرات نے موجودہ حالات میں اردو کی کسمپرسی کے ماحول میں اس اردو یونیورسٹی کو کس طرح مظبوط بنیادوں پر قائم کرنا ضروری ہے۔ کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی ہے حالانکہ یہ معرکہ سر کرنے کا کام بالکل سامنے ہے۔ بلکہ اردو والوں کے لئے ایک بڑے چیلنج کا سامنا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے کام کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ہے اور پھر تلگو یونیورسٹی کے تجربات سے بھی فایدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

حال ہی میں (۶/ مارچ ۹۷ء) آندھرا بھون نئی دہلی میں جشن اردو منایا گیا اس میں آنریبل سنٹرل منسٹر جناب سی ایم ابراہیم کا یہ اعلان کہ چار مہینوں میں اردو یونیورسٹی میں نئے تعلیمی سال ۹۸-۱۹۹۷ء پڑھائی کا آغاز ہو جائے گا باعث حیرت ہے۔ ایسی جلد بازی میں اردو یونیورسٹی کا کام بہت سی مشکلات میں پھنس جائے گا۔ اور تنقیدوں کا شکار ہو جائے گا۔ بغیر ابتدائی مراحل کی یکسوئی کے اس کی مثال اندھیرے میں چھلانگ لگانے کی ہو جائی گی۔ ان ہی ابتدائی مراحل کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

ابتدائی مراحل کے چند اہم کام

۱۔ باضابطہ تعلیم کا انتظام دو چار مہینوں کے بعد نہیں آئندہ تعلیمی سال ۹۹-۱۹۹۸ء سے شروع کیا جائے اور اس ایک سال کے دوران ضروری انتظامات کر لئے جائیں۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رجسٹرار اور دوسرے عہدے داروں کا تقرر پہلے ہونا

ضروری ہے ۔ اردو کی عام مایوس کن فضا کو خوشگوار ماحول میں تبدیل کرنے کا کام وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ عوامی تائید ۔ جوش اور دلچسپی پر مبنی ہے جس کے لئے وائس چانسلر نہ صرف قابل صحت مند ہو بلکہ اس کی شخصیت متحرک ہو اور جو جرات آمیز اقدامات کی صلاحیت رکھتا ہو ۔

۲ ۔ پرفیسر آل احمد سرور کی تجویز کے مطابق آل انڈیا سمینار پندرہ بیس دن کا منعقد کیا جائے ۔ جس میں سارے ملک کے قابل پرفیسر ، دانشور اور ماہرین تعلیم حصہ لیں اور کام کی نوعیت اور اہمیت سارے ملک کے لحاظ سے ایک باضابطہ ایجنڈا تیار کیا جائے ۔ تاکہ بعد میں کوئی پریشان کن حالات پیدا نہ ہوں ۔

۳ ۔ اصل پریشانی تین باتوں کی ہے ۔ اردو کا طالب علم یونیورسٹی سطح کا کہاں ملے گا ۔ اور ان کی کتنی تعداد اس یونیورسٹی میں داخلہ لے گی ۔ اردو کی کتاب کہاں ہے ۔ پرائمری ، سکنڈری سطح کی نصابی کتابوں کا توقط ہے ۔ ڈگری سطح کی کتابیں مختلف مضامین کی کہاں سے ملیں گی ۔ ریاضی ، فزکس ، باٹنی ، بیالوجی ، اکنامکس ، کامرس اور اسی قسم کے مضامین کی ایک دو کتابیں بلکہ ایک ایک درجن کتابوں کی ضرورت ہوگی ۔ ان کی تیاری کیسے کی جائے گی ۔ تیسرا اہم عنصر خود اردو میڈیم سے پڑھانے والے اساتذہ کی ضرورت ہوگی ۔ اردو زبان کے ایم ۔ اے کامیاب اساتذہ کا املا تک ٹھیک نہیں ہے ۔ جس میں انھوں نے اس اعلیٰ ڈگری کو مشہور یونیورسٹی سے حاصل کیا ہے ۔ وہ کسی ایک شعر کا مطلب نہیں بتا سکتے ۔ یہ براحال سارے ہندوستان کے اردو میڈیم اسکولوں کا ہے ۔ اور اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے ۔

TRANSLATION DEPARTMENT

۴ ۔ دارالترجمہ کا قیام فی الفور ضروری ہے ، جس میں جامعہ کی سطح کے کورسس کے

لئے ضروری کتب اور مواد کا ذخیرہ تیار ہوسکے۔ یونیورسٹی کے سطح کے مضامین کے ہر مضمون میں چھ سات کتابیں اردو زبان میں تیار ہوجائیں تو آئندہ تعلیمی سال سے پڑھائی شروع کی جاسکتی ہے۔ اگر سارے ہندوستان کے ماہرین فنون ایک جا جمع نہ بھی ہوسکتے ہیں تو اس دارالترجمہ کے REGIONAL CENTRES قائم کئے جائیں اور پہلے سال کے دوران میں اس طرح کتابوں کا ترجمہ، تالیف، تصنیف اور طباعت کا انتظام کرلیا جائے۔ تو یونیورسٹی کا کام اعتماد سے شروع کیا جاسکتا ہے ظاہر ہے اس کام کے لئے ایک بڑی ٹیم کی ضرورت ہوگی۔

فاصلاتی تعلیم DISTANCE EDUCATION

تالیف و ترجمہ کا کام ایک برس اور بعد بھی چلتا رہے گا۔ لیکن اس تعلیم سال سے ۹۸ ۔ ۱۹۹۷ء میں ایک محدود پیمانے پر فاصلاتی تعلیم کا کام شروع کیا جاسکتا ہے۔ اس سے مختلف مضامین کا اردو زبان میں نصابی لٹریچر تیار ہوگا۔ یہ لٹریچر بھی بہت کچھ کام آئے گا۔ دہلی اور حیدرآباد میں جو OPEN UNIVERSITIES کام کر رہے ہیں ان کے تجربات اور طریقہ کار سے بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اردو میڈیم ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کو ADOPT کرے۔ وہاں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لئے مالی امداد کے علاوہ ضروری انتظامات کرے۔ اس طرح اردو یونیورسٹی کا ایک زندہ رشتہ ساری ریاستوں اور اضلاع سے قائم ہوجائے گا۔ جو یونیورسٹی کے لئے حیات بخش ثابت ہوگا۔ ابتدائی چند برسوں میں یونیورسٹی کی جانب سے اردو کے پودوں اور جڑوں کی آب یاری ضروری ہے۔

اردو میڈیم ٹریننگ کالج برائے اساتذہ

یونیورسٹی باضابطہ آئندہ سال سے تعلیم شروع کرنے سے پہلے اردو میڈیم ٹریننگ کالج

قائم کرے تاکہ یونیورسٹی کے منتخب اساتذہ کے علاوہ مختلف ریاستوں کے اردو میڈیم کے ثانوی اور انٹر میڈیٹ ٹیچرس بھی یہاں پر ٹریننگ حاصل کر سکیں۔ اس ماحول سے اردو میڈیم سے تدریس، بحث و مباحثہ کے ذریعہ اردو میں اصطلاحات اور اظہار خیال کو بہت تقویت ملے گی۔

انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اسپیشل کوچنگ

۹۔ جن طلبہ کا ذریعہ تعلیم مقامی زبان یا مادری زبان رہا ہو ان کا انگریزی زبان کا معیار بہت کم رہ جاتا ہے۔ یہ ایک لازمی بات ہے لیکن سارے ملک میں انگریزی زبان کی اہمیت ساری دنیا میں اس وجہ سے ہے کہ اعلیٰ پیشہ وارنہ کورسس کی ساری تعلیم انگریزی زبان ہی میں ممکن ہے۔ انگریزی سے ترجمہ ان اعلیٰ پیشہ ورانہ کورسس کو مقامی زبان میں کرنا ناممکنات سے ہے۔ ایک کتاب کا ترجمہ کرنے تک درجنوں نئی کتابیں انگریزی زبان میں آجاتی ہیں۔ انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے سوائے ہمارے طلبہ اور اساتذہ کے لئے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ عام طور پر ہمارے طلبہ اور ٹیچرس کا انگریزی زبان میں معیار افسوسناک حد تک پست ہے۔ اردو یونیورسٹی میں جو لائبریری ہوگی ان میں ایک ہزار انگریزی کتابوں کے ساتھ ایک آدھ کتاب اردو کی ہوگی۔ اصل علم کا خزانہ تو آج بھی انگریزی زبان میں ہے۔ اس لئے ہمارے طلبہ ٹیچرس کے لئے انگریزی زبان میں بات چیت اور صحیح انگریزی لکھنے اور بولنے کی مشق کے لئے ایسے ایک ادارہ کی ضرورت روز اول ہی سے رہے گی تاکہ طلبہ لائبریری کتب سے اور انگریزی میگزین کے لٹریچر سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاسکیں۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک طلبہ کا انگریزی کا معیار اونچا نہیں کیا جائے گا اردو یونیورسٹی کا قیام ادھورا رہ جائے گا۔ کسی حال اردو یونیورسٹی اپنے

ایک پیر پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔اردو یونیورسٹی کی قدر و منزلت اس وقت بڑھے گی جبکہ یہاں کے طلبہ کا انگریزی کا معیار واجبی حد تک ٹھیک ہوگا۔

یہ چند عملی تجاویز قارئین کے غور و فکر کے لئے پیش ہیں۔اہل دانش و بینش سے توقع ہے کہ وہ اس خاکہ میں رنگ بھریں گے کیونکہ یہ وقت کی عین پکار ہے۔

ابراھم لنکن کا ایک خط ٹیچر کے نام

ABRAHAM LINCON,S LETTER TO HIS SON,S TEACHER

صدر امریکہ ابراھم لنکن اپنے فرزند کے ٹیچر کے نام جو خط لکھا تھا وہ اس قابل ہے کہ اردو داں طبقہ اس سے مستفید ہو۔ اس خط کے اصل انگریزی متن کے ساتھ اس کا آزاد ترجمہ پیش ہے۔ اس خط میں چند باتیں قابل غور ہیں۔ ابراھم لنکن باوجود صدر امریکہ ہوتے ہوئے بھی، اپنے لڑکے کے ٹیچر کے نام شخصی خط لکھنا ضروری خیال کیا۔ اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ٹیچر کی کیا کچھ عظمت تھی اس کا کچھ اندازہ اس خط سے ہو جائے گا۔ وہ اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں کرتا کہ وہ آئندہ کیا بنے گا۔ اس کو سیاسی لیڈر، ڈاکٹر، انجنیر اڈمنسٹریٹر، یا صنعت کار وغیرہ ایسا کچھ بنانے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا، لیکن وہ اپنے بچے کو بے لاگ حق پرست، بے خوف، آزاد خیال اور ایک متوازن شخصیت کا مالک بنانا چاہتا تھا تاکہ وہ خود اس وسیع حقائق کی دنیا میں زندگی سے نبرد آزما ہو اور اپنا مقام آپ پیدا کرسکے تعلیم کے دوران وہ جس شخصیت کی تعمیر کا آرزو مند تھا، اس کے آدرش تعلیم کی دنیا میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خط اس قابل ہے کہ ماں باپ ٹیچرس، دانشوران قوم اور تعلیمی اداروں کے سربراہان ان اعلیٰ مقاصد پر دھیان دیں کہ ہم کس طرح ان سب خوبیوں سے بچوں کی شخصیت کی تعمیر کے مقصد کو اپنے تعلیمی پروگرام کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

He will have to learn, I know میں جانتا ہوں کہ اسے کچھ سیکھنا ہے

That all men are not just سب لوگ انصاف پسند نہیں ہوتے

All men are not true سب لوگ سچے نہیں ہوتے

But teach him also that لیکن اس کو یہ سبق بھی دو کہ

For every scoundrel there is a law ہر بدمعاش کے لئے ایک قانون ہے

That for every selfish politician ہر خود غرض سیاست داں کے لئے

There is a dedicated leader کوئی بے غرض مخلص لیڈر بھی ہوتا ہے

اس کو بتاؤ کہ ہر دشمن کے لئے کوئی دوست بھی ہوتا ہے

Teach him that for every enemy there is a friend.

It will take time میں جانتا ہوں کہ اس کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا

But teach him if you can اگر ممکن ہو تو اس کو بتاؤ کہ

That a dollar earned is of fair ایمانداری سے حاصل کیا ہوا ایک ڈالر

More value than five found بغیر محنت کے حاصل ہونے والے پانچ ڈالر سے زیادہ قیمتی ہے

Teach him to learn not to lose اس کو سکھاؤ کہ وہ کہیں ہار نہ جائے

And also enjoy losing اگر وہ کبھی ہار بھی جائے تو ہارنے کی لذت سے محظوظ ہو

Skin him from enemy if you can اگر ہو سکے تو اس کو دشمنوں سے بچاؤ

Teach him if you can اس کو سکھاؤ اگر تم سے ہو سکے

The wonder of books کتابوں کاجادو کیا ہوتا ہے

But give him quiet time to لیکن اسے تنہائی کی گھڑیاں بھی دو
ponder

The Eternat Mystery of تاکہ وہ آسمانوں میں اڑتے پرندوں کادوامی راز پاسکے
the birds in the sky

اور شہد کی مکھیوں کو پہاڑوں کے دامن میں پھولوں کے جھنڈ پر منڈلاتے دیکھ سکے

Bees in the sun of flowers at great hill - side.

اسکول میں یہ سکھلاؤ کہ ناکام ہو جانا زیادہ باوقار طریقہ ہے بہ نسبت نقل کر کے کامیاب ہو جائے

In school teach him. It is more honourable to fail than to cheat

Teach him to have اس کو سکھاؤ کہ وہ کسی مسئلہ میں اپنی ذاتی رائے قائم کرے
his own ideas

even if one tells him they چاہے کوئی اس خیال کو غلط ہی نہ کہدے
are wrong

Teach him to - اس کو سکھاؤ کہ وہ شریف لوگوں کے ساتھ شرافت سے پیش آئے
be gentle with gently people

and tough with tough: اور بدمعاشوں کے ساتھ سختی سے

میرے لڑکے کو یہ طاقت دینے کی کوشش کیجیئے کہ وہ ہجوم کی پیروی نہ کرے

Try to give my son the strenght not to follow the crowd

جب ہر ایک، ایک خاص گروہ کی رائے سے متفق ہو گیا ہو، اس کو بتاؤ کہ وہ

When every one is getting in the band - wagon

Teach him to Listen all men, but سب کی سنے اور ان کی رائے

Teach him also to filter all سچائی کے پردہ پر چھان لے وہی اچھی بات
he hears

قبول کرے جو اس طرح چھن کر سامنے آتی ہو

On a screen of truth and take only the good that comes trhough

Teach him if you can to — ممکن ہو تو اس کو بتاؤ کہ رنج و غم میں

luagh when he is sad — بھی کسی طرح ہنس سکتے ہیں

Teach him there is no — اور یہ بھی کہ آنکھوں میں آنسو بھر آنا کوئی

shame in tears — شرم کی بات نہیں

Teach him to scoff at — اس کو سکھاؤ کہ کس طرح دنیا بیزار

cynic and to beware — لوگوں کی باتوں کو مذاق میں ٹالا جا سکتا ہے

Teach him to sell his — ہاں خبردار وہ اپنی جسمانی اور ذہنی

brawn and brain to the — توانائیاں اس شخص کے حوالے کر دے جو

highest bidders — سب سے زیادہ دام لگائے

But never to put a tag — حاشا! کبھی دل و روح (محبت اور خدمت)

on his heart and soul — کی کوئی قیمت مقرر نہ کرے

Teach him to close his وہ شور شرابے والے ہجوم کی آواز پر کان نہ دھرے
ears to howling mob

And to stand and fight if — اگر وہ کسی بات کو حق جانتا ہو تو اس کے

he thinks he is right — لئے لڑنے مرنے کے لئے کھڑا ہو جائے

Teach him gently but not ان کو نرمی سے سکھاؤ لیکن کہیں لاڈ و پیار
cuddle him — میں بگاڑ نہ دینا

Because only the test of کیوں آگ میں تپنے کے بعد ہی لوہا

fire makes fine steel۔ خالص فولاد بنتا ہے۔

Let him have the courage اس میں یہ جرأت پیدا کرو کہ وہ حق کے

to be impatient. لئے بے چین ہو جائے

Let him have the patience اور اس میں وہ تحمل پیدا کرو کہ وہ جری

to be brave. بن سکے

Teach him always to اس کو سکھلاؤ کہ ہمیشہ وہ اپنے اندر اعلیٰ

to have sublime faith in himself! ترین ایمان پیدا کرے تاکہ

Because then he will وہ بنی نوع انسانی میں اعلیٰ ترین اعتقاد

have sublime faith in mankind پیدا کر سکے۔

This is a big order, but بے شک، یہ باتیں بہت بڑی ہیں:

see what you can do

He is such a fine fellow my!! لیکن دیکھئیے، آپ میرے ہونہار لڑکے

son.

دینی درسگاہوں میں عصری تعلیم کا امتزاج

ریاست کرناٹک میں بیدر ایک تاریخی مقام اور ایک اہم ضلع ہے۔ چند برس پہلے یہاں ایک تعلیمی پروگرام کے سلسلہ میں جانا ہوا۔ بیدر میں مدرسہ محمود گاواں کے کھنڈر کے قریب ہی ایک دینی تعلیم کا مرکز ہے جہاں پر طلبہ و طالبات تین سو سے زائد ہیں اور اس مدرسہ کو شروع ہوئے تین برس ہو چکے تھے۔ طلبہ تیسری جماعت تک پہنچ چکے تھے۔ (۹) اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ ان ہی اساتذہ سے اصل گفتگو نی تھی۔ میں نے اس اسکول کا نصاب دریافت کیا تو صدر مدرسہ نے ٹائم ٹیبل منے رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں تفسیر قرآن، حدیث شریف کے ساتھ ساتھ کلاسیکل عربی ادب، صرف و نحو، منطق، فقہ، فلسفہ اور علم الکلام وغیرہ شامل ہیں۔ ان اساتذہ سے دریافت کیا کہ آخر یہ تیسری جماعت کے بچے کس طرح صرف و نحو، فلسفہ اور منطق، علم الکلام کو سمجھ پائیں گے جامعہ عثمانیہ میں منطق صرف بی۔ اے کے درجہ میں مضمون اختیاری تھا۔ خود ان میں اکثر تو وظیفہ یاب مدرسین تھے جنہوں نے کسی دینی مدرسہ میں کبھی تعلیم نہیں پائی تھی۔ جواب میں بتایا گیا کہ یہ نصاب اور نظام الاوقات حیدرآباد کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم سے حاصل کیا گیا ہے۔ اسی سے نقل کر لیا گیا۔ اگر حیدرآباد کی بڑی درسگاہیں اپنے ہاں ترمیم کر لیں تو پھر ہم بھی اپنا نصاب بدل سکتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کا حیرت انگیز انکشاف راقم کو پہلی مرتبہ ہوا تھا اس لئے وہ اپنے کو اس پر کسی قسم کے تبصرہ کا اہل نہیں پاتا۔

ایک دوسرا تجربہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی ایک بڑی دینی درسگاہ دیکھنے کا اتفاق

ہوا جہاں چھ سو طلباء تعلیم پاتے ہیں اور نصف دارالاقامہ میں مقیم ہیں ۔ کوئی ڈیڑھ سو طلبہ حفظ میں مشغول ہیں ۔ میرے ایک دوست نے ایک ۱۴ سالہ لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہاں تک حفظ کر چکے ہیں اس کے بعد ایک سوال کیا کہ آپ کے ہاں ۳۲ آم ہیں اپنے ۴ دوستوں میں آپ نے مساوی تقسیم کر دیئے ۔ بتلایئے کہ ہر ایک کو کتنے آم ملے وہ طالب علم اس کا جواب نہیں دے سکا اور صورت دیکھتا رہ گیا۔

اس تمہیدی نوٹ کے بعد اصل عنوان کی طرف آئیے کہ یہ دین و دنیا کے علوم میں بھید بھاؤ کیسے پیدا ہوا اور اب ہم کیا کر سکتے ہیں ۔ عنوان بہت وسیع ہے لیکن یہاں مختصراً چند اہم نکات آپ کی غور و فکر کے لیئے پیش ہیں ۔

(۱) پروفیسر مجیب نے لکھا ہیکہ سولھویں صدی کا یورپ میں نشاۃ ثانیہ اسپین کے عربوں کا رہین منت ہے لیکن یورپ کے ماہرین عمرانیات کا خیال ہے کہ بے شک مسلمانوں نے یورپ میں تعلیم و تحقیق، علوم و فنون کی روشنی پھیلائی لیکن ان کا حال ان مزدوروں کا سا ہے جو علم کا بوجھ سروں پر اٹھالائے اور یورپ کی منڈیوں میں اتار کر دور جا بیٹھے ۔ گذشتہ پانچ سو برس کے دوران پھر ان کے علمی اور سائنسی کارناموں کا کہیں تذکرہ تک نہیں ملتا۔

(۲) پروفیسر معاشیات، جناب جبیب الرحمن نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں انگلستان کے صنعتی انقلاب (۱۷۶۰ء) تک دینی اور دنیاوی تعلیم کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ جو کچھ علم تھا وہ دین کا تھا ۔ باقی روزی روزگار کیلئے، زراعت، تجارت محنت مزدوری اور معمولی پیشے تھے ۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے ایک سو برس کے دوران جدید ایجادات صنعت و حرفت، مشینوں کے استعمال نے مادی علوم میں سینکڑوں شعبوں کو جنم دیا ۔ اور پھر علم کی سینکڑوں شاخیں ہو گئیں ۔

اگر کوئی جدید میڈیکل سائینس پر غور کرے تو اندازہ ہوگا کہ ہر مرض ، ہر عضو کے سینکڑوں ماہرین یا SPECIALISTS پیدا ہو چکے ہیں پھر ان کا ایک ہاسپٹل چلانے کے لئے نیچے بڑی ٹیم کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس طرح دینی علوم اور مادی علوم ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے ۔ مادی علوم کے لئے کسی ایک فن میں مہارت لازمی ہو گئی جب کہ دینی علوم کے چند شعبے رہ گئے ہیں جن کا اجراس دنیا میں نہیں ۔ اس لئے مذہبی علوم کی عوام کے ذہن میں وہ اہمیت نہیں رہی جو مادی علوم کے حصول کے ساتھ ہی جاہ و حشمت ، دولت و عزت حاصل ہوتی ہے ۔ آج وہ نسل جو دینی درسگاہوں میں تعلیم پا رہی ہے ۔ وہ دنیاوی علوم کی کشش سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اور وہ طلبہ جو جدید علوم کے حصول میں لگے ہوئے ہیں وہ مذہب سے بہت دور ہو چکے ہیں ۔ ان کا تعلق اگر کچھ ہے تو بس اتنا سا ۔

کل کہتے تھے یہ بھائی گھورن
دنیا ہے روٹی مذہب ہے چورن

(اکبر)

کوئی ساٹھ ستر برس پہلے آپ کو یاد ہوگا کہ آلہ مکبر الصوت (MIKE) کا استعمال جلسوں میں نیا نیا ہوا تھا ۔ مسجد میں اذاں اور خطبہ کیلئے اس آلہ کے استعمال کے خلاف میں علمائے دین نے فتوے دئے کہ " اس نجس آلہ کو مسجد ہی میں نہ لایا جائے " پروفیسر غلام دستگیر رشید (عثمانیہ) اپنی تقاریر میں کہتے تھے ہمارے علمائے دین کے جمود کا کیا کہنا کہ دس برس تک وہ اسی بے کار سی بحث میں پھنسے رہے جب کہ اس عرصہ میں روس دو پنجسالہ منصوبے پورا کر لیا ۔ وہ علمائے کرام اور ان کے شاگرد کہاں ہیں جبکہ مائیک کا استعمال بے دھڑک نہ صرف مساجد میں ہوتا ہے بلکہ مکہ

اور مدینہ میں دن رات ہو رہا ہے۔ میرا ایک مضمون "سرسید کا کام اور پیام" ایک عالم دین کی نظروں سے گزرا جن سے مجھے ایک عرصہ سے نیاز حاصل ہے وہ پیراگراف آپ بھی پڑھ لیں اس لئے کہ اسی ایک پیراگراف پر قریب دو ماہ خط و کتابت کا سلسلہ رہا جاری رہا، جو پندرہ بیس صفحات پر مشتمل ہے۔

"مسلمان فطرتاً ہر نئی چیز کو سمجھنے اور اسے قبول کرنے کے معاملہ میں متشکی واقع ہوئے ہیں۔ وہ نوشتہ دیوار پڑھنے کے لئے برسوں لگا دیتے ہیں۔ جب جاگتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دوسری قومیں بہت آگے نکل چکی ہیں۔ اس قسم کا فکری ڈھانچہ کوی برسہا برس میں تیار ہوا ہے جبکہ مذہبی علماء نے دنیوی اور مادی علوم، معاش، کسب ایجادات وغیرہ کا کچھ اس طرز سے مضحکہ اڑایا کہ امت مسلمہ کا ذہن اس طرف سے مفلوج ہو گیا" (سرسید)

مسلمانوں میں جہاں تک علم و عمل کا تعلق ہے، قناعت پسندی کا رجحان عام ہے وہ جو تحقیق و تجربہ یا کسی علم میں کمال پیدا کرنے میں سنگ راہ ہے۔" (سرسید) (میری کتاب "تعلیمی مسائل") (صفحہ ۶۰، ۶۱)

اس پیراگراف پر اعتراض کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

علم الہٰی کہ مقابلہ میں طبعی علم بہ اعتبار آخرت مطلق اور کذب محض ہے۔ جس رونق دنیا کی طرف نظر اٹھانے کی اجازت نہو اس کی تحقیق و تخلیق کی محنت اور مسابقت کا تصور کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ آخر میں عرض کروں کہ سائنس اور سائنس دانوں کو حق تعالیٰ نے مؤمنین کا خادم بنایا ہے کہ ان کی مادّی محنت اور مسابقت کے

ثمرات سے بقدر ضرورت استفادہ ہو رہا ہے اور انشاء اللہ ہوتا رہے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤمنین خود کچھ نہیں کریں گے ۔ دنیوی و مادی ضرورتوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ دوسروں کے محتاج ہی رہیں گے ۔ بہرحال دین و دنیا الگ الگ دریا ہیں جو کہیں ملتے نہیں ۔ مرج البحرین یلتقیان بینهما برزخ لا یبغیان ۔ اوپر کے خط کا مطلب یہہ ہے کہ علم سے مراد علم الٰہی ہے باقی سب جہل ہے ۔ اس لئے اس کے حصول پر کسی قسم کی رغبت و محنت عبث ہے ۔

قرآن کریم میں وعلم آدم الاسماء کلها سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کو دنیا و مافیہا، زمین و آسمان کے سارے علوم سے روشناس کروایا گیا ۔ اسماء میں وہ ساری اشیائے کائنات کا علم، آثار اور خواص سب کچھ آگئے ۔ (تفسیر ماجدی) اس کا مطلب یہہ ہے کہ تمام سائنسی علوم، ایجادات و انکشافات سب کچھ علم کے دائرہ میں شامل ہیں اسی لئے انسان کو علم الانسان مالم یعلم، ہر وہ علم سکھلا دیا گیا جو وہ نہ جانتا تھا ۔ ہر ایجاد، ہر جدید تحقیق اور وہ سب انکشافات جو زمین و آسمان کے نیچے یا اوپر قیامت تک ہوتے رہیں گے وہ سب آیت کے اس ایک ٹکڑے نے احاطہ کرلیئے ہیں ۔ اس سے صاف ظاہر ہے علم میں دین و دنیا کا سب علم شامل ہے ۔ دین و دنیا کے علوم کو الگ الگ کرنا قرآنی علم کی روح کے خلاف ہے ۔

قرآن کریم اور احادیث میں بے شک دنیا کو حقیر جاننے اور اس کی چند روزہ زندگی میں گم ہوجانے کے خلاف آیات اور احادیث مل جائیں گی ۔ لیکن مادّی علوم سے پوری طرح کنارہ کشی کرلینے، مادّی علوم کے سیکھنے، حلال کسب اور معاش کی جستجو کے خلاف شائد کوئی چیز نہیں ملے گی ۔ اس دنیا میں بے حیثیت زندگی گذارنے دوسروں کے رحم و کرم پر قناعت کی زندگی گذارنے کے لئے جو ملّت تیار ہوجائے وہ

کس طرح خلیفۃ اللہ کہلانے کی مستحق ہوگی۔اس کے سر پر زمین کی خلافت کا تاج کیسے زیب دے گا۔

حضور اکرمؐ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے کہا کہ اپنے میں قوت پیدا کرو۔ پھر اس کا مطلب یوں سمجھایا کہ شمشیر زنی اور شہسواری میں کمال پیدا کرو۔وہ زمانہ تیر اندازی اور شمشیر زنی کا گذر گیا۔آج سائنس اور ٹکنالوجی میں کمال پیدا کرنا ہی قوت حاصل کرنا ہے۔ان علوم کا حصول دین کی بلندی اور خدمت کے جذبہ سے کئے جائیں تو یہہ بھی دین ہی ہے۔اسلام میں دولت، رزق عزت و حکومت اولاد اور زمین جائیداد اور مویشیوں کو انعامات الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔

گذشتہ دو چار برسوں سے علمائے کرام کی فکر میں کچھ تبدیلیاں آنے لگی ہیں۔ وہ دبی دبی زبان سے ہی سہی اب کہنے لگے ہیں کہ دینی درسگاہوں میں عصری علوم کا داخل کرنا ضروری ہوگیا ہے تاکہ وہ زمانہ کے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور ایک ایسے ملک کے شہری کی حیثیت سے زندگی گذار سکیں جہاں کئی مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ دین کے تبلیغی تقاضے نہ صرف اس خطہ کی بلکہ مختلف زبانوں کے ساتھ انگریزی زبان پر عبور نہ ہو تو آج وہ شخص گونگا معلوم ہونے لگا ہے۔اس کے باوجود علمائے دین نے ابھی تک اجتماعی طور پر کوئی جراءت مندانہ عملی اقدام نہیں اٹھایا ہے۔

جناب سید حامد لکھتے ہیں کہ

> "آج کل عصری تعلیم کی مانگ زور پکڑنے لگی ہے۔ میتھس، فزکس، کیمسٹری، انگریزی جیسے عصری علوم کی تعلیم دئے جانے کا مطالبہ بڑھ رہا ہے۔ بہار کے آعظم گڈھ ڈسٹرکٹ کے بلاریا گنج میں جمعیتہ الفلاح نے اپنے نصاب تعلیم میں زبردست انقلابی تبدیلیوں سے

روشناس کروایا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت دیر ہی سے سہی اور بہت محدود حد تک ہی سہی کہیں تو اس کا احساس ہوا۔ زمانہ کے تقاضوں اور وقت کے دباؤ سے علمائے کرام میں عصری علوم کی ضرورتوں کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔ لیکن ان دینی حلقوں میں بعض واجبی اندیشوں کا ذکر ضروری ہے۔

(۱) عصری علوم کے دینی درسگاہوں میں داخل ہوتے ہی دین کے قلعوں میں رخنے پڑجائیں گے پھر انھیں بند کرنا مشکل ہوجائے گا۔ آج تو یہہ حال ہے کہ ملک کی بعض مشہور دینی درسگاہوں میں اخبار بھی پڑھنا ممنوع ہے۔ عصری علوم کی مقناطیسی کشش سے طلبہ کو دور رکھنا نہایت دشوار ہوجائے گا۔ دینی علوم سے وہ دلچسپی باقی نہیں رہے گی جو آج تک باقی تھی۔

(۲) ریاضی، سائنس، انگریزی، ہندی، سوشیل سائنس کے ٹرینڈ اساتذہ کے مشاہرے لازماً دینی درسگاہوں کے اساتذہ سے بہت زیادہ ہوں گے۔ سرکاری مدارس میں کوئی بی۔ایس۔سی بی ایڈ ہے تو دس سال کے عرصہ میں اس کی تنخواہ آج کل ساٹھ ہزار تک پہنچ جائے گی۔ دینی درسگاہوں میں اساتذہ کہ مشاہرے بہت کم ہوتے ہیں اس طرح مالیہ کا سوال اہم ہے۔ اگر عصری علوم کے اساتذہ کو وہی مشاہرہ دینا پڑے جو کے سرکاری مدارس میں رائج ہیں تو ادارہ میں رشک و حسد کی فضا ابھر آئے گی اور ادارہ کا توازن بگڑ جائے گا۔ ایک ٹیچر جو دنیا کا علم پڑھاتا ہے وہ تو بہت خوش حال ہے اور دین کا پڑھانے والا اس کے مقابلہ میں بدحال رہ جائے یہہ گوارا نہیں ہوسکتا۔

(۳) ایک اہم مسئلہ دینی تعلیم کے نصاب کو کم کرنے کا ہے جیسا کہ اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں تذکرہ کردیا گیا ہے۔ کن علوم کو کن درجوں میں کس

حد تک نصاب سے کم کرنے کا سوال ماہرین کے لئے ایک مشکل کام ضرور ہو گا۔ اتنا تو علمائے دین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ درس نظامی جو قریب ایک ہزار سالہ قدیم ہے اس میں مناسب تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

(۴) اگر عصری تعلیم کو بہ جبر واکرہ دینی مدرسہ یا جامعہ میں داخل کیا جائے تو بعض انتظامی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ سب سے اہم سوال یہہ ہو گا کہ کتنا وقت، کتنے گھنٹے، کتنے پیریڈ دینی علوم کے ہوں گے اور کتنا وقت عصری مضامین کو دیا جائے گا کیا طلبہ بیک وقت دونوں علوم میں ایک معیاری سطح تک اتنے ہی عرصہ میں پہنچ سکیں گے۔

آخر اس کا حل کیا ہے۔

یہہ حل بھی حرف آخر نہیں یہاں پر اشارتاً چند تجاویز پیش ہیں جن پر سیر حاصل بحث اور غور وخوض ضروری ہے۔

سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ علم کی تفسیر میں جو شکوک و شبہات ہیں انھیں دور کر دیا جائے۔ علمائے دین اور تبلیغی جماعت کے امیر یکجا ہو کر اس بات پر غور کریں اور دو ٹوک اعلان کر دیں اور دنیا کا علم الگ الگ نہیں بلکہ علم میں سب کچھ آگیا ہے۔ البتہ دین کا بنیادی علم ہر لحاظ سے مقدم ہے جو ہر طالب علم کو چاہے وہ دینی مدرسہ میں پڑھاتا ہو یا عصری مدرسہ میں اس کے لئے لازمی ہو گا۔ اسلئے کہ یہہ ساری بحث بچوں کو دین اسلام پر قائم رکھنے کے لئے ہے۔ اگر کوئی ایمان و اسلام ہی سے دور ہو جائے چاہے وہ نام کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو، وہ ہماری بحث سے خارج ہے اس قسم کے اعلان سے مسلم معاشرہ میں اعتدال اور توازن پیدا ہو جائے گا وہ تذبذب اور نفسیاتی کشمکش دور ہو جائے گی جو آج کل عام ہے اس قسم کا ماحول خود

دین کی بلندی و سرفرازی کے لئے بھی ضروری ہے ۔

چند اہم امور مثلاً عصری علوم میں کونسے مضامین کو اہمیت دی جائے ، ان کی تدریس کے لئے کتنا وقت دیا جائے ، کتنا دینی نصاب کم کرنا ضروری ہوگا ، ہر مضمون کے کتنے پیریڈ ہوں گے ، عصری مضامین کس جماعت سے شروع کئے جائیں اور پانچ سات برس میں ان مضامین میں عبور کی سطح اور معیار کیا ہوگا ؟ امتحانات وغیرہ ایسے بہت سے مسائل ہیں ۔جو ایک ماہرین تعلیم کی کمیٹی طئے کر سکتی ہے ۔جس میں ناظم دینی درسگاہ اساتذہ اور عصری مضامین کے تجربہ کار ٹیچرس ، ماہرین تعلیم ، اور دانشور دونوں طرف کے شریک ہوکر ان تفصیلات پر غور کر سکتے ہیں ۔ اس طرح ایک سونچے سمجھے پروگرام یا منصوبہ کے تحت عصری مضامین کو داخل نصاب کئے جائیں تو مناسب ہے ۔ شرط یہہ ہے کہ ان علوم کو بے دلی سے شامل نہ کریں بلکہ پوری سنجیدگی اور خلوص سے ان مضامین کو جگہ دیں تو دینی درسگاہوں کی وقعت بڑھ جائے گی اور یہاں سے ایسے عالم نکلیں گے جن کا مرتبہ معاشرہ میں ہر طرح قابل احترام ہوگا ۔

اچھے ٹیچر کی تلاش میں

سارے نظام تعلیم میں کلاس روم میں پڑھانے کا کام سب سے زیادہ اہم ہے۔ معاشرہ اور ملک کے مفاد میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ بچوں کو اچھی تعلیم دیجائے تاکہ بچوں کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی نشو نما کے امکانات و ہیجانات کو پورا کرسکے۔ اس کی شخصیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ بچہ کی خوابیدہ صلاحیتیں ممکنہ حد تک ترقی کرجائیں۔جواس کی زندگی مین ترقی اور کامیابی کا باعث ہوسکیں۔ مختصر طور پریوں کہا جاسکتاہے کہ سارے تعلیمی نظام میں جو مسائل بنیادی اور مرکزی نوعیت کے ہیں وہ صرف دو ہیں۔ٹیچراور اس کے پڑھانے کی قابلیت، اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ یوں کہاجاسکتاہے۔

(۱) کس طرح قابل مرد اور خوتین کو اس پیشہ کی طرف راغب کیا جائے؟

(۲) طلبہ کو موثر تعلیم کس طرح دی جائے تاکہ بچوں کی نشو ونما، فطری تقاضوں اور کھوج و جستجو کو مہمیز کرسکے۔وسیع نقطہ نظر سے وہ ملک و قوم کی ضروریات کو پورا کرسکیں۔

جان ڈیوی (John Dewey.) کا کہنا ہے کہ تعلیمی میدان میں ساری اصلاحات صرف ایک شرط کی تابع ہیں۔وہ ان لوگوں کی قابلیت و صلاحیت پر موقوف ہیں جو پیشہ تدریس سے منسلک ہیں۔

یونیسکو(UNESCO) کے تحت ایک ٹیچرس ٹریننگ ورکشاپ کی رپورٹ میں اس بات کو ریکارڈ کیاگیاہے کہ "اساتذہ نہ کہ بچّہ تمام تعلیمی مسائل کا معمہ لاینحل

ہے۔شاید نصف درجن اسکیم کامیاب ہوجائیں اگر موزوں ٹیچرز کلاس رومس میں نوخیز نسل کی تعلیم کے ذمہ دار ہوجائیں۔

ہمارے ملک میں مدارس کھولنا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔پرائمری سے یونیورسٹی سطح تک اچھے ٹیچرز کا ملنا دشوار ہوگیا ہے۔دوسری طرف یہ مسئلہ بھی آسان نہیں کہ کس طرح ٹیچر بنایا جائے تاکہ اسے اپنے پیشہ سے انس ہو۔اس سلسلے میں کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کا یہ مشاہدہ نوٹ کرنے کے قابل ہے "اچھی سے اچھی تعلیمی اسکیمات ناکام ہوجائیں گی جنہیں ان اسکیموں کو روبہ عمل لانا ہے وہ اگر غیر تربیت یافتہ ہوں اور خود سے تیار نہ ہوں لیکن ایک ناقص اسکیم بھی کامیاب ہوجائے گی اگر ٹیچرز اچھے ہوں اور اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہوں۔"

جہاں کہیں کسی اسکول انتظامیہ سے سابقہ پڑتا ہے وہاں پر یہی ایک پریشان کن سوال ہے کہ اچھے تربیت یافتہ ٹیچرز نہیں ملتے۔کچھ تو اسکول کا فینانس اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ سب کو گورنمنٹ اسکیل دیں دراصل ٹیچرز کا مشاہرہ اس اسکول کے تعلیمی معیار کیلئے بارپیما کا کام دیتا ہے۔اگر ٹیچرز کی تنخواہیں ہزار بارہ سو کے اندر ہیں تو پھر اس گرانی کے زمانے میں جب تک گزر بسر کرلئے کوئی دوسری آمدنی کا ذریعہ نہ ہو، وہ دل لگا کر پڑھا نہیں سکتا۔گورنمنٹ پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے ٹیچروں کی تنخواہیں آج کل پانچ چھ ہزار روپیے ماہانہ ہیں۔اتنی اچھی تنخواہیں وہ اگر پاتے ہیں تو ضرور وہ بہترین مثالی ٹیچرز ہوں گے۔حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ان پر خاطر خواہ کوئی کنٹرول نہیں کرسکتا۔گورنمنٹ کی ملازمت میں بڑی عافیت اور سکون ہے کسی کی نااہلی ثابت بھی ہوجائے تو قوانین کچھ ایسے ہیں کہ ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔خانگی اسکولوں کو اپنا معیار باقی رکھنے کے لئے بہت سے اخراجات برداشت

کرنے پڑتے ہیں تاکہ معاشرہ میں ان کا وقار باقی رہے دوسرے یہ کہ کم تر مشاہرہ پر اچھے ٹیچرز عام بے روزگاری کی وجہ سے مل جاتے ہیں۔اس زمانہ میں لیڈی ٹیچرز کی بہتات بھی مشاہرہ پر اثرانداز ہوتی ہے۔خواتین کی کچھ مجبوریاں ہیں وہ کمتر مشاہرہ پر کام کرنے کے لئے راضی ہوجاتی ہیں بشرطیکہ اسکول مکان کے قریب ہو، اور وہ اپنی شادی کے انتظار میں ہوں۔لیکن خواتین ٹیچرز محنتی اور ذمہ دار پائی گئی ہیں۔عذرا پبلک اسکول کے سربراہ نے شکایت کی کہ ہمارا اسکول شادی خانہ بن گیا ہے۔اس تعلیمی سال کے دوران ۴۲ میں سے چھ ٹیچرز کی شادیاں ہوگئیں ان کے مسائل سے ہمدردی ضروری ہے۔کنڈرگارٹن سے ساتویں جماعت تک لیڈی ٹیچرز بہت کامیاب اور موثر ہوتی ہیں، سکنڈری اسٹیج اور کالج کی سطح پر مرد ٹیچرز کامیاب رہیں گے لیکن یہ کوئی آزمودہ فارمولہ نہیں ہے۔ان کی شکایت یہ ہے کہ جیسے ہی بات چیت طے ہوئی اب ان کا دل پڑھانے میں نہیں لگتا بلکہ جلد اڑنے کی فکر میں رہتی ہیں۔وہ اسکول کو ویٹنگ روم بنائے رکھتی ہیں۔اس مسئلہ کا آسان حل یہ ہے کہ ہمیشہ دس پندرہ منتخب ٹیچرز کا ہر مضمون میں ایک دو کے حساب سے پینل پہلے ہی سے تیار رکھ لیں۔ جب کبھی کسی ٹیچر کی جانب سے ایک ماہ قبل نوٹس ملے فوراً اس منتخب لسٹ سے اس مضمون کی ٹیچر کو ایک ہفتہ قبل ہی اسکول میں رجوع کریں تاکہ جانے والی ٹیچر نئی ٹیچر کو اسکول کے ماحول، طلبہ سے ملاقات، نصاب کی تکمیل، ہوم ورک وغیرہ سے واقف کرواسکے۔ایسی صورت میں کوئی خلاء باقی نہیں رہتا۔دس پندرہ دن بھی کوئی ٹیچر رخصت لے لے طلبہ کو بہت نقصان ہوتا ہے لیکن اکثر انتظامیہ مہینے دو مہینے کی غیر حاضری میں بھی کچھ نہیں کر پاتے۔

ٹیچرز کے انتخاب میں کسی سفارش اور دوسری باتوں کا لحاظ نہیں رکھنا چاہیئے۔

ایک ناقص ٹیچر ہو تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں طلبہ کا نقصان ہوتا ہے ایک اچھا ٹیچر ہو تو پوری ایک نسل اس کی ذات سے فیض یاب ہوتی ہے۔ٹیچر سے انٹرویو کے بعد انہیں کسی کلاس میں پڑھانے کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لینا نہایت مفید ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ایک سال میں ٹیچر کی قابلیت وصلاحیت کو جانچنے کا کافی موقع ملتا ہے۔ اگر کسی ٹیچر میں بہتر ٹیچر بننے کی صلاحیت اور توقع نہیں ہے تو سال کے ختم پر اس کی چھٹی کر دینا چاہئیے۔ خراب ٹیچر کو برداشت کرتے جانا دراصل بچوں کے ساتھ ظلم ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے خلاف ایک جرم ہے۔

بعض اسکولوں میں یہ خوش فہمی عام ہے کہ ٹرینڈ ٹیچر سے ان ٹرینڈ ہی بہتر ہوتے ہیں۔ انہیں تنخواہیں بھی کم دینی پڑتی ہیں۔ دراصل تربیت یافتہ ٹیچر کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ بعض اچھے ٹیچرز کو ان کے کام کو قریب سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہیں بھی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ سارے ملک میں سینکڑوں سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے سنٹرل اسکولس ہیں جن میں ایک بھی ان ٹرینڈ ٹیچر کا گذر نہیں۔ آندھرا پردیش ایجوکیشن کوڈ کے تحت یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ اسکولوں میں صرف تربیت یافتہ ٹیچرز کا تقرر کیا جائے۔ ٹرینڈ ٹیچرز کی عدم دستیابی اور ان کے مشاہرہ کی وجہ خانگی اسکولوں میں غیر تربیت یافتہ ٹیچرس کی بھرمار ہے۔

ایک اور خام خیال مثالی ٹیچر یا Born Teacher کا ہے جسے کوئی تربیت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک نایاب اور کمیاب شئے ہے جو شاید ہزاروں میں ایک مل جائے۔ ورنہ ہر محنتی ٹیچر کو مثالی ٹیچر سمجھنا غلطی ہے۔

اچھے ٹیچرز ہی کسی تعلیمی ادارے کی شان ہوتے ہیں۔ کرسچین مشنری اسکولوں میں اور بعض دوسرے اچھے اسکولوں میں گورنمنٹ کی مقررہ شرح سے

تنخواہیں دی جاتی ہیں ۔ان کے شرائط ملازمت بھی گورنمنٹ کے مقررہ اصولوں کے تحت ہوتے ہیں ۔یہاں انتظامیہ لماںداری سے کام لیتا ہے اور ٹیچرز بھی پوری تن دہی سے کام کرتے ہیں ان اسکولوں کی شہرت اور عظمت کا راز اچھے ٹیچرز اور ان کا کام ہے تعلیم کی دنیا میں ٹیچرز کی تنخواہوں کو انسانی وسائل کے فروغ کے لئے ساری دنیا میں اب بہترین سرمایہ کاری سمجھنے لگا ہے ۔ساری قوم کی ترقی کا راز مطمئن ٹیچر ہے ۔وہ ادارے خوش قسمت ہیں جہاں کے ٹیچر مطمئن اور پڑھانے کے کام میں ایسے مشغول ہوں کہ انہیں ادھر ادھر دیکھ نہ تو حسرت ہوتی ہو اور نہ اپنی آسودہ زندگی سے ہٹ کر انہیں ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت پڑتی ہو۔

" زوال یافتہ قوموں کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ
ان کے افراد میں حسد کا مادہ بے حد بڑھ جاتا ہے اور
وہ کسی کو کھاتا پیتا اور خوش یا ممتاز نہیں دیکھ سکتے
انھیں یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا کام کرکے
نام حاصل کرلے خواہ وہ کام انھیں کے فائدہ کا
کیوں نہ ہو "

۔سید حامد

الامین تحریک اور اس کے بانی

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

تقسیم ہند کا سانحہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اندوہناک باب ہے۔ آزادی کے کوئی پندرہ برس تک مسلمانوں کے ہوش و حواس گم رہے بلکہ ساری قوم پر ایک سکتہ طاری رہا۔ ۱۹۶۰ء تک ہمارے دانشوروں کو ایک بات سمجھ میں آگئی کہ ہماری ساری مصیبتوں، غربت و افلاس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے وہ مسلم قوم کو جہالت اور تعلیم سے دوری ہے۔

پھر چند درد مند کھڑے ہوئے، بعض منزل کی مشکلات دیکھ کر وہیں بیٹھ گئے اور کچھ اسی گھپ اندھیرے میں چل پڑے اور اسی تاریکی میں روشن راستے بنائے۔ ان میں ایک نام ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا بھی ہے جنھوں نے اپنا تعلیمی مشن ۱۹۶۳ء میں بنگلور سے شروع کیا جب کہ وہ ابھی ماسٹر آف سرجری کے طالب علم تھے اور عمر ۲۹ سال تھی۔

انھیں یہ خیال شدید طور پر ستانے لگا کہ مسلمانوں کا ایسا کوئی پلیٹ فارم نہیں جس کے ذریعہ وہ اپنا مستقبل سنوارنے کے منصوبے بنا سکیں۔ یہاں پر موصوف کی "الامین تحریک" سے متعلق مختصر طور پر تعارف کروانا مقصود ہے۔ تا کہ تعلیم، معاشی و معاشرتی اصلاح کے کام کرنے والوں کو اس میں بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ کسی طرح ایک آرٹس، سائنس اور کامرس کالج قائم ہوجائے۔اسی خیال کو لے کر شہر کی بہت سی اہم شخصیتوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔وہ لکھتے ہیں کہ "شہر میں چند اشخاص ضرور ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہر تعمیری کام کی مخالفت کرتے ہیں" چنانچہ میں نے اپنے کام کی شروعات بڑی خاموشی سے کرنے کی ٹھان لی۔جب کام خاموشی سے ہونے لگا تو وہ میرا کچھ بگاڑ نہ سکے۔وہ حضرات جو کام کرنے سے پہلے اپنے کام کی تشہیر کرتے ہیں وہ بلا وجہ اپنے مخالفین کی حسد کی آگ بھڑکا دیتے ہیں جو ان کے کام میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔۱۹۶۶ء میں جسٹس بشیر احمد سعید کی رہنمائی میں ساوتھ انڈیا ایجوکیشن ٹرسٹ "الامین" کے لئے اپنا لیا گیا۔اس کے مطابق یہ اصول رکھا گیا کہ پہلے دس سال تک کوئی انتخابات نہیں ہوں گے۔ان قوانین نے "الامین" کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ شرارتی عناصر کو بھی اس سے دور رکھا۔

کونسا کام پیسے کے بغیر چلا ہے محض جذبہ اور اخلاص کس کام کا ڈاکٹر صاحب کو پہلی مرتبہ چندہ اور عطیات جمع کرنے کی مشکلات کا تجربہ ہوا۔اگر وہ خود اپنا ذاتی سرمایہ نہ لگاتے۔اپنی اور اپنی بیگم صاحبہ کی جائدادیں فروخت کر کے وہ اس مشن کو دل و جان سے نہ چلائے ہوتے تو کبھی کے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہ جاتے ان کی پریشانیوں اور حیرانیوں کو دیکھ کر لوگ کہتے "میاں یہ تعلیمی کام عیسائی مشنری والوں کو ہی شوبھا دیتی ہے۔لیکن خدا کا بندہ جب مایوس ہوتا ہے تو پھر غیب سے اس کی مدد اور رہنمائی شروع ہوجاتی ہے۔کالج بہرحال چل رہا تھا۔کشمیر سے کسی نے الامین سوسائٹی کے نام ایک روپیہ چندہ منی آرڈر کیا۔ڈاکٹر صاحب اس بے غرض محسن کے ایثار سے بہت متاثر ہوئے۔تفریحی پروگرام اس آس میں منعقد کئے گئے کہ

ان سے کافی آمدنی ہو گی ۔ لیکن جتنا کچھ جمع ہوتا وہ پروگرام کے اخراجات کے لئے ہی برابر ہو جاتا ۔ ایک رات ایسا ہی ایک پروگرام چل رہا تھا اور اس سے کوئی خاطر خواہ آمدنی کی امید نہیں تھی ۔ میری بیٹی گود میں تھی اور زار وقطار میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ کالج میں اساتذہ کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات کے لئے میں نے بیوی کا باغیچہ اور اپنا ذاتی مکان فروخت کر دیا ۔ ۱۹۷۶ء تک یہ کالج سنبھل گیا جس میں دو ہزار طلباء تعلیم پانے لگے ۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ سوسائٹی کا ارتقاء میرے بغیر بھی ہو سکتا ہے تو فخر کے ساتھ میں نے نہ صرف سکریٹری کا عہدہ بلکہ مجلس انتظامیہ سے بھی دست بردار ہو گیا ۔ یہ کار خیر ایک دوسرے فرد کی کارکردگی میں دے دیا ۔ میرے استعفے سے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی ۔ میں نے اپنا اصول بنالیا ، جب کوئی ادارہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے تو وہاں سے ہٹ جاتا ہوں ۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے اس انقلابی فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ہی ادارہ کے بانی بن کر نہ رہے ۔ ان کے اس ایثار وجذبہ کا اثر یہ ہوا کہ کام کا موقع ملا ۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی ان کے کام میں نہ دخل دیا اور نہ رہنمائی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ " الامین " کے تحت کئی ادارے نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے لگے بلکہ ہر ادارہ اپنی جگہ اپنے کام کا ایک شاندار ریکارڈ رکھتا ہے ۔ ۱۹۶۹ء تک لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ممتاز احمد خاں بڑے کام کا آدمی ہے ۔ اب کیا تھا ہر طرف سے لوگوں کا تقاضہ شروع ہو گیا کہ یہاں پر ہائی اسکول قائم کر دیں یہاں گرلز اسکول کی ضرورت ہے ۔ ۱۹۸۶ء تک مختلف مقامات پر بارہ ہائی اسکول قائم ہو چکے تھے ۔ تعلیم کے ساتھ صحت کا بھی خیال آیا ۔ ۱۹۷۱ء " الامین میڈیکل ٹرسٹ ہسپتال " (بنگلور) قائم ہوا ۔ اس ٹرسٹ کے

صدر سرمرزا اسماعیل کے نامور فرزند ہمایوں مرزا ہوئے۔ اس کی شروعات سات افراد کے سات سو روپے سے ہوئی۔ ۱۹۹۰ء تک اس کا اثاثہ ایک کروڑ تک پہنچ گیا۔ ۱۹۹۲ء پروفیشنل کالجس چل پڑے۔ کالج آف فارمیسی، انجنیرنگ۔ کالج آف ایجوکیشن، لا کالج، ڈینٹل کالج وغیرہ ۱۹۸۴ء میں کرناٹک کے چیف منسٹر جناب ہیگڑے نے بیجاپور میں میڈیکل کالج کھولنے کی اجازت دے دی۔ اس کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن آج بیجاپور میں یہ میڈیکل کالج ۱۵۰ ایکر زمین کے رقبہ پر بہت سی عمارتوں میں شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ تعلیم اور صحت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت درست کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ ۱۹۷۷ء میں " الامین کوآپریٹیو بنک قائم کیا گیا۔ ۲۵ سال کے عرصہ میں اس کے ڈپازٹ کی رقم ۳ لاکھ سے ۵۰ کروڑ تک پہنچ گئی۔ بنگلور میں اس کی پانچ شاخیں کام کررہی ہیں۔ جب یہ ادارہ مظبوط بنیادوں پر قائم ہوگیا تو ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس سے استعفےٰ دیدیا۔ "یہ ادارے میرے لئے مسافرخانوں کی طرح ہیں"۔

اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ "یہاں پہنچ کر ایک بڑا سوال یہ تھا کہ عام طور پر ادارہ کے بانی لائف ممبر تو رہتے ہیں۔ برسوں کسی ادارہ کی ذمہ داری سنبھالنے اور اسے پروان چڑھانے کے بعد اپنے آپ کو پوری طرح الگ کرلینا کوئی آسان بات نہیں ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادارہ غیر ذمہ دار اور بددیانت لوگوں کے ہاتھوں میں آکر زوال پذیر ہوجاتا ہے پھر آپ اتنے بڑے بڑے ادارے کس طرح کس اعتماد پر چھوڑ بیٹھے؟" اس کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے کسی کی اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں، قابلیت وصلاحیت کی شہرت متاثر نہیں کرتیں۔ ان باتوں پر میں نے کبھی بھروسہ نہیں کیا ہے بلکہ ہمیشہ میں نے آدمی میں اخلاص اور کام کی لگن کو پرکھنے کی

کوشش کی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخلص اور دھن کے پکے لوگوں کی ایک ٹیم کار کرد ہو گئی ۔ مثال کے طور پر موصوف نے بتلایا کہ ہمنا آباد سے ایک وظیفہ یاب بس ڈرائیور میرے پاس بنگلور آئے اور مجھ سے کہا کہ ہماری بستی میں کوئی اسکول نہیں ہے ۔ پندرہ ہزار روپے میں ایک زمین فروخت ہو رہی ہے ۔ اگر یہ زمین خرید لی جائے تو پھر اسکول کی عمارت کا کام ہو سکتا ہے میں نے اپنی لڑکی کی شادی کیلئے چار ہزار روپے رکھے ہیں وہ آپ لے لیں ۔ میں اس ضعیف ڈرائیور کے خلوص سے بہت متاثر ہوا ۔ میں نے خود پندرہ ہزار روپے کا انتظام کر کے وہ زمین لے لی ۔ اس دوران ان کے پیر میں فریکچر ہو گیا ۔ پھر وہ کینسر میں مبتلا ہو گئے ۔ وہ کئی مرتبہ مجھ سے ملنے آئے اور خطوط کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن کسی وقت بھی اس خدا کے بندے نے اپنے مرض اور مجبوریوں کا اشارہ تک نہیں کیا ۔ ان صاحب کا انتقال ہو گیا لیکن آج ہمنا باد کا ہائی اسکول قوم کے بچوں سے بھرا ہوا ہے ۔ دیکھئے میں بنگلور میں بیٹھ کر وہ کام نہیں کر سکتا جو مقامی لوگ اپنے مقام پر کر سکتے ہیں ۔ مخلص لوگوں کو کام کا موقع مل جائے اور ان پر اعتماد کیا جائے تو وہ اداروں کو غیر معمولی ترقی دے سکتے ہیں ۔

" الامین مالیاتی سرمایہ کاری کارپوریشن " کی بنیاد بھی اسی طرح ڈالی گئی ۔ چھ سال کے عرصہ میں اس ادارہ کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ایک قلیل عرصہ میں اس کے ڈپازٹ کی رقم چھ کروڑ تک پہنچ گئی ۱۹۷۹ء میں اسلامی مالیاتی طریقہ کار پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا ۔ " الامین تحریک " کی شہرت بہت ہونے لگی ۔ اپنی بات اپنی زبان میں لوگوں تک پہنچانے کے لئے ایک اخبار " سالار " کا اجرا عمل میں آیا ۔ جو بنگلور کا مشہور روزنامہ ہے ، بمبئی میں " بیت الحجاج " کا قیام بھی مشکل حالات میں کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچا ، کھیل کود میں مسلم طلبہ کو آگے آنے

کے لئے " الامین کلب " قائم کیا۔ جو آج کل کھیل کے میدان میں ہمارے شہر میں مشہور ہے۔ ۱۹۶۸ء میں "الامین اسکالر شپ اسکیم" شروع کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت ہر سال تین ہزار طلبہ کو پندرہ لاکھ روپے کی خطیر رقم اسکالر شپ دی جاتی ہے یہ طلبا ہندوستان کے کونے کونے سے تعلق رکھتے ہیں "الامین تحریک" کرناٹک، ٹامل ناڈو، کیرالا، گجرات، اڑیسہ، بنگال، مہاراشٹرا، آندھراپردیش اور نہ معلوم کہاں تک پہنچ گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتلایا کہ آج کوئی ایک سو ادارے ہائی اسکول، کالجس، دواخانے پروفیشنل کالجس چل رہے ہیں۔ جن میں ۴۰ ہزار طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ ان میں اچھی خاصی تعداد غیر مسلم طلبا کی بھی ہے۔ ان تمام اداروں میں چار ہزار سے زیادہ افراد کو روزگار مل چکا ہے۔ یہاں پر میں نے ایک سوال یہ کیا کہ آپ کو ان اداروں کے قیام میں حکومت اور عہدہ داروں سے کوئی تعاون نہیں ملا ہوگا، بلکہ مشکلات پیدا کرادی گئی ہوں گی۔ اس کی تو آپ کو ضرور شکایت ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر حکومت اور عہدہ دار ہمارے ساتھ تعاون نہ کرتے تو اتنے سارے ادارے ہم کیسے قائم کر پاتے، ہر محکمہ نے ہماری مدد کی۔ اور ریزرو بینک آف انڈیا کا تعاون نہ ہوتا تو ہم بینک کیسے قائم کر سکتے تھے۔ جب صاحب اقتدار لوگوں کو ہماری دھن اور لگن کا پتہ چلا تو ہمیں بے اندازہ کوآپریشن ملا جس کے ہم مشکور ہیں۔

جنوبی ہند کے مسلمانوں میں تعلیمی شعور پیدا کرنے اور ان کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے صحت اور معاشی واقتصادی حالت درست کرنے کے لئے "الامین تحریک" نے جو کام کئے ہیں اس سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے بے شمار صلاحیتوں اور بے پناہ اخلاص کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کا نام جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ

ثانیہ سے جڑ گیا ہے، اگر کام کا جذبہ سچا ہو، اخلاص ہو اور اپنے مقصد سے کوئی عشق رکھتا ہو تو یہ جذبہ سیکڑوں چشموں کو جنم دیتا ہے جس کا فیضان وقت کے لامتناہی دھارے تک جاری رہتا ہے۔ حضور اکرم صلعم کا لقب "الامین" تھا اس نام کی برکت سے "الامین" کی ترقی قابل رشک ہے۔

اردو میڈیم کا مایہ ناز طالب علم

تنویر منیار

15 ستمبر 1997 ء کو گلبرگہ میں HUMAN AGE ASSOCIATION کی جانب سے ایک سیمینار " اردو میڈیم کے مسائل اور ان کا حل " رکھا گیا تھا ۔ یہہ سیمینار کیا تھا ایک شاندار جلسہ تھا ۔ جس میں اردو میڈیم اسکولوں کے ایک ہزار سے زائد ٹیچرس شریک تھے جن میں قریب سات سو برقعہ پوش خواتین ٹیچرز ضرور رہی ہوں گی جو مسلسل پانچ گھنٹوں تک بیٹھی رہیں ۔ اس سیمینار میں شرکت کی دعوت پر شولاپور کے ایک اردو میڈیم طالب علم تنویر منیار اور ان کے والد عثمان منیار بھی شریک تھے ۔ جو وہاں ایک پرائمری اردو میڈیم اسکول کے ٹیچر ہیں ۔ سال گذشتہ تنویر کی شہرت اخباروں کے ذریعہ سارے ملک میں پھیل گئی تھی اس لئے اس سے ملنے کی تمنا تھی ۔ جس ہیرے کی تلاش تھی وہ خود سامنے آگیا اس کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع مل گیا ۔ تنویر میار ابتداء ہی سے " سوشیل اردو ہائی اسکول " شولاپور (مہاراشٹرا) کے طالب علم رہے ہیں ۔ جنہوں نے 1997 ء میں میٹرک کے امتحان کے 14 لاکھ امیدواروں میں کامیاب امیدواروں کی فہرست میں پہلا مقام حاصل کیا ۔ جملہ 96.4 فی صد نشانات حاصل کر کے سب کو حیرت زدہ کر دیا ۔ نصف صدی کے دوران اردو میڈیم اسکولوں اور طلبہ کا جو حال سارے ملک میں ہو چکا ہے وہ سب پر عیاں ہے ۔ اردو میڈیم کے نام سے ہی پست معیار تعلیم کا داغ لگا ہوا ہے ۔ جس میں خود اردو یا طلبہ کا کوئی قصور نہیں بلکہ اس سارے عرصہ میں حکومتوں کی اردو دشمنی کی کھلی پالیسیاں اس صورت حال کی پوری طرح ذمہ دار ہیں ۔

اس مایوس کن گھٹاٹوپ اندھیرے میں کسی مسلمان اردو کے طالب علم کا لاکھوں امیدواروں پر سبقت لے جاکر اول مقام حاصل کرنا نہایت حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ محکمہ تعلیمات کے عہدہ داروں اور حکومت کے ذمہ داروں نے ضرور اس کے پرچوں کی دوبارہ جانچ کروائی ہوگی۔ انہیں یہہ معلوم کر کے تعجب ہوا ہوگا کہ وہ ایک اردو کے پرچہ میں نہیں بلکہ پانچ مضامین میں ساری ریاست میں سرفہرست ہے۔ اردو میں 94% ، انگلش میں 95% ، ہندی مراٹھی 93% ، سوشیل سائنس میں 98% (148 / 150) جس کے بعد عہدہ داروں کو یقین ہو گیا کہ یہہ تو کھرا سونا ہے تو پھر نتیجہ کا اعلان کر دیا گیا۔یہاں پر خود ان عہدہ داروں کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔ جنہوں نے تعلیم میں انصاف پسندی سے کام لے کر کسی امتیاز کو خاطر میں نہ لاکر نتیجہ کا اعلان کر کے علم کی شان اور اپنے وقار کو بلند کر لیا۔ کسی اور طرح یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ عام طور پر دوسرے نمبر پر ایک آدھ نمبر یا اعشاریہ کے عدد کے فرق کی وجہ بعض امیدوار اس اعلیٰ پوزیشن سے محروم ہوجاتے ہیں لیکن تنویر منیار کے بعد والے طالب علم کے نشانات (34) کم تھے۔ اس کو چھونے کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔

یہ کہاں تک صحیح ہے جس کی ہمیں تصدیق نہ ہوسکی کہ گذشتہ پچاس برسوں میں ہندوستان کی ساری ریاستوں میں میٹرک کے امتحان میں کسی امیدوار نے 96.4% نشانات حاصل نہیں کئے ہیں۔ یہ ایک خوشاندار تاریخی ریکارڈ ہے۔ یہ اعزاز ریاست مہاراشٹرا ہی کو نہیں بلکہ سارے ملک کے مسلمانوں اور اردو میڈیم ایجوکیشن کو حاصل ہوا ہے۔ مہاراشٹر کے ہر زبان کے اخبار نے مبارکباد دی۔ انگریزی پریس نے بھی کھل کر داد دی۔ بال ٹھاکرے کے اخبار "سامنا" نے پہلے صفحہ

پر تنویر کی تصویر کے ساتھ مبار کباد کے ساتھ شائع کی ۔ سینکڑوں کی تعداد میں مختلف سطح کے جلسوں میں تنویر کو کیسہ زر پیش کیے گئے ۔ شولاپور ضلع کی ایک سوشیل تنظیم رام لنگو لیشور شکشا پر سارک منڈل اینڈ کریڈا سمتھا کے صدر "مہادیو چکو" (سابق ایم ۔ ایل ۔ اے) نے کے ایک بڑے جلسہ میں تنویر کو ایک لاکھ روپے کا نقد کیسہ زر پیش کرتے ہوئے کہا کہ "تنویر تم نے شولاپور کا نام سارے ملک میں روشن کر دیا" بمبئی کی کئی انجمنوں نے اعزازات سے نوازا ہے ۔ انجمن اسلام کے ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے پانچ ہزار روپے کا کیسہ زر پیش کرتے ہوئے یہہ اعلان کیا کہ وہ تنویر کے آئندہ تعلیمی پروگرام میں مالی مدد کریں گے ۔ تنویر کے والد عثمان منیار پرائمری اسکول کے ٹیچر ہیں ۔ ان کی والد محترمہ امام بی بھی ٹیچر ہیں جو 1971 ء میں یس ۔ یس ۔ سی کے امتحان میں پورے ضلع شولاپور میں ٹاپ آئی تھیں ۔ ماں باپ ، اسکول کے اساتذہ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ تنویر ایک دن نام روشن کرے گا ۔

محکمہ تعلیمات کی پریس کانفرنس

27 جون 1997 ء کو بمبئی میں پریس کانفرنس ہوئی جس میں یس ۔ یس ۔ سی بورڈ کے چیرمین بھی شریک تھے ۔ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی تنویر کا انٹرویو لیا گیا ۔ اخباری نمائندوں کے سوالات کیا کچھ ہوتے ہیں وہ تو آپ جانتے ہیں سب چند سوالات اور جوابات آپ بھی سن لیں ۔

س ۔ تنویر ، ضرور تمہیں اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے سے بہت سی مشکلات پیش آئی ہوں گی ۔

ج ۔ آپ کا سوال الٹا ہے ۔ میری مادری زبان اردو ہے ۔ اردو میڈیم میں پڑھنے سے ہی میں آج ٹاپ کر سکا ۔

س ۔ کیوں ، انگریزی میڈیم کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟

ج ۔ انگریزی میڈیم کے طلبہ کو سمجھنے سے زیادہ رٹنا پڑتا ہے اور طالب علم احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے ۔

س ۔ تم نے ایک عرصے سے اچھے ٹیوشن لے کر تیاری کی ہوگی ؟

ج ۔ میں نے آج تک کسی جماعت یا کسی مضمون میں ٹیوشن نہیں لیا ۔ ٹیوشن سے دماغ مکفول ہو جاتا ہے ۔ دماغ دوسروں کے قبضہ میں رہتا ہے ۔ طالب علم خود نہیں سونچتا اور خود کسی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اس لئے کہ ٹیوٹر حاضر جواب ہے ۔

س ۔ تمہیں یہہ حوصلہ کہاں سے ملا ؟

ج ۔ قران شریف سے ۔

س ۔ قرآن کا میٹرک کی تعلیم سے کیا تعلق ؟

ج ۔ قرآن شریف کی پہلی آیت ہی پڑھنے لکھنے ، زبان اور قلم سے متعلق ہے ۔ علم کی اہمیت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے پیغمبر حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے چودہ سو برس پہلے فرمایا کہ علم اگر چین میں بھی ملتا ہو تو وہاں جاکر حاصل کرو ۔ بزرگوں میرے والدین میرے ٹیچرس اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی ہمت افزائی اور بے حساب ہمدردی کا نتیجہ ہے ۔

س ۔ آئندہ چل کر کیا بنو گے ؟

ج ۔ آئی ۔ اے ۔ ایس I.A.S

س ۔ اس فیلڈ کا انتخاب کیوں کیا ؟

ج ۔ ہمارے ملک کو ایماندار افسروں کی ضرورت ہے ۔ اگر ہم ایمانداری سے ملک کی

خدمت کریں تو اڈمنسٹریشن میں ہم چین اور جاپان کو پیچھے کر سکتے ہیں۔

س۔ تم اپنا آئیڈیل کس کو مانتے ہو؟

ج۔ کس زاویہ سے۔

س۔ زندگی میں؟

ج۔ میں زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آئیڈیل مانتا ہوں۔

س۔ آئی۔ اے۔ ایس بننے کے بعد کس طرح کام کرو گے؟

ج۔ اڈمنسٹریٹیو سروس میں حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا آئیڈیل مانتا ہوں۔

س۔ کس لئے؟

ج۔ کیوں کہ انہوں نے باوجود ایک بہت بڑی مملکت کے خلیفہ ہونے کے بہت سادہ زندگی بسر کی۔ س۔ اچھا اگر تم کلکٹر بن گئے اور تمہارے والدین یا رشتہ دار کسی جرم میں تمہارے سامنے آئیں تو کیا کرو گے۔

ج۔ میں حکومت کا وفادار ہوں، انہیں معاف نہیں کروں گا۔

س۔ اچھا بتاؤ کہ تم اپنی قوم کے لئے کیا کرو گے؟

ج۔ ہماری قوم تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ تعلیمی بیداری ضروری ہے۔ اس جانب خاص توجہ دونگا کیونکہ میری قوم ہی میرا سرمایہ ہے۔

طلباء کے کام کی چند باتیں

تنویر آپ ہی کے جیسا ایک ذہین طالب علم ہے۔ وہ آج کل اردو میڈیم فرسٹ ایر انٹرمیڈیٹ کا طالب علم ہے۔ اس سے باتیں کرتے وقت خیال آیا کہ ہمارے طلباء کے کام کی باتیں نہ ہو تو یہ سارا مضمون نامکمل رہ جائے گا۔ باتوں باتوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ آپ کے کام کی باتیں بھی سن لیں۔

تنویر چوتھی جماعت سے بمبئی کا اردو اخبار "انقلاب" پابندی سے پڑھنا شروع کیا۔ پانچویں جماعت ہی میں اس نے اپنے زندگی کا نصب العین (گو یہ لفظ بڑا ہے) مقرر کرلیا کہ وہ آئندہ چل کر آئی۔اے۔ایس کیڈر کا بڑا عہدہ دار بنے گا۔اس کے لئے جو تیاری اور جدوجہد ضروری ہے اس کے لئے اس نے خاموشی سے تیاری شروع کردی۔

ٹی وی پر وہ صرف خبریں، معلوماتی پروگرامس اور کرکٹ کا کھیل دیکھتے ہیں روزانہ (8) آٹھ گھنٹے اپنے ہوم ورک، مطالعہ اور اسٹیڈیز کے لئے مختص کر رکھے ہیں۔

اپنی جنرل نالج بڑھانے کے لئے میگزین اور کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

وہ انگریزی زبان کے پرچہ میں ریاست بھر میں فرسٹ ہیں۔ڈکشنری ان کی اچھی دوست ہے۔ان کے ہاں انگریزی الفاظ کا بہت ذخیرہ ہے۔وہ انگریزی میں گفتگو بے تکلف کر سکتے ہیں۔دنیا کے پچاس ممالک میں ان کے قلمی دوست PEN FRIENDS ہیں۔انگریزی میں خطوط لکھتے رہنے سے انہیں اپنی انگریزی کی مشق ہوتی رہی۔اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ہاں مختلف ممالک کے چھ ہزار ڈاک ٹکٹ کے البم ہیں۔یہ البم تنویر کی HOBBY کا ایک شاندار ریکارڈ ہے۔مختلف قسم کے عطریات بھی جمع کرنے کا شوق ہے۔

امتحان سے قبل روزانہ دس گھنٹے اسٹڈی میں مصروف رہتے ہیں اور قریب ایک سو ماڈل پرچے ہر مضمون کے وہ حل کرچکے تھے۔

ع۔"کمی نہیں قدرداں کی اکبر کرے تو کوئی کمال پیدا"

"پس اس ملک میں کامیابی کا یہ راز معلوم ہوا کہ تعصب کا اندھیرا جتنا بھیانک ہے۔ محنت اور لگن کا اجالا اس سے بڑھ کر ہے"۔

انگریزی زبان کی اہمیت

(IMPORTANCE OF ENGLISH LANGUAGE)

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی بہت زور و شور سے یہ ہوا چلی کہ انگریزی زبان کو بھی انگریزوں کی حکومت کے ساتھ دیش نکالا ہونا چاہئیے ۔ چند سیاسی جماعتیں، خصوصاً ہندی پریمی اس مہم میں آگے آگے تھے ۔ ۱۹۵۳ء کے لگ بھگ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے اپنے ہفتہ وار "صدق جدید" میں ایک واقعہ کا تذکرہ کیا تھا، ہوا یہ کہ ایک دن ہندی پریمیوں کا ایک ڈیلیگیشن ہندوستان کے مشہور روڑکی انجینیرنگ کالج کے پرنسپل کے پاس پہنچا اور مطالبہ کیا کہ وہ اپنے کالج سے جلد سے جلد بجائے انگریزی میڈیم کے کالج میں ہندی میڈیم رائج کر دیں ۔ کالج کے پرنسپل ان کی باتوں کو خاموشی سے کچھ دیر تک سنتے رہے، پھر ان سب کو کالج کے لائبریری ہال میں لے گئے جہاں پر فن انجینیرنگ پر لکھی ہوئی ہزاروں کتابیں فرش سے چھت تک الماریوں میں لگی ہوئی تھیں ۔ پرنسپل نے کہا دیکھئیے آپ ان سب کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کر ڈالئے تو پھر ہم ہندی زبان میں تعلیم شروع کر سکتے ہیں لیکن یاد رکھئیے ان سب کا ترجمہ کرنے تک آپ کو کم از کم پچاس برس لگ جائیں گے اور اس مدت میں اسی ایک فن پر دوگنی کتابیں انگریزی میں آجائیں گی ۔ ہندی پریمی ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوئے کالج سے نکل گئے ۔

اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے نصف تک تقریباً دو سو سال انگریزوں کی حکومت دنیا کے ہر خطہ پر چھا گئی تھی ۔ حکومت اور حاکم کی زبان کو بڑی

اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حکومت کے ساتھ انگریزی زبان بھی ان ملکوں میں پھیل گئی چونکہ حکومت کے کل پرزوں کو چلانے کے لئے انگریزی زبان سے واقفیت ضروری تھی۔وہ لوگ معاشی لحاظ سے بہت فائدے میں رہے جنھوں نے اس زبان کو جلد سیکھ لیا۔آج ہر ملک میں انگریزی سماجی مرتبہ، عزت ووقار کی زبان ہی نہیں بلکہ روپیہ اور طاقت (MONEY AND POWER) کی زبان ہو چکی ہے۔انگریزوں کے جاتے ہی اکثر کا خیال تھا کہ ہندوستان میں انگریزی کا خاتمہ ہو جائے گا کیوں کہ ساری صوبائی زبانیں انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہو گئیں۔جو ایک زمانہ تک گونگی تھیں سب ایک ساتھ بولنے لگیں ہندی قومی اور رابطہ کی زبان ہونے کے باجود انگریزی زبان کی مقبولیت پر روک لگانے میں آج ۵۰ برس بعد بھی ناکام رہی بلکہ انگریزی زبان کی اہمیت اور بھی بڑھتی ہی جارہی ہے۔اس کی چند معقول وجوہات ہیں۔

۱۔ آج کوئی اعلیٰ فنی اور پیشہ ورانہ کورس ایسا نہیں ہے جو ہندی یا کسی صوبائی زبان کے سہارے چل سکے۔صوبائی زبانوں میں ادب، شعروشاعری۔افسانہ وناول کے سوا کسی مضمون کی فنی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ریاضی، فزکس، کیمسٹری میڈیسن، بزنس، الکٹرانکس، ماحولیات، مواصلات، کمپیوٹر ٹکنالوجی جیسے سینکڑوں کورسس سے متعلق مقامی زبانوں میں کوئی ایک معیاری کتاب کا ملنا دشوار ہے۔

۲۔ انگریزی زبان میں صرف ۲۶ حروف تہجی (ALPHABETS) ہیں جو اور زبانوں کہ مقابلہ میں سب سے کم ہیں اردو میں ۳۷، تلگو میں ۵۴ حروف تہجی ہیں، طلباء انگریزی زبان کے حروف تہجی جس آسانی اور روانی کے ساتھ سناتے ہیں وہ کسی اور زبان کے طلبہ کے لئے آسان نہیں، ان ہی ۲۶ حروف کے مدد سے دولاکھ پچاس ہزار الفاظ کا ذخیرہ انگریزی زبان میں موجود ہے۔الفاظ کی اتنی بھاری تعداد کسی اور زبان

میں موجود نہیں ۔ اردو، فارسی، عربی زبانوں میں حروف کے کچھ حصوں کو ملانے سے الفاظ بنتے ہیں ۔ لیکن انگریزی میں الگ الگ حروف کو یکجا کرنے سے الفاظ بنتے ہیں جو بہت آسان ہے ۔

۳۔ ساری دنیا میں چند ممالک ایسے بھی ہیں جو اپنی زبان کی بڑی حفاظت کرتے ہیں ۔ جاپان، روس، جرمنی وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم اپنے ملک کی زبانوں میں دی جاتی ہے لیکن ان کے ہاں انگریزی زبان کے سرمایہ سے استفادہ کے لئے ایک زبردست مشینری کام کرتی رہتی ہے ۔ دنیا کے سارے ایشیائی اور یوروپی ممالک اپنے انتظامیہ MANAGEMENT میں کام کرنے والوں کو ہر سال انگلینڈ بھیجتے رہتے ہیں تاکہ وہ وہاں ENGLISH - LANGUAGE TEACHING CENTRES میں شریک ہوکر انگریزی زبان میں تحریر و تقریر اور بول چال میں مہارت حاصل کرسکیں

۴۔ دنیا کی کسی زبان میں کوئی اچھی کتاب، افسانہ، ناول کوئی تحقیقی مضمون شائع ہوجائے تو اس کا مستند ترجمہ آپ کو پندرہ بیس دن میں انگریزی میں مل جائے گا اس پر ماہرین کی رائے اور ریویو اخباروں اور رسالوں میں دیکھ لیں گے ۔ صرف ایک انگریزی زبان سے واقف ہوتے ہی آپ کا تعلق ساری دنیا سے ہوجائے گا ۔

۵۔ ۱۹۱۱ء میں THE CONCISE OXFORD DICTIONARY کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا ۔ ۱۹۹۰ء میں اس کا دسواں ایڈیشن نکلا جس میں گذشتہ دس پندرہ برس کے عرصے میں ۲۰ ہزار نئے الفاظ کا اضافہ ہوا ہے ۔ یہ سب الفاظ جدید سائینس اور ٹکنالوجی، الکٹرونکس کمپیوٹر، ماحولیات اور مواصلات وغیرہ سے متعلق ہیں ۔ سائینس کی اس تیز رفتار ترقی سے دوسری زبان والے اس کی شد بد سے بھی واقف نہیں ۔ مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو ڈکشنری ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی جس میں تقریباً ایک

لاکھ بیس ہزار الفاظ شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ " انگریزی زبان بڑھتی ہوئی دولت ہے"۔ ان کی ٹیم کو انگریزی الفاظ کا ترجمہ کرتے کرتے کئی نئے الفاظ آ گئے جنہیں ضمیمہ میں شامل کرنا پڑا۔ جناب ظہور قاسم ممبر پلاننگ کمیشن نے حیدرآباد میں برلا انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسہ میں کہا کہ سائنس کی تیز رفتار ترقی اس زمانہ میں حیرت انگیز ہے۔ سائنس کی دنیا میں ہر منٹ تین ہزار نئے الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کی کوئی اور زبان انگریزی زبان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینا ناممکن ہو چلا ہے۔

ایک اہم سوال

آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور آئے گا کہ ایک طرف تو سب ماہرین تعلیم ابتدائی اور فوقانی درجہ تک مادری زبان میں تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن انگریزی کا ہر طرف چرچا سن کر جب ہم اپنے بچوں کو انگلش میڈیم میں پڑھاتے ہیں تو اس کی مخالفت نا چاہیئے؟ جب ہمارا بچہ اردو زبان میں پڑھے گا تو کالج کی سطح کی تعلیم میں وہ ان طلبہ سے پیچھے رہ جائے گا جو ابتداء ہی سے انگریزی میڈیم سے تعلیم پائے ہوئے ہوں گے یہاں ان ہی سوالوں کا جواب دینا مقصود ہے۔

بچوں کی نشو نما اور تعلیم کے لئے گھر کی معاشی آسودگی ضروری ہے۔ جن کے والدین معاشی پریشانیوں میں گھرے رہتے ہیں وہ اپنے بچوں کی تعلیم کو ایک ضمنی حیثیت دیتے ہیں اور غریب طلباء اس سکون و اطمینان سے نہیں پڑھ سکتے جو تعلیم کے ضروری ہے۔ اکثر والدین پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ مالی حالت بھی مشکل ہی سے ں کی اجازت دیتی ہے پھر بھی وہ اپنے بچوں کو انگلش میڈیم میں شریک کرواتے ہیں اور اس کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ عام انگلش میڈیم اسکولوں کا معیار غیر

اطمنان بخش ہے ۔ بعض اسکولوں کا معیار تعلیم پست ہے لیکن وہ اپنی آمدنی کے لئے طلبہ کو ہر سال پروموشن دیتے جاتے ہیں ۔ نہ تو انھیں انگلش آتی ہے اور نہ مادری زبان سے واقف ہوتے ہیں ۔ وہ اتنی تعلیم کے بعد بھی کہیں کے نہیں رہتے ۔ یہ المناک حقیقت ہے جو طلبہ کی ساری زندگی برباد کرتی ہے۔

بازار کی اشیاء کی طرح اچھی تعلیم مہنگی ہوتی ہے۔ سستی تعلیم کا معیار پست ہوتا ہے ۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہیں اور اچھے انگلش میڈیم اسکولوں کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں اور گھر پر ٹیوشن کا انتظام کر سکتے ہیں ۔ انہیں کسی مشورہ کی ضرورت نہیں ۔ وہ ضرور اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھائیں گے ۔ لازماً ان طلبہ کا معیار انگریزی زبان میں دوسرے میڈیم طلبہ کے مقابلہ میں بہتر ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی حد تک انہیں برتری حاصل ہوجاتی ہے لیکن گذشتہ دس برس کے عرصے میں تلگو اور اردو رزیڈینشل اسکولوں کے طلبہ کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے کرسچن مشنری اسکولوں کا سحر ٹوٹتا جارہا ہے ۔ اگر مادری زبان میں تعلیم کے لئے اچھے ٹیچرس، کتب اور مادی سہولتیں حاصل ہوں تو طلبہ انگلش میڈیم طلبہ سے آگے ہوجاتے ہیں۔

مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کی سطح کے امتحانات میں کامیاب ہونے تک ان کے لئے آٹھویں جماعت سے انگریزی زبان میں کسی حد تک عبور حاصل کرنے کے لئے خاص پروگرام کا اہتمام کیا جائے ۔ مہارت تو رفتہ رفتہ پیدا ہوجائے گی ۔ انتظامیہ کی جانب سے روبہ عمل لانے کے لئے چند تجاویز پیش ہیں جو قابل غور اور قابل عمل ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے تو انگریزی پڑھانے والے ٹیچرس کی تربیت ضروری ہے اکثر اسکولوں میں انگریزی اردو ہی میں پڑھائی جاتی ہے۔

انگریزی زبان کی بہت سی نزاکتوں سے ہمارے ٹیچرس واقف نہیں۔ ان کی سب کمزوریاں غیر محسوس طریقہ سے طلبہ میں بھی آجاتی ہیں۔ ان سب کے لئے سال میں ایک دو مرتبہ، یا گرمائی تعطیلات میں پندرہ بیس یوم کے لئے ENGLISH TEACHING PRACTICE کا انتظام کسی ادارہ کی جانب سے کسی مرکزی مقام پر کیا جائے تاکہ اطراف کے مدارس کے لئے ٹیچرس اس ورکشاپ میں حصہ لے سکیں اس ورکشاپ کو چلانے کے لئے CENTRAL INSTITUTE OF ENGLISH AND FOREIGN LANGUAGES عثمانیہ یونیورسٹی کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ ادارہ ہر وقت آپ کی رہنمائی اور مدد کے لئے تیار رہتا ہے۔

۲۔ انگریزی زبان و بیان، لہجہ و تلفظ گرامر اور گفتگو پر سینکڑوں AUDIO CASSETTES تیار کئے جاچکے ہیں۔ بلکہ صرف INTONATION لہجہ اور PRONUNCIATION انداز اظہار پر کئی لوگوں نے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ ان آڈیو کیسیٹس کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ سارے کلاس رومس میں ہر روز پندرہ بیس منٹ کے لئے انگریزی اسباق سنائے جاسکتے ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ حیدرآباد کے بعض اسکولوں میں اس کا انتظام ہے۔ ان اسباق کے لئے پہلے ہی سے ٹیچرس کا تیار رہنا ضروری ہے تاکہ طلبہ سے اسی سبق پر مشق کرائی جاسکے۔

۳۔ انگریزی پڑھانے کے ماہر ٹیچرس کے DEMONSTRATION LESSONS سال میں دو چار مرتبہ رکھے جائیں۔ تاکہ اطراف و اکناف کے اسکولوں

کے ٹیچرس ایسے اسباق کا مشاہدہ کر سکیں ۔ وہ دوسری تیسری جماعت کے بچوں کو اس خوبی کے ساتھ اور موثر انداز میں پڑھاتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے طلبہ انگریزی میں روانی سے مختصر جملے بولنے لگ جاتے ہیں ۔

۴ ۔ اسکول لائبریری میں آسان انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں ، قصے کہانیاں خوبصورت ٹائٹل اور تصاویر کے ساتھ سینکڑوں کتابیں مل جائیں گی ۔ طلبہ میں ان کتابوں کے پڑھنے سے انگریزی زبان سے دلچسپی بڑھ جائے گی ۔

کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے انگریزی زبان کو ہندوستان میں لائبریری زبان LIBRARY LANGUAGE کی حیثیت سے بڑی اہمیت دی ہے اسکولوں کے زمانہ ہی میں طلبہ کی انگلش کی بہتری کے لئے کوشش کی جائے تو انہیں اعلیٰ تعلیمی سطح پر کوئی دشواری نہ ہوگی ۔ اوپر دی ہوئی ایسی ہی تجاویز پر عمل اور تجربہ ضروری ہے ۔

گمنام ٹیچر کی یاد کیوں؟

5 / ستمبر "سارے ملک میں ٹیچرس ڈے" منایا جاتا ہے تاکہ ان اساتذہ کو اعزاز بخشا جائے جو کروڑوں طلبہ و طالبات کے مستقبل کو سنوارنے کے ذمہ دار ہیں شعبہ تعلیم سے میری وابستگی کسی نہ کسی طرح ۴۵ برس سے رہی ہے اس لئے مجھے سینکڑوں ٹیچرس کو ٹریننگ دینے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ان سارے اساتذہ میں سب تو مجھے یاد نہیں لیکن چند ایک اساتذہ کی لگن جستجو اور جذبہ خدمت کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔انھیں نہ تو کوئی انعام ملتا تھا اور نہ تنخواہ میں اضافہ ہوتا لیکن انہیں طلبہ کی پڑھائی ، بہبودی کی ایسی فکر دامن گیر رہتی تھی جیسے خود ان کا بیٹا کچھ بڑا آدمی بننے والا ہو۔ بالآخر سینکڑوں ٹیچرس میں ایک دو ٹیچر اس وجہ سے ہماری زندگی میں یاد رہ جاتے ہیں۔جنھوں نے ہماری زندگی کی کایا پلٹ دی زندگی کا رخ بدل دیا وہ آج زندہ نہیں ہیں لیکن ہم ان کے لئے کیا کرسکتے ہیں سوائے زبان سے ایک دو جملے ان کی خوبیوں پر کہنے کے۔انھیں کبھی یہ بھی توقع نہ تھی کہ ان کے شاگرد سماج اور ملک میں نامور ہو جائیں گے۔اور انھیں کبھی کچھ ان سے مالی یا دنیوی فائدہ ہوگا۔یہ ٹیچرس ضرور ایسے تھے کہ اپنی نجی محفلوں میں اپنے شاگردوں کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے کہ کوئی آج پروفیسر ہے ، ڈاکٹر، انجنیر،!!، ادیب ، شاعر ہے۔دراصل ٹیچر کی مثال ایک ایسے بیج کی ہے جو زمین میں دفن رہتا ہے۔اسی سے پودا زمین کا سینہ چاک کرکے اوپر آتا ہے پھر درخت کی شکل میں پھول، پھل دیتا ہے۔ماں باپ خاندان کے افراد اور لوگ پھول پھل کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں مگر اس بیج کو بھلادیتے ہیں جو اس

پتھر کو تراش کر ہیرا بنادیتا ہے۔ہیرے کی چمک دمک اس استاد کی کاریگری ہے جو گمنام رہ جاتا ہے اس کو اس کی زندگی میں کوئی پھولوں کا ہار نہیں پہناتا اور نہ سماج میں اسے کوئی معزز مقام دیتا ہے اور نہ اس کو اس بات کی پرواہ ہوتی ہے کہ کوئی اس کو جانے پہچانے ، ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا ہے کہ " اچھے استاد کی پیشانی پر کتاب کا نہیں بلکہ محبت کا عنوانِ ہوتا ہے کوئی لڑکا بگڑ چکا ہے تو جب سب اس سے شاکی اور مایوس ہو جاتے ہیں تو پھر بھی دنیا میں دو آدمی ایسے ہیں جن کے سینہ میں امید کی شمع روشن رہتی ہے اور وہ مایوس نہیں ہوتے ایک اس کی ماں دوسرے شفیق استاد۔"

آج ایک ایسے ہی ٹیچر کی یاد آرہی ہے،آپ بھی اس کا حال سن لیجئے کیوں کہ اس کی زندگی بہت سے لوگوں کے لئے روشنی کا مینار ہے بشرطیکہ وہ ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں۔1972 ء مجھے دو ڈھائی سال تک محبوب نگر جونیر کالج پر بحثیت پرنسپل کام کرنے کا موقع ملایہاں پر ایک بزرگ ، باریش تہجد گزار ، اور اردو کے لکچرار مولوی شمس الدین تھے جو ۳۵ برس سے اسی ایک ہائی اسکول میں کام کررہے تھے ۔30 روپے سکہ حالی پر ان کا تقرر ہوا تھا اور جب یہ جونیر کالج 1970 ء میں ہوا تو اسی پر کام کررہے تھے ۔اتنے طویل عرصہ سے کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا محبوب نگر مولوی شمس الدین کا شاگرد تھا ان میں بہت سے ریاستی سطح کے ہندو مسلم معزز حضرات بھی شامل تھے ۔یہی وجہ تھی کہ ان کی بڑی عزت تھی ۔ محفلوں میں ان کی بڑی آو بھگت ہوتی وہ اردو، عربی اور فارسی کے عالم تھے ۔ساٹھ ستر برس قبل ظاہر ہے ان علوم کی بڑی قدر بھی تھی نہ معلوم کیوں جاتے ہی ان سے دوستی ہو گئی ان کی قدر و منزلت دل میں ہمیشہ بڑھتی ہی گئی ۔ورنہ تجربہ یوں بھی ہے کہ پہلی قدر و منزلت چند دن بعد گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ان کے چار لڑکے ،چار لڑکیاں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ۔ایک لڑکا ایک

لڑکی بائیو کیمسٹری میں پی ۔ایچ ۔ڈی اور ایک لڑکی ایم ۔ایس ۔سی فرسٹ کلاس، تینوں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے تھے۔عثمانیہ یونیورسٹی سے دو بھائی بی۔ای پاس انجنیرس تھے ۔ایک اور صاحبزادہ منظور عالم بیس سال قبل عثمانیہ یونیورسٹی کے M.B.A. کورس میں پی ایس ۔سی ٹاپ کرنے سے واحد سیٹ ملی ۔یہ پھر فرسٹ کلاس آئے ، پھر آل انڈیا کوآپریٹیو سرویس میں سلکٹ ہوئے اور اس کی چھ ماہ کی ٹریننگ میں فرسٹ آئے ، انھیں گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت ملی ۔پندرہ دن پلین کے سفر رہتے پھر کیا تھا ان کی شادی کے پیامات کا سلسلہ چلا بہت سے معزز اور مالدار حضرات کی طرف سے اپنی لڑکیوں کے لئے پیامات کا سلسلہ شروع ہو گیا یہاں تک کہ اس میں کلکٹر صاحب کی صاحبزادی کا بھی پیام تھا۔مولوی صاحب بظاہر زاہد خشک تھے کسی کو کوئی جواب نہ دیتے سنتے اور خاموش ہوجاتے بعض حضرات راست منظور عالم تک پہنچے؛ وہاں بھی ایک ہی جواب تھا کہ "جو ابا چاہیں" ۔

ایک روز صبح سویرے بعد نماز فجر مولوی صاحب محبوب نگر کے ایک پولیس کانسٹیبل کے گھر پر پہونچے اور کہا کہ آپ کی لڑکی شاہجہاں (جو ایم ۔ایس ۔سی کامیاب کر چکی تھی اور آج کل ایک کالج میں لکچرار ہے) اس سے منظور کا رشتہ طے کرنے آیا ہوں ۔اس بے چارہ کی خوشی کا کیا عالم تھا۔شاہ جہاں خود بھی تو مولوی صاحب کی شاگرد رہ چکی تھی بات منٹوں میں طے ہو گئی ۔لینا دینا کچھ نہیں شادی ہو گئی ۔ کوئی مولوی صاحب کی سادگی پر اور کوئی مولوی صاحب کی ناعاقبت اندیشی پر (کیونکہ جہیز اور کار چھوڑدی) سارا محبوب نگر حیرت میں تھا۔ مولوی صاحب کی دور اندیشی کے امتحان کا جلد ہی نتیجہ سامنے آگیا۔

وہ روز کی طرح فجر کی نماز پڑھ کر صبح سویرے گھر لوٹے تو کیا دیکھتے

ہیں کہ پہلی شب کی دلہن منھ اندھیرے، گجردم صحن میں جھاڑو دے رہی ہے ۔ پکار اٹھے ۔ بی بی یہ کیا کر رہی ہیں ؟ جواب تھا کیوں آباّ جان ہر روز اپنے گھر میں تو جھاڑو دیتی تھی ۔ کیوں کیا یہ آج سے میرا گھر نہیں ہے ۔یہاں پر شرم کی کیا بات ہے اس نے سارے خاندان کا دل جیت لیا اور شاہ جہاں کا سکّہ ہر طرف چلنے لگا ۔ آپ کے دل و دماغ میں ایک سوال ضرور آرہا ہوگا کہ آخر یہ مولوی شمس الدین نے ایک ٹیچر کی محدود تنخواہ میں کس طرح اپنے بچوں کو یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین ڈگریاں لینے کے قابل بنادیا، اتنا پیسہ کہاں سے لایا ۔ مولوی صاحب کا مکان لب سڑک اور بڑا صحن تھا جو چھ، سات بھینس پال رکھے تھے منھ اندھیرے سب بچے ایک ساتھ کام کرتے کوئی چارہ ڈالتا، کوئی دودھ دھوتا کوئی گوبر اٹھاتا، دودھ میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملاتے محبوب نگر کے سارے آفیسرس کے لئے دودھ کا راشن تھا اس سے کچھ آمدنی ہوجاتی ۔

گھر کے سامنے سڑک پر اپنی ایک گرنی بھی تھی، ۔ دو تین ملازم تھے ۔ ایک دن شام میں ایک کرسچن جوڑا گیہوں پسوانے کے لئے آیا ۔ یہ دونوں ٹیچر تھے ۔ دیکھا کہ مولوی صاحب کا ایک جوان لڑکا گرنی پر بنیان پہنے کھڑا ہے چہرہ اور بال آٹے کے پوڈر سے سفید ہیں مولوی صاحب آرام کرسی پر براجمان ہیں ۔ یہ دونوں میاں بیوی مولوی صاحب کو جانتے تھے ۔ کچھ خفگی کے لہجہ میں کہا کہ مولوی صاحب اس لڑکے کو کم از کم میٹرک تک تو پڑھا دیتے مولوی صاحب نے جواب دیا یہ میٹرک سے بھی آگے ہے ۔ کہا انٹر، نہیں اس سے بھی آگے، کیا بی ایس سی نہیں اس سے بھی آگے ۔ کیا ایم ایس سی نہیں اس سے بھی آگے یہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے حال ہی میں بائیو کیمسٹری سے پی ایچ ڈی کر کے آیا ہے ۔ اور ملازمت کے انتظار میں ہے ۔ کرسچن جوڑا دنگ رہ گیا ۔

ان صاحبزادہ کو گورنمنٹ آف انڈیا نے دو سال کے لئے جاپان اسکالر شپ پر بھیجا ان کا مقالہ بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہوا یہ آج کل ہندوستان کی ایک ریاست میں سائنٹسٹ ہیں۔

میں نے ان بچوں سے ایک سوال کیا کہ آپ سب لوگ باہر جاسکتے تھے۔ امریکہ، انگلینڈ، سعودی عرب، کہنے لگے ہمیں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے یہ سب کے سب آج کلاس ون گزٹیڈ آفیسرس ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے والد جس طرح اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت دے گئے ویسے وہ بھی اپنی والاد کے لئے فکر مند ہیں۔ باہر جانے سے ان کی تعلیم میں حرج ہوگا اور ہماری خاندانی زندگی میں رخنہ پڑجائے گا۔

مولوی شمس الدین صاحب خوش قسمت تھے کہ وہ اپنے بچوں کو بڑے بڑے مقامات پر پہنچتا دیکھ گئے ہر ماں باپ کی خواہش اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھے دوست احباب مولوی صاحب کی دوراندیشی کی داد دیتے کہ ۲۵ سال قبل ہی جو منصوبہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بنایا تھا وہ نقشہ مختلف رنگوں میں ابھر آیا۔ اس میں ہمارے والدین کو جو اس مضمون کو پڑھ رہے ہوں گے سوچنے اور غور کرنے کے لئے کافی مواد ہے۔

تعلیم میں ایک خاتون کی انقلابی جدو جہد

قریب چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ مہاراشٹرا کے ایک ضلع کے مستقر پر ایک صاحب امریکہ سے زراعت کے شعبہ میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لے کر آئے اور زرعی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے کٹر مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ اپنے گھر والوں کو پردہ کی سختی سے پابندی کرواتے۔ ان کی ایک لڑکی گرلز ہائی اسکول کی چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی جو سیکل رکشا میں پردہ باندھ کر خود بھی برقعہ میں ملفوف ہو کر آتی جاتی۔ ایک روز وہ پردہ سے باہر چہرہ نکال کر دیکھ رہی تھی، غضب ہوا کہ ابا جان کی نظر راستہ سے آتے ہوئے پڑ گئی۔ شام یہ لڑکی گھر واپس آئی تو وہ اس پر برس پڑے اور زور سے منھ پر طمانچہ مارا کہ لڑکی کا ایک دانت ٹوٹ کر گر گیا اور منھ لہولہان ہو گیا۔ دوسرے ہی دن لڑکی کا نام اسکول سے خارج کروالیا اور گھر سے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی۔ یہ سارا واقعہ گرلز ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹرس محترمہ عائشہ بیگم کے علم میں آیا۔ ویسے یہ واقعہ ساری آبادی میں مشہور ہو چکا تھا (محترمہ عائشہ بیگم کے کام اور تعلیمی مشن پر ایک مستقل مضمون بھی اپنی کتاب "تعلیم۔ایک تحریک" میں شامل ہے) یہ غریب، ذہین اور مظلوم طلبہ اور خواتین کی مدد کا نصف صدی کے دوران ایک شاندار ریکارڈ رکھتی ہیں۔ انھوں نے ان پروفیسر صاحب سے ملنے کیلئے وقت مانگا وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئے کہ دیوان خانہ کے درمیان پردہ ہو گا اور پردہ کی اوٹ سے بات ہو گی۔ محترمہ نے پروفیسر صاحب کو بہت سمجھایا کہ ایک معصوم لڑکی کو اتنی سخت سزا دینا اور اسکول ہی سے خارج کر لینا مناسب نہیں۔ لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ محترمہ نے کہا کہ

جب تک آپ اپنی لڑکی کو دوبارہ اسکول نہ بھجوائیں گے میں یہاں سے ٹلنے والی نہیں ہوں ۔جب جاکر پروفیسر صاحب کے انداز فکر میں نرمی پیدا ہوئی ۔ہیڈ مسٹرس صاحبہ کی شخصی ذمہ داری پر وہ اپنی لڑکی کو دوبارہ اسکول بھیجنے پر آمادہ ہوگئے ۔

اس واقعہ کے دو سال بعد ان پروفیسر صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا ۔وہ ۲۶ سال کی بیوہ اور پانچ بچوں کو اس دنیا میں بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے ۔ کوئی تیسرے دن محترمہ کو معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کا انتقال ہوگیا ہے وہ کسی اور مقام پر تھیں ۔وہاں سے سفر کر کے پرسہ دینے کیلئے واپس آئیں ۔جب میں نے اس خاتون کو دیکھا جس کا سفید رنگ پیلا پڑ چکا ہے اور وہ بجائے رونے دھونے کے ساکت و خاموش بیٹھی ہوئی ہیں ۔پوچھنے پر کہنے لگیں کہ شوہر کے جانے کا غم تو بہت ہے لیکن ان پانچ بچوں کا کیا ہوگا (جن میں دودھ پیتا بچہ بھی تھا) اسی روز مالک مکان کا نوٹس بھی وصول ہوا تھا کہ مکان فوراً خالی کردیں ۔بیوہ کے والد ریٹائرڈ پولیس آفسر تھے اور دیہات میں زیندار تھے ۔انہوں نے کہا کہ وہ اپنے گھر واپس آجائے اور ماہانہ ایک تھیلا غلہ کا وہ انتظام بھی کر دیں گے ۔

" WHEN TROUBLES COME, THEY COME IN BATTALIONS " (SHKES PEARE)

(جب بلائیں آتی ہیں تو فوج در فوج آتی ہیں)

محترمہ عائشہ بیگم نے دلاسہ دیا اور اس اجنبی خاتون کو اپنے وسیع مکان میں رہنے کا مشورہ دیا ۔وہ دوسرے ہی روز بجائے اپنے والد کے گھر جانے کے محترمہ عائشہ بیگم کے مکان آگئیں اور مہر کی کچھ رقم تھی وہ کام آئی ۔

اصل کہانی شوہر کے انتقال کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ شوہر کا مرنا کیا تھا کہ خاندان کے سب ہی افراد پر تعلیم کے دروازے کھل گئے۔ مرحوم تو لڑکیوں کی تعلیم کے دشمن تھے۔ اس بیوہ نے تعلیم کیلئے جو جدوجہد اور جانفشانی کی ہے ایسی مثال بہت کم دیکھنے یا سننے میں آئی۔ محترمہ عائشہ بیگم کہتی ہیں کہ میں نے صرف اپنے گھر میں رہنے کا سہارا دیا لیکن وہ اس نے سہارے کو غنیمت جان کر ایسی مثال قائم کر دیں کہ میں آج تک دنگ ہوں۔ اگر ڈپٹی نذیر احمد کو اس خاتون کی تعلیمی جدوجہد کا علم ہوجاتا تو شاید وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر "مراۃ العروس" جیسی ایک اور ناول لکھ ڈالتے۔

اس خاتون نے ارادہ کر لیا کہ وہ خود تعلیم حاصل کریں گی اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گی۔ خود تو شُد بُد پڑھی لکھی تھیں۔ دو سال کے عرصہ میں مراٹھی کی تین کتابیں پڑھ ڈالیں اور انگریزی میں A,B,C,D سے شروع کر کے ساتویں جماعت کی انگریزی، پڑھنے، لکھنے، سمجھنے کے قابل ہوگئیں۔ محترمہ عائشہ بیگم روزانہ گھنٹہ دو گھنٹہ ٹیوشن دیتیں جب انھیں دن میں فرصت نہ ملتی تو رات دو بجے اس خاتون کو نیند سے جگا دیتیں۔ پھر تعلیم شروع ہوتی۔ نہ تو اس خاتون کو نیند آتی اور نہ اس مدر ٹریسا کے جذبہ خدمت کی آگ مدھم ہوتی۔

یہ خاتون مشین پر سلوائی اور ایمبرائیڈری کے کام میں طاق تھیں۔ محترمہ عائشہ بیگم اپنے اثرات اور تعلقات کی بناء پر کئی خاندانوں کے کپڑے سلوائی کیلئے لے کر آجاتے تھے اور ہوم ورک دیتیں۔ یہ خاتون دن اور رات سلوائی کا کام کرتیں اس طرح بچوں کی پرورش ہوتی گئی، بالآخر وہ مڈل (درجہ ہفتم) کے امتحان میں کامیاب

ہو گئیں اور چند ہی دنوں میں مڈل ٹرینڈ ہو کر کسی گورنمنٹ پرائمری اسکول میں ٹیچر ہو گئیں ۔اس طرح معاشی حالات کسی حد تک بہتر ہو گئے ۔اس خاتون نے اس راز کو پالیا تھا کہ جو غریب ، بے کس ، بے سہارا ہیں وہ معاشرے میں تعلیم ہی سے اوپر آسکتے ہیں ۔

ان کے چھ بھائی بہن دیہات میں رہتے تھے جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے ۔ معمولی سی زراعت کے کام میں لگے ہوئے تھے ۔انھیں خیال آیا کہ اپنے بھائی بہن اور رشتہ داروں کے بچوں کی دیہات سے لاکر اپنے پاس رکھ کر تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے ۔ چنانچہ ۲۵، ۳۰ سال کے عرصہ میں ان بچوں کی تعداد پچاس سے زائد ہو گئی ۔آپ یہ سن کر حیرت میں پڑجائیں گے کہ ان میں کوئی آج گریجویٹ سے کم نہیں ۔بی ۔اے ، بی ۔ ایس ۔سی ، ایم ۔اے ، ایم ۔ایس ۔سی ، بی ۔ایڈ ، ایم ۔ایڈ ، پی ۔ایچ ۔ڈی ، بی ۔ای ، ایم ۔بی ۔بی ۔ایس ، پانچ چھ ڈاکٹر ، چھ سات انجینیر ، لکچرر ، پروفیسر ، گزیٹیڈ آفیسر ، اسکول کے ٹیچرس وغیرہ ہیں ۔حال ہی میں اسی خاتون کا ایک لڑکا محترمہ عائشہ بیگم سے ایک عرصہ کے بعد ملنے آیا جو ماہانہ تیس ہزار روپے تنخواہ پاتا ہے ۔اور وہ صاحبزادی جن کا دانت ٹوٹ گیا تھا ، ان کی ایک لڑکی ۔ایم ۔بی ۔بی ۔ایس ڈاکٹر ہے جن کی ادی بھی ایک ڈاکٹر سے ہوئی ہے ۔ہمہ خاندان آفتاب است کی مثال ۔

دو سال قبل یہ خاتون اورنگ آباد سے حیدرآباد تشریف لائی تھیں ۔ محترمہ عائشہ بیگم کے ذریعہ اس خاتون سے میری ملاقات ہوئی ۔باتوں باتوں میں ، میں نے کہا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا قول ہے کہ اگر ایک غریب ذہین لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلوادو تو پھر اس کی تیسری ، چوتھی پشت تک اس کے خاندان میں کوئی غریب باقی

نہیں رہے گا، کہنے لگیں وہ تو بہت دور کی بات ہے ۔ دیکھئے میں نے اپنے ہی خاندان کی موجودہ نسل کو مختصر سی مدت میں تعلیم سے آراستہ کرواکر انھیں معاشرہ میں بہت بڑا مقام ملتے ہوئے دیکھ لیا ہے ۔

اس خاتون کی تعلیمی جدوجہد کو ہم نے "انقلابی" لکھا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک متوسط خاندان کی غریب دیہاتی لڑکی جس کو لکھنا پڑھنا شدبد آتا ہو، افتاد زمانہ نے اسے آسمان سے زمین پر پٹک دیا ہو، اپنے بچوں کو جس طرح تعلیم دینے کی جدوجہد کی اور خود مڈل تک پڑھنے میں کامیاب ہوئیں، بے شک داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔ لیکن ایک تعلیمی مشن کے طور پر اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے پچاس سے زائد لڑکے اور لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم تک کسی نے کسی طرح اپنی نگرانی میں انتظام کرنا بھی حیرت انگیز ہے، ایسی مثال کسی دولت مند بڑے خاندانوں میں بھی آج تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آتی ہے ۔

یہاں پر محترمہ عائشہ بیگم کے تعلیمی مشن کا ایک روشن پہلو سامنے آتا ہے ۔ اگر یہ نیک نفس خاتون ایسے نازک وقت پر انھیں سہارا نہ دیتیں اور پانچ بچوں کی ماں کو جس کو وہ پوری طرح نہ جانتی ہوں اپنے گھر لاکر ٹھہرالینا بڑے حوصلے کا کام ہے ورنہ یہ دمکتا موتی کہیں کوڑے کرکٹ، کنکر پتھروں میں گم ہوجاتا ۔ محترمہ عائشہ بیگم بار بار کہتی رہیں کہ میں نے ایسی جفاکش، دور اندیش، جرات مند، مصمم ارادہ والی، نیک نفس، شگفتہ مزاج خاتون جس کی پیشانی پر کبھی شکن نہ آیا ہو اپنی زندگی میں نہیں دیکھا، اے گمنام، نیک نام خاتون تیری زندگی اور کشمکش حیات، تیرا حوصلہ، تیرا تعلیمی مشن، سینکڑوں خاندانوں کیلئے مینارہ نور ثابت ہوگا ۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

(اقبال)

فاطمہ بی کو بین الاقوامی اعزاز

("یہہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی")

اکٹوبر ۱۹۹۸ء کو اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل، کوفی عنان نے آندھراپردیش، ضلع کرنول کے ایک غیر معروف گاوں "کالوا" کی خاتون سرپنچ فاطمہ بی کو دیہات سدھار غریب دیہاتیوں کی مثالی خدمات کے اعتراف کے طور پر اوارڈ دیتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں فاطمہ بی کا تذکرہ کیا۔

"سماجی ناانصافیوں، اور ناہمواریوں کو دور کرنے، دیہی آبادی کو غربت کی سطح سے اوپر لانے، عورتوں کو سوسائٹی میں باعزت مقام دلانے کے لئے فاطمہ بی کی قیادت میں ازخود شروع کردہ پروگرامس کی عمل آوری کے سلسلہ میں غربت کے خلاف جدوجہد"۔۔۔۔(RACE AGAINST POVERTY AWARD) سرٹیفکٹ اعتراف خدمات کے طور پر دیا گیا۔ فاطمہ بی نے اقوام متحدہ میں اپنی مادری زبان اردو میں تاثرات ظاہر کیئے۔

نیویارک جانے سے قبل مسز وجے بھارتی، اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرامس کی عہدہ دار نے فاطمہ بی اور زبیدہ بی کو چیف منسٹر آندھراپردیش سے ملاقات کروائی۔ خود چندرابابو نائیڈو "جنم بھومی" پروگرام کے خالق ہیں اور گاندھی جی کے دیہات سدھار پروگرام کو کسی اور چیف منسٹر نے دل و جان سے قبول کیا ہو اور عمل کیا ہو شاید پچاس برس میں کسی اور ریاست میں ایسی مثال نہیں ملے گی۔ چیف منسٹر سے ملاقات کا پروگرام ظاہر ہے چند منٹ کے لئے رسمار کھا گیا تھا لیکن چندرا بابو نائیڈو نے نہایت دلچسپی سے دو گھنٹے تک فاطمہ بی سے "کالوا" کے ترقیاتی

پروگرامس کی تفصیل سنتے رہے اور وہ فاطمہ بی کی حرکیاتی قیادت سے بہت متاثر ہوئے۔اقوام متحدہ کا یہ اعزاز نہ صرف فاطمہ بی اور ان کے خاندان کے لیئے باعث فخر ہے بلکہ ان کے گاؤں "کالوا" ضلع کرنول، ریاست آندھراپردیش، اور سارے ملک کے لئے ہے کیوں کہ ہندوستان کے ساڑھے تین لاکھ دیہات میں "کالوا" کا انتخاب کوئی آسان نہ تھا۔ پھر فاطمہ بی کے ساتھ اعزاز پانے والی تین خواتین ہیں جن کا تعلق فرانس، شرق اردن اور یوگنڈا سے ہے۔

یہ بات اور بھی قابل رشک ہو جاتی ہے کہ خود ۳۳ سالہ فاطمہ بی شد بد پڑھی لکھی ہیں ان کے تین بچے ہیں اور شوہر ایک چھوٹے سے کرانہ اسٹور کے مالک ہیں۔ مسلم خاندان سے تعلق رکھنے والی خاتون، جو پردہ اور سماجی رسم و رواج اور روایات میں بندھی ہوتی ہیں۔اس کا گرام پنچایت کی صدر بن جانا اور کسی لیڈر یا گورنمنٹ کی امداد کے بغیر خود ساختہ پروگرام اپنی جانب سے شروع کرنا اور تین سال کی مدت میں دیہاتی زندگی میں ایک انقلاب لادینا فاطمہ بی کی کارکردگی اور قائدانہ صلاحیتوں کے لیئے یہ بین الاقوامی اعلیٰ ترین اعزاز ہے۔

گورنمنٹ کی جانب سے تین چار سال قبل گرام پنچایت اور دوسری انتخابی تنظیموں میں ۳۳ فی صد نشستیں خواتین کے لئے محفوظ کر دی گئیں۔اس طرح فاطمہ بی کو گرام پنچایت کے رکن بن جانے کا موقع ملا۔ لیکن مرد اراکین کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ کوئی عورت سرپنچ بن جائے اور گاؤں کا سارا اڈمنسٹریشن ایک عورت کے ہاتھوں میں چلا جائے مرد اراکین کی شدید مخالفت کے باجود فاطمہ بی کا انتخاب "سرپنچ" کی حیثیت سے ہو گیا۔فاطمہ بی کا کہنا ہے کہ یہ دنیا "مردوں کی برتری کی دنیا ہے" مجھے گاؤں والوں کی دشنام طرازی، گالی گلوج، رکیک اور غیر اخلاقی حملوں کو برداشت کرنا پڑا۔اس انتخاب کے بعد اقوام متحدہ کے پراجکٹس پروگرام کے تحت

ایک ورکشاپ سرپنچوں کی تربیت کے لئے ہوا جس میں دیہی اڈمنسٹریشن کی مشکلات، صدیوں پرانی روایات، رسم و رواج، خواتین کے ساتھ بے رحمانہ سلوک، ناانصافیاں، غربت اور جہالت دور کرنے اور تعلیم کو لازمی اسکیم کے طور پر چلانے کے مختلف پروگرام اس پر مباحث ہوئے فاطمہ بی کا کہنا ہے کہ اس ورکشاپ اور گاوں کے ہتک آمیز سلوک نے مجھے اپنے ارادوں میں اور بھی مضبوط کر دیا۔ میں نے سوچ لیا کہ ساری مشکلات کے باوجود میں ضرور اپنے پروگرام کامیاب کر کے رہوں گی۔ اس ورکشاپ کے بعد فاطمہ بی ایک نئی مصلح یا Reformer کے روپ میں ابھر آئی جس نے اپنے گاوں کے لوگوں کی زندگی میں انقلاب لانے کا ارادہ کر لیا۔ جو کوئی ملک کی آزادی سے قبل ہندوستان کے دیہات میں رہے ہوں یا کچھ دن یہاں کی زندگی کا مشاہدہ کر چکے ہوں تو انھیں اندازہ ہوگا کہ گاوں کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ غربت، جہالت، افلاس، گندی گلیاں، گندی نالیاں، ہنڈی کے راستے، پینے کا پانی نہیں، مکھیوں اور مچھروں کی آماجگاہ، فرسودہ رسوم و رواج بچپن کی شادیاں، زمینداروں کے رحم و کرم پر ان کی معیشت کا انحصار تھا۔ بلکہ چند ساہوکار اور زمیندار پورے گاوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔ صدیوں ان کی زندگی جانوروں سے کچھ اچھی نہیں تھی بلکہ ان کی دم ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوستان میں گاندھی جی پہلے لیڈر ہیں جنھوں نے گاوں سدھار کے لئے زبردست مہم چلائی۔ آزادی کے بعد ان پچاس برسوں میں صرف اتنا کام ہوا ہے جو کوئی ہوش مند فلاحی حکومت دس سال میں آسانی سے کر سکتی تھی۔ آج پنچایت اداروں کے تحت کچھ کام ہو رہا ہے۔ اڈمنسٹریشن کی نظریں شہروں سے ہٹ کر دیہات کی طرف بہت کچھ ہو چکی ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ اور یونسکو UNESCO کے تحت تعلیم، صحت اور دیہات سدھار کے کام ہو رہے ہیں دیہات کی زندگی تیزی کے ساتھ کروٹیں لے رہی ہے۔ ایسے میں ہندوستان کا مسلم معاشرہ ہو

یا غیر مسلم، ان میں عورتوں کے ساتھ دوسرے اور تیسرے درجہ کا سلوک روا رکھا گیا ۔ آج اب خواتین اپنے حقوق کے منوانے کے لئے جدوجہد پر اتر آئی ہیں اور یہ جدوجہد کسی عملی، ترقیاتی اسکیموں کی کامیابی ہی سے نہ صرف غربت و قلاکت دور ہو سکتی ہے ی بلکہ ان ی میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا ہوگا ۔ "مردوں کی دنیا" انھیں قابل احترام مقام دینے پر مجبور ہو جائے گی ۔

ایک دیہاتی ترقیاتی تنظیم "PRODDU " (پرڈو ۔ بانگ سحر) سے تعاون کرتے ہوئے گاؤں کی ساری عورتوں کو پابند کیا گیا کہ وہ روزانہ اپنی محنت کی کمائی سے صرف ایک روپیہ بچت فنڈ میں جمع کروائیں ۔ حیرت کی بات ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس فنڈ میں دو لاکھ روپے جمع ہو گئے ۔ ڈسٹرکٹ کے عہدہ داروں اور اقوام متحدہ کی ایجنسیوں نے بھی مالی مدد دی ۔ اس فنڈ سے پیداواری کاموں کے لئے قرضے دیئے جانے لگے ۔ بورویل کی درستگی، سلائی مشینوں کی خریداری ایمبرائیڈری ورکس اور دوسرے ایسے ہی کاموں کے لئے قرضے دیتے گئے جس سے خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا اور بہت سے غربت کی سطح سے اوپر آگئے تعلیم بالغان کے علاوہ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام مشنری اسپرٹ کے ساتھ چالو ہو گیا ۔ "پرڈو" کی جانب سے ٹیچرس کو تنخواہیں دی جاتی ہیں ، اسکول خود گرام پنچایت چلاتی ہے ۔ گورنمنٹ کے وعدوں اور امداد پر ایک دن بھی یہاں کے لوگوں نے بھروسہ نہیں کیا وہ قدم اٹھا کر چلنے لگے ، اندھیرا دور ہوتا گیا، روشنی کی نئی راہیں سامنے آنے لگیں ، ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی ۔ ایک کے بعد دوسرے کام ہونے لگے ۔ آج کالوا میں پکی سڑکیں ہیں ، پینے کا پانی ، بجلی ، بورویل ، کھیتوں کی آبرسانی ، اور دوسرے سماجی بہبود کے کام " دیہات کے بے سہارا بوڑھوں کو " پیرانہ سالی " کے وظائف جاری کئے جا چکے ہیں محنت مزدوری کرنے والی عورتوں کے شیر خوار اور چھوٹے بچوں کی دیکھ

بھال کے لئے "ماں کی گود" AMMA VODI کے نام سے ایک سنٹر قائم کیا گیا ہے جہاں پر صبح سے شام تک چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے ۔ مائیں اس سنٹر پر بچوں کو لاکر نہیں پہنچاتیں بلکہ اس سنٹر کی عورتیں صبح میں گھر گھر جاکر بچوں کو لے کر آتی ہیں ۔ چند ماہ قبل محبوبنگر میں UNDP (اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام) کی جانب سے ایک ورکشاپ رکھا گیا تھا ۔ اس میں فاطمہ بی کو اپنے کاموں کی تفصیلات سنانے کے لئے کہا گیا ۔ یہ شرمیلی منکسر المزاج خاتون نے کہا

" میں نے کبھی یہہ سونچا بھی نہ تھا میں کبھی اپنے گھر کے دروازہ سے ایسے باہر نکل آؤں گی اور اتنے بڑے جلسہ کو مخاطب کروں گی ۔ میرے گاؤں کی آبادی میں زیادہ تر مسلم خاندان ہیں ۔ خاندانی روایات گوشہ پردہ سے باہر آنا بڑا مشکل ہے ۔ ہمارے پروگرام کی کامیابی ، ہماری ہمت افزائی کا باعث بنے تاکہ ہم زندگی کے حقائق کا سامنا کر سکیں اور اس طرح سماج میں تبدیلیاں لاسکیں ۔۔۔۔۔ یہہ تبدیلیاں غربت سے خود انحصاری ، پستی سے ترقی ، مردوں کی بالادستی سے خود اعتمادی کی طرف ہیں ۔۔۔۔۔"

گاؤں میں بچپن کی شادیاں قصہ ماضی ہوچکی ہیں ۔ وہ عورتیں جو اپنی ساری زندگی میں ناانصافیوں اور مردوں کے ظلم و جبر کا شکار رہ چکی تھیں وہ آج سب کی سب اپنی لڑکیوں کی پشت پناہی کے لئے کھڑی ہوچکی ہیں ۔ آجکل ان کی زبان پر ایک ہی جملہ ہے ۔ اب گاؤں کی ہر لڑکی پڑھی لکھی ہوگی ۔ نہ جہالت باقی رہے گی اور نہ بے عملی

اور کس میرسی کی زندگی ہوگی۔"

"کالوا" کی عورتوں کا کام اس ایک دیہات تک محدود نہیں، رہا۔ اطراف و اکناف کے دیہات میں اس حرکیاتی پروگرام کا پیام پہنچ چکا ہے۔ ان دیہاتوں میں نئی بیداری اور حرکت کی لہر دوڑ رہی ہے ضلع کرنول کے کلکٹر ڈاکٹر ملیشور راؤ نے فاطمہ بی کے نیویارک سے واپس ہونے کے بعد ان کے خیر مقدمی جلسہ کی تقریب میں کہا کہ PODHUDU LAKSHMI SAVING MOVEMENT (چھوٹی بچتوں کی تحریک) میں کرنول ڈسٹرکٹ ساری ریاست میں آگے ہے۔ اس اسکیم کے تحت چھ ہزار سے زائد فنڈ دیہات میں قائم ہوچکے ہیں۔ خاتون اراکین کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار ہوچکی ہے جنہوں نے (۹) کروڑ (۳۰) لاکھ روپیہ جمع کیا ہے۔ اقوام متحدہ اور دوسری تنظیموں کی جانب سے ۹ کروڑ (۷۰) لاکھ روپیہ کا سرمایہ اس تحریک کے شاخوں کو سرمایہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس بچت اسکیم سے خواتین کو پیدآوری کاموں کے لئے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ جس سے دیہی خاندانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوچکا ہے اور وہ غربت کی سطح سے اوپر آنے لگے ہیں پھر یہ اسکیم دیہات کی رضاکارانہ تنظیم ہے اس کا کوئی تعلق گورنمنٹ سے نہیں ہے۔

فاطمہ بی کی حرکیاتی قیادت(DYNAMIC LEADERSHIP) اور "" PRODDU کے پروگرامس کی کامیابی کی وجہ گاؤں کی عورتوں میں نیا حوصلہ پیدا ہوچکا ہے انھیں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوچکا ہے۔ آج وہ ہر شعبہ حیات میں، تعلیم، صحت، صفائی، آبادکاری، میں اپنا موثر رول ادا کر رہی ہیں۔ "کالوا" کی فاطمہ بیبیاں، ان سب کے لئے روشن چراغ ہیں جو ترقی اور تبدیلی کے لئے بے چین ہیں۔ "کالوا" آج عورتوں کی طاقت کا روشن مینار ہے، اور فاطمہ بی کی قیادت کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

علامہ اقبال نے " بانگ درا " میں " فاطمہ بنت عبداللہ " کے عنوان سے اس عرب لڑکی کی شان میں (۱۹۱۲ء) ایک نظم لکھی ہے جبکہ وہ طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی ۔ "کالوا" کی فاطمہ بی کا کام بھی جہاد زندگی میں ویسا ہی مبارک ہے اور شاعر مشرق کے یہ شعر اس پر بھی صادق آتے ہیں ۔

فاطمہ تو آبروے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دین کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

○○○

انجمن اسلام۔ ممبئی

کسی بھی انجمن، سوسائٹی یا جماعت کے قیام میں کوئی نہ کوئی بڑی با اثر شخصیت ہوتی ہے اس شخصیت کے کام اور پیام کی روح اسکے سارے اداروں میں رواں دواں رہتی ہے۔ سب اسی کے بانی یا اسی ایک سرچشمہ وجدان سے فیضان حاصل کرتے رہتے ہیں گو اس کا بانی باقی نہیں رہتا لیکن اس کے فلسفہ حیات کا فیض جاری رہتا ہے۔ یہ بجلی کا کرنٹ ہے جو نظر نہیں آتا لیکن ہزاروں بلب کو جگمگاتا رہتا ہے۔

شمالی ہند میں سرسیدؒ اور جنوبی ہند (بمبئی) میں بدرالدین طیب جی کی تعلیمی تحریکیں قریب قریب ایک ہی زمانہ میں شروع ہوئیں۔ انجمن اسلام بمبئی کا قیام ۲۱/ فبروری ۱۸۷۴ء کو عمل میں آیا اور سرسیدؒ کے مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد ۲۴/ مئی ۱۸۷۵ء کو رکھی گئی۔ اس طرح انجمن اسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ مسلمانان ہند کی تعلیم و ترقی کے لیئے جدید علوم کے سیکھنے کی ابتداء کرنے کا امتیاز علیگڈھ سے ایک سال پہلے ہی حاصل ہو گیا۔ لیکن سرسیدؒ کو مصلح قوم ہونے کے باعث جو شہرت اور عزت انہیں بعد کو حاصل ہوئی وہ بہت کم کسی کے نصیب میں آئی۔ کسی ہم عصر کا سارے ملک میں کوئی دوسرا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ بدرالدین طیب جی کا ہے۔

بدرالدین طیب جی پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جو پندرہ برس کی عمر میں اعلیٰ جدید تعلیم کے لیئے انگلستان گئے۔ پھر وہ بمبئی ہائیکورٹ کے پہلے ہندوستانی چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کے تیسرے صدر چنے گئے سرسیدؒ اور بدرالدین طیب جی کے لائف مشن میں باوجود مماثلت ہونے کے بعض

باتوں میں بنیادی اختلافات رہے لیکن ان دونوں کی پاک دلی پر کسی نے شبہہ نہیں کیا۔

(۱) سرسیدؒ انگلستان جاکر وہاں کے تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کیا اور وہ کیمبرج، آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے اقامتی کردار سے بہت متاثر ہوے۔ بدرالدین طیب جی نے انگلستان ہی میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

(۲) سرسیدؒ "اشراف" کے لیئے اعلیٰ جدید کالج کی تعلیم کے حق میں تھے کیوں کہ لیڈرشپ عام طور پر اونچے متوسط طبقہ سے ہی ابھرتی ہے۔ بدرالدین طیب جی پرائمری اور سکنڈری ایجوکیشن کے زبردست حامی تھے۔ عام مسلم طلبہ کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے بغیر وہ کالج کی تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔ وہ پودوں کی ابیاری جڑوں سے کرنے کے قائل تھے تاکہ یہہ پودے بڑھ کر پھول پتوں سے ہرے بھرے ہوں۔ جب یہہ سکنڈری ایجوکیشن تک پہنچ جائیں تو پھر کالج کی تعلیم کے لیئے خود بخود دروازے کھلتے جائیں گے۔

(۳) سرسیدؒ انگریزی ذریعہ تعلیم کے حامی تھے اور بدرالدین طیب جی طلبہ کی مادری زبان اردو ذریعہ تعلیم کے موئید تھے۔ چنانچہ انجمن اسلام کے ہزاروں طلبہ آج بھی اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

(۴) سرسیدؒ چاہتے تھے کہ مسلمان سیاست کے شور و شغب سے دور رہیں۔ ان کے سامنے غدر کے حالات تھے جو وہ آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بغیر تعلیم و تربیت کے اگر مسلمان سیاست میں عملی حصہ لیں تو پھر انھیں سنبھالنا آسان نہیں۔

" بدرالدین طیب جی مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے کے قائیل نہ تھے۔
۱۹۰۳ء میں "آل انڈیا محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس" بمبئی کے اجلاس کی صدارت کی اور

کہا۔" میں اس اصول کا پابند رہا ہوں کہ جہاں تک عام
پولیٹیکل معاملات کا تعلق ہے جن کا اثر مسلمانوں پر بلکہ تمام
سلطنت کے اور تمام فرقوں پر یکساں پڑتا ہے" مسلمانوں کو
دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیئے۔"
۔۔ مسلمانوں کی پستی کا اصل سبب مسلمانوں میں جدید
خیالات اور جدید علوم سے فیض رسانی کی خواہش بہت کم
پائی جاتی ہے۔

آج یہ الفاظ سو برس بعد بھی ہندوستانی مسلمانوں پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔
ہر بڑے انقلاب کے بعد تعمیری تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ علیگڈھ میں سرسیدؒ کی تعلیمی تحریک، طیب جی کی انجمن اسلام اور A.O.HUME نے "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں رکھی۔ ہر تحریک زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی ایک شاندار تاریخ میں تبدیل ہوتی گئی۔

انجمن اسلام کا دستور:۔

انجمن اسلام کا دستور بہت کچھ امریکن پریسیڈنٹ کے انتخاب اور اختیارات سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی GENERAL COUNCIL جنرل کونسل میں ۴۵ اراکین ہوتے ہیں جو دراصل ایک بااختیار جماعت یا SUPREME BODY ہے۔ یہی کونسل تین سال کے لیئے اپنے صدر کا انتخاب کرتی ہے اور صدر اسی کونسل کے سامنے

جوابدہ ہے ۔اس کا دوبارہ انتخاب ہو سکتا ہے ۔انجمن ۳ نائب صدور، دو جنرل سکریٹریز اور ایک خازن TREASURER اور مختلف اداروں کے ۱۴ BOARDS DIRECTORS کو پرسیڈنٹ خود ہی نامزد کرتا ہے ۔اس طرح صدر انجمن کے اختیارات بہت وسیع ہیں اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ وہ انجمن کے ۷۲ تعلیمی و فنی اداروں پر بورڈس کے نا کنٹرول رکھتا ہے ۔ کوئی یونٹ مرکزی نقطہ سے دور نہیں ہو سکتا ۔پرسیڈنٹ کے اختیارات کو دیکھتے ہوئے یہہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ " میر کارواں " ایسی ہی شخصیت ہو سکتی ہے جس میں تعلیمی، تنظیمی، اصلاحی، رہنمائی، قومی ہمدردی اور اخلاص کے سارے اجزا موجود ہوں ۔

انجمن کا تعلیمی سفر

انجمن اسلام ہندوستان کی واحد تنظیم ہے جس نے ۱۹۰۰ء میں چھوٹے بچوں کے لیئے کنڈر گارٹن طریقہ تعلیم کی ابتداء کی ۔۱۹۳۶ء میں پہلا گرلز اسکول قائم کیا گیا جس دو جماعتوں میں ۳۶ لڑکیاں پڑھنے آتی تھیں ۔۱۹۴۱ء میں اردو میڈیم گرلز سکنڈری اسکول کھولا گیا جس میں پہلے سال صرف دو لڑکیاں شریک ہوئیں ۱۹۴۷ء تک اس اسکول میں سات جماعتیں اور ۱۲ سکشن کھولے گئے ۔۱۹۴۶ء میں انجمن کے چار لڑکیوں کے اسکول کام کر رہے تھے ۔ ۱۹۸۰ء میں ریاست مہاراشٹرا میں انجمن نے پہلا HIGH SCHOOL OF COMMERCE کھولا جو بعد میں چل کر پالی ٹیکنک اور ڈگری کالج میں تبدیل ہو گیا جھاں انجنیرنگ میں ڈپلوما اور ڈگری کورسس کی اسناد دی جاتی ہیں ۔آج AKBAR PEER 3HOY COLLEGE OF COMMERCE & ECONOMICS میں 2500 طلبہ ڈگری کی سطح تک

تعلیم پاتے ہیں ۔اس کا الحاق بمبئی یونیورسٹی سے ہے ۔ ۱۹۴۷ء میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ URDU RESEARCH INSTITUTE پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے لیئے قائم کیا گیا اور اسی زمانہ میں حیدرآباد کے سجاد مرزا کا ایجاد کردہ اردو ٹائپ مشین کو اپنایا گیا " دیوان غالب " کا اردو ہندی ایڈیشن صابو صدیق پالی ٹیکنک کے " ادبی پرنٹنگ پریس " میں چھاپا گیا ۔ جس کو گورنمنٹ آف انڈیا کی وزارت اطلاعات و نشریات نے بہترین چھپائی پر پہلا انعام دیا ۔

آج انجمن اسلام کے ۷۲ تعلیمی و فنی اداروں میں ساٹھ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں جن میں طالبات اور خواتین کی تعداد ۲۲ ہزار ہے ۔اسکے دروازے سب کے لیئے کھلے ہیں اس کا ابتداء ہی سے سیکولر کردار رہا ہے جبکہ ابھی سیکولر کا لفظ عام نہیں ہوا تھا ۔ دو ہزار کے قریب ٹیچرس ، لکچررس اور پروفیسر ہیں ۔ ہر سال ۵ / سپٹمبر یوم اساتذہ ، کے موقع پر انجمن کی جانب سے ان سب کے لیئے شاندار لنچ کا انتظام ہوتا ہے اور اسی دن ۲۰ ، ۲۵ اساتذہ کو BEST TEACHER AWARD ایک ہزار ایک روپے کے چک کی شکل میں دیا جاتا ہے ۔ اس طرح انجمن اسلام کے تمام تعلیمی اداروں کے ٹیچرس کو سال میں ایک دوسرے سے ملنے ، سننے ، کھانے پینے اور تالیاں بجانے کا موقع ملتا ہے ۔ معلوم نہیں ایسی کوئی روایت ہندوستان کے کسی انجمن یا سوسائٹی میں بھی جاری ہے یا نہیں ۔ اس وقت انجمن کے ۸ کالجس میں ، انجینیرنگ ، ایجوکیشن ، یونانی طبیہ کالج ، فاصلاتی تعلیم کا کالج (COLLEGE OF DISTANT EDUCATION) COLLEGE OF HOME SCIENCE FOR WOMEN M.B.A چار POLY TECHNIC ، تین انسٹی ٹیوٹ ۵ لڑکوں اور لڑکیوں

کے لیئے جونیر کالجس ، سات BOYS HIGH SCHOOL اردو میڈیم ، ایک انگلش میڈیم ہائی اسکول ، پانچ گرلز ہائی اسکول ، چھ پرائمری اسکولس ایک ملک کا مشہور و معروف RESIDENTIAL PUBLIC SCHOOL- PANCHGANI- ہے ۔جھاں طلبہ کو لیڈر شپ کے لیئے تیار کیا جاتا ہے ۔ دو مسلم یتیم لڑکیوں کے یتیم خانے (MUSLIM GIRLS ORPHANAGES) ہیں جن میں پانچ سو یتیم لڑکیاں شریک ہیں ۔ دو دو لائبریری ، (۹) عدد ٹریننگ اور کوچنگ سنٹرس ہیں جن میں ALL INDIA CIVIL SERVICES کی کوچنگ بھی شامل ہے چھ عدد پبلک ہال PUBLIC HALLS دو HOSTELS ایک CATERING MANAGEMENT کورس بھی گورنمنٹ آف مہاراشٹرا کی جانب سے انجمن اسلام کی عمارت میں کھولا گیا ہے ۔ ہر ادارہ کی تفصیل کے لیئے ع ۔

"سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لیئے" ۔

معیار تعلیم :۔

کسی بھی ادارے کی ظاہری شان و شوکت ، عمارتیں اور INFRA ، -STRUCTURE- ہال ، لائبریری اور لیابریٹری سے ظاہر ہو جاتی ہے لیکن معیار تعلیم ایک ایسا پوشیدہ راز ہے جو ایک زنجیری سلسلہ کا نتیجہ ہے جسکو ہم مجموعی تاثر یا CUMULATIVE EFECT کہتے ہیں ۔یہہ زنجیر سات عناصر سے مربوط ہے ۔(۱) انتظامیہ ، (۲) اس کا مقصد یا فلسفہ (وہ کس نیت سے قائم ہوا ہے) (۳) انفراسٹرکچر INFRASTRUCTURE (۴) طلبہ کا سماجی پس منظر (SOCIAL -BACKGROUND)- (۵) ٹیچرس کی قابلیت (۶) سرپرستوں کی دلچسپی اور تعاون

(۷) پرنسپل کی شخصیت ۔اس زنجیر کی کوئی کڑی بھی کمزور یا بودی ہے تو اس کا اثر پبلک امتحانوں کے نتائج میں ظاہر ہو جاتا ہے ۔ کسی ادارے کے معیار تعلیم کے لیئے یہی بار پیما استعمال ہوتا ہے ۔ شیو سینا کے لیڈر اور منسٹر بھی اپنے بچوں کو انجمن اسلام کے اسکولوں میں شریک کرواتے ہیں ۔ حال ہی میں انجینرنگ کالج کا رزلٹ آیا ۔ یہہ بات باعث فخر ہے کہ انجمن اسلام کے انجینرنگ کالج کا ایک طالب علم بمبئی یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے اور پانچ طلبہ اسکی میرٹ لسٹ میں دوسرے اور تیسرے درجہ پر ہیں ۔

اوقافی جائیدادیں اور انجمن اسلام :۔

۱۹۴۶ء میں جناب سیف طیب جی نے جو گیارہ سال تک انجمن کے اعزازی سکرٹری تھے انجمن کے اساسی دستور میں ایک اہم ترمیم لاکر انجمن کے لیئے ان تمام اوقافی جائیدادوں کے ٹرسٹس TRUSTS کے متولی بننے کے لیئے راستہ صاف کر دیا جو اسلامی قانون کے لحاظ سے قائم کیئے گئے ہوں ۔ سیف طیب جی کی دور اندیشی قابل تحسین ہے جس نے انجمن کی رگ حیات میں نئی جان ڈال دی ۔ تقسیم ہند کے المناک حادثہ کے بعد بہت سے خیراتی اور فلاحی ٹرسٹس دم توڑ رہے تھے اور کوئی انھیں سنبھالنے والا نہیں تھا ۔ کئی ٹرسٹس ایسے تھے جو بخوشی انجمن اسلام کے حوالے کرنے پر راضی تھے ۔ ان میں دینی، تعلیمی، فلاحی اداروں کے علاوہ یتیم خانے بھی تھے ۔ بمبئی جیسے مرکزی تجارتی شہر میں اوقافی جائیدادوں کی مالیت بھی بہت زیادہ تھی ۔ ان سب کو انجمن نے اپنے قابو میں لے کر ان اداروں کو زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچالیا ۔ یہہ ایک ایسا زرّین کارنامہ ہے جو عام طور پر نظروں سے اوجھل ہے ۔ انجمن نے نہ صرف انھیں حاصل کیا بلکہ انھیں ترقی دے کر ان جائیدادوں کی آمدنی میں کئی

گنا اضافہ کر دیا اور یہہ سب آمدنی ملّت کے فلاحی کاموں میں کام آرہی ہے ۔اس وقت انجمن اسلام ۲۳ خیراتی ٹرسٹس (TRUSTS) کی متولی ہے ۔

بجٹ:۔

انجمن اسلام کا سالانہ بجٹ چھ کروڑ روپے کا ہے ۔یونیورسٹی اور گورنمنٹ نے انجمن کے تعلیمی اداروں کو مسلم اقلیتی تعلیمی اداروں کے طور پر تسلیم کرلیا ہے جس کی وجہہ حکومت مہارشٹرا کی جانب سے سالانہ معقول گرانٹ ملتی ہے ۔قوم اور ملت کے ہمدردوں کی جانب سے مالی امداد کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اوقافی جائیدادوں اور ٹرسٹس کی آمدنی سے انجمن کے سارے ادارے چل رہے ہیں ۔

عمارتیں:۔

اسلامی طرز تعمیر کی نمایاں جھلک انجمن اسلام کی قدیم اور جدید عمارتوں میں صاف نظر آئے گی ۔انجمن کے صدور اور اراکین نے نہ صرف طرز تعمیر بلکہ ہر کام میں اسلامی فن و فکر کو سمودیا ہے ۔ ۱۸۹۳ء میں انجمن اسلام کی عمارت دادا بھائی نوروجی روڈ جیسے مرکزی مقام پر تعمیر کی گئی ۔اس کے ۱۲۵ فٹ بلند مینار ۱۴ فٹ محیط گنبد اور خوش نما محراب، دلکش صناعی کی وجہہ یہہ ممبئی کی حسین ترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے بہت عرصہ پہلے اس راقم کو پہلی مرتبہ بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تو اس عمارت کو دیکھ کر اقبال کا یہہ مصرعہ زبان پر آگیا ۔ع ۔"تیرا منارہ بلند جلوہ گہ جبرئیل"

علامہ اقبال جب پہلی مرتبہ انگلستان جانے کے لئے بمبئی آئے تو وہ اس عمارت کی اسلامی فن تعمیر سے بہت متاثر ہوے اور اپنے کسی خط میں اس پر شکوہ

عمارت کا تذکرہ کیا ہے۔

شخصیات:۔

انجمن اسلام کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کے صدور اور اراکین میں ہوش مند، دردمند اور دوراندیش اصحاب کی ایک سنہری زنجیر ہے۔ کوئی انجمن ایسی نہیں ہے جس کو ایک صدی سے زائد عرصہ میں کبھی خزاں کا دور دیکھنا نہ پڑا ہو۔ ہندوستان کی سیاست ۱۹۲۰ء کے بعد سے بہت سے طوفانوں سے گزری ہے۔ آزادی ہند کے ساتھ ہندوستان کے مسلمان ناقابل قیاس مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے۔ ان سب قیامت خیز ہنگاموں سے انجمن کس طرح الگ تھلگ رہ سکتی تھی لیکن اس کے کارکنوں نے برابر طوفانوں میں اپنی کشتی کو سنبھال رکھا اور بحیرہ عرب میں غرقاب ہونے سے بچالیا اس ادارہ کو دیکھنے، آنے جانے، والوں میں بہت بڑی شخصتیں ہیں جن میں سرسید، پنڈت نہرو، محمد علی جناح، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، سیدنا طاہر سیف الدین جیسے بہت سے نام ہیں۔ دلیپ کمار اور انتولے انجمن کے اسکولوں میں پڑھے ہوئے ہیں۔

آخر میں چند جملے میر کارواں، ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا کے متعلق نہ لکھے جائیں تو یہہ مضمون ادھورا رہ جائے گا۔ وہ ۱۹۸۴ء سے آج تک ہر تین سال بعد متفقہ طور پر صدارت کے عہدہ پر منتخب ہوتے آئے ہیں۔ یہہ خود ان کی شخصیت کی پہچان کے لیئے کافی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ اتنے بڑے کارخانہ کو کیسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ جواب دیا کہ " میں کسی کے کوئی کام میں دخل نہیں دیتا۔ کوئی میرے پاس راست شکایت لے کر نہیں آتا۔ سب کو معلوم ہے کہ میں گھر پر کسی سے نہیں ملتا۔ صرف ہر بورڈ کے ڈائرکٹر سے میرا راست تعلق رہتا ہے" ہر جگہ اسحاق جمخانہ والا کی بڑی عزت

ہوتی ہے۔ہر ادارہ پر موصوف کا کنٹرول ہے۔جو بظاہر غیر محسوس ہے۔میں نے کہا۔

THE MANAGER IS A PERSON WHO APPEARS TO BE DOING NOTHING.

اسحاق جمخانہ والا کے ساتھ دو روز انجمن کے چند اداروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ساتھ رہنے سے کسی کی شخصیت کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے۔اقبال نے اپنی مشہور نظم مسجد قرطبہ میں مرد مومن کی خصوصیات بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ مبالغہ نہ سمجھو تو اس کی ایک جھلک اسحاق جمخانہ والا میں بھی مل جائے گی۔

تجھ سے ہوا آشکار بندہ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اسکے شبوں کا گداز
اس کی امیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہہ دلنواز
نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاکباز

نوٹ:۔

(اس مضمون کی تیاری میں کتاب "انجمن کے سو سال" مرتبہ سید شہاب الدین دسنوی صدر سے انٹرویو ذاتی مشاہدات اور کچھ لٹریچر سے مدد لی گئی ہے)

مدینہ ایجوکیشن اینڈ ولفیر سوسائٹی

ع ۔جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے۔

شہر حیدرا باد میں مدینہ ایجوکیشن اینڈ ولفیر سوسائٹی کے ساتھ عارف الدین کا نام جڑا ہوا ہے ۔ کسی ایک کا نام لیجئے دوسرا نام خود بخود زبان پر آجائے گا۔ کسی نے قیمتی انگوٹھی کا نام لیا ساتھ ہی ہیرے کے نگینہ کا خیال آگیا۔

"خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری" پٹنہ ہندوستان کی مشہور لائبریری ہے ۔ اس لائبریری کی جانب سے ہندوستان اور پاکستان کے اردو رسائل جو ایک برس کی مدت میں شائع ہوتے ہیں ان سب سے بہترین مضامین ، افسانے ، نظمیں وغیرہ کا انتخاب کر کے ایک رسالہ "اردو رسائل" کے نام سے شائع کیا جاتا ہے ۔ ۱۹۹۴ء کے رسالہ میں اس راقم کا لکھا ہوا ایک مضمون مدینہ پبلک اسکول کے "سوپر اسکول" (ایک منفرد تجربہ) SUPER SCHOOL کے عنوان پر صفحہ ۱۵۲ پر شامل ہو ہے جو "تہذیب الاخلاق" ماہنامہ سے لیا گیا ہے ۔یہاں پر یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس "سوپر اسکول" کا قیام جناب عارف الدین کے اندرونی جذبہ اور بے تابی کا مظہر ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ایسے ذہین طلبہ جن کا ابتدائی جماعتوں میں بہت غیر معمولی معیار رہا ہو ان کے لیئے اسکول ہی میں ایک جماعت (چھٹی جماعت سے) ایسی ہو جنھیں ابتداء ہی سے اچھی کوچنگ اور رہنمائی حاصل ہو تا کہ یہ آگے چل کر سنٹرل اور اسٹیٹ سیول سرویسز میں اپنا مقام حاصل کر سکیں دوسرے الفاظ میں انھیں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں لیڈر شپ کے لیئے تیار کیا جائے ۔اس مضمون میں چند باتیں ایسی رہ گئی

تھیں جن پر روشنی ڈالے بغیر مدینہ سوسائٹی کی پوری تصویر سامنے نہیں آسکتی۔

شاندار عمارتوں، اور فرنیچر کے درمیان عام طور پر تعلیمی معیار گم ہوجاتا ہے تعلیمی معیار کے لیئے پبلک امتحانات ہی بار پیما کا کام دیتے ہیں۔اس ادارہ کے ہر سال شاندار نتائج مدینہ پبلک اسکول، اور کالجس کے اعلیٰ ترین معیار کے مظہر ہیں۔ان نتائج کے پیچھے ٹیچرس کی ایک ٹیم کس طرح کام کرتی ہے وہی اہم ہے۔ جناب عارف الدین شاید حیدرآباد کے پہلے ماہر تعلیم ہیں جن کی نظر معیار تعلیم کو اونچا کرنے کے لیے ایک ریٹائرڈ لیڈی پرنسپل سریمتی لیشو دھادیوی کو ہمہ وقتی DIRECTOR OF STUDIES کے عہدہ پر مامور کیا ہے۔اور پھر ہر مضمون کے لیئے قابل سینئر ٹیچرس SUBJECT DIRECTORS کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔یہ اپنے اپنے مضمون میں ٹیچرس کے کام پڑھانے کے طریقے، ہوم ورک، ماہانہ ٹسٹ، امتحانات میں سوالات کا معیار، پرچوں کی جانچ وغیرہ جیسے امور پر دوستانہ فضاء میں نگرانی اور رہنمائی کا کام سال بھر جاری رکھتی ہیں۔ کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا پہلا جملہ بہت اہم اور معنیٰ خیز ہے۔

THE DESTINY OF OUR NATION IS NOW BEING SHAPED IN HER CLASS ROOMS.

لیکن عام طور پر کلاس روم ورک سے ہی غفلت برتی جاتی ہے۔ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسکول ایسا ہوگا جن کے پاس مضامین کے ڈائرکٹر، اور ڈائرکٹر آف اسٹڈیز، پھر سپروائزر آف اسٹڈیز کا کوئی عہدہ موجود ہو۔اب تو مدینہ سوسائٹی کے کام کو دیکھ کر آج کل کرسچین مشنری اور چند خانگی اچھے اسکولوں میں بھی ڈائرکٹر آف اسٹڈیز کے طور پر

کسی نہ کسی تجربہ کار پرنسپل، ٹیچر کو مقرر کیئے جانے کی روایت چل پڑی ہے۔ ہر ہفتہ دوپہر سے اسٹاف کونسل میٹنگ ہوتی ہے جس میں عارف الدین بحیثیت سکریٹری سوسائٹی شریک رہتے ہیں۔ اس میں طلبہ کے مسائل، تعلیمی پروگرامس، ٹیچرس کے مسائل پر کھل کر بات چیت ہوتی ہے اس طرح تعلیمی کام کے علاوہ تعلیمی ادارہ کے نبض کی رفتار، اتار چڑھاو کا بھی ٹھیک اندازہ ہوجاتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی ہمارے اکثر مدارس میں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں تعلیم کا کام چل رہا ہے لیکن تعلیم نہیں ہے جس کے لیئے یہہ ادارے قائم ہیں۔

نہرو آڈی ٹوریم اور سرسید ہال میں حیدآباد کے اہل ذوق و دانش کو ہندوستان کی مایہ ناز ہستیوں کو سننے اور کہنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ شاید ہی کوئی مہنیہ جاتا ہوگا جس میں یہاں کوئی نہ کوئی فنکشن نہ ہوتا ہو۔ ہندوستان میں بہت کم ادارے ہوں گے جھاں سیکولر، سیاسی، معاشی، مذہبی، تعلیمی اور سماجی مختلف موضوعات پر قومی سطح کے دانشور بات کرتے ہوں گے۔ یہہ اعزاز بہت کم تعلیمی سوسائٹیوں کو حاصل ہے مدینہ سوسائٹی کا سرسید میموریل لکچر اور گولڈ میڈل فنکشن تو یادگار ہوتے ہیں۔

سوسائٹی کی عمارتیں شہر میں صفائی ستھرائی کے لئے مشہور ہیں۔ کسی عمارت میں قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تازہ ہوا کا جھونکا چل رہا ہے یا پھر ایسا محسوس ہوگا کہ کوئی حسین دوشیزہ مسکراتی ہوئی استقبال کے لیئے کھڑی ہے۔

ان عمارتوں میں تین چھ سات منزلہ عمارتیں تو اوقاف کی ہیں۔ بارہ پندرہ برس پہلے یہہ عمارتیں محض کھنڈر کی شکل میں زبان حال سے کس مپرسی کا رونا روتی تھیں۔ انھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایسی عمارتیں مسلم اوقاف ہی کی ہوسکتی

ہیں ۔ویسے کروڑوں کی جائیدادیں آج بھی اوقاف کی یتیم ہیں ۔ لیکن عارف الدین کا بلاشبہ یہہ بڑا کارنامہ ہے کہ وہ ان جائیدادوں کو قانونی اور دوسرے جھگڑوں سے پاک وصاف کر کے نہ صرف حاصل کیا بلکہ ان جائیدادوں کو پندرہ بیس کروڑ روپوں کی عالیشان عمارتوں میں تبدیل کر دیا اور پھر انھیں تعلیمی و فلاحی اداروں میں تبدیل کر کے سارے ملک میں ایک ایسی مثال قائم کر دی جو ہر ریاست کے مسلمانوں اور بہی خواہوں کے لیئے لمحہ فکر ہے ۔ان کا خود کہنا ہے کہ اگر ملک کی ساری اوقافی جائیدادوں کا انتظام ٹھیک ڈھنگ سے ہو تو ہمیں حکومت کی طرف دیکھنا بھی نہ پڑے گا۔ہمارے سارے تعلیمی ، معاشی اور سماجی مسائل کو بہتر طور پر حل کرنے کے لیئے اوقافی جائیدادوں کی آمدنی کافی ہو سکتی تھی ۔

ہر بڑے کام کے پیچھے کوئی بڑے آدمی کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اس کا کام اس کو بڑا بنا دیتا ہے ۔ دنیا میں ایسے بھی بڑے آدمی ہوتے ہیں جن کا کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود ، تعلیم و ترقی کے کام کرنے کا جب کوئی بھی دردمند قدم اٹھائے گا اس کو ملت ہی کے لوگوں سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اگر مدینہ سوسائٹی کے خلاف بھی باتیں ہوتی ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ۔تعجب اس پر ہوتا ہے کہ اس کا اگر کوئی مخالف نہ ہوتا۔

> " زوال یافتہ قوموں کی ایک بڑی نشانی یہہ ہے کہ ان کے افراد میں حسد کا مادہ بہت بڑھ جاتا ہے وہ کسی کو کھاتا پیتا خوش یا ممتاز نہیں دیکھ سکتے ۔۔انھیں یہہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا کام کر کے نام حاصل کر لے خواہ وہ کام

انھیں کے فائدہ کا کیوں نہ ہو"۔

(سید حامد)

اگر جذبہ نیک اور عمل مخلصانہ ہے تو پھر اس کام میں غیب سے تائید ہوتی رہتی ہے آج مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی کا نام ملک کے طول و عرض میں مثال کے طور پر لیا جانے لگا ہے۔اس کی ترقی اور شہرت میں جناب عارف الدین کی شب و روز لگن، دردمندی، اخلاص، جذبہ خدمت، ذوق و شوق بلکہ دیوانگی کو دیکھتے ہوئے ملت کے ایسے ہی دیوانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جن کے کام کو نقش دوام نصیب ہوا ہے۔

مرد خدا کا عمل ، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات ، موت ہے اس پر حرام

ABOUT THE AUTHOR

* **MOHAMMED ISHAQ**, Renowned Educationist - M.A., M.Ed., Graduation (O.U.) 1948.

* Worked in Govt. Education Department for 33 years - as Head Master, Lecturer (Econ) in Govt. Degree Colleges, Principal of Govt. Intermediate Colleges - (13 Years) - RETIRED - 1983.

* Founder Principal of First two Muslim Minority Colleges of Education in Andhra Pradesh.

1. Al-Madina College of Education, Mahabubnagar - 1983-84.

2. Sultanul-Uloom College of Education (Now - Ghulam Ahmed College of Education), Banjara Hills, Hyderabad - 1984-88.

3. Principal Indian Embassy School Al-Jubail (Kingdom of Saudi Arabia) - 1989-1994.

4. Education Adviser, Mesco, Hyderabad.

5. Member of Inspection Team for Pre-Examination Minority Coaching Centres - Andhra Pradesh. Appointed by the Ministry of Social Justice & Empowerment, Govt. of India, New Delhi.

6. Representative Member of Inspection Team - Moulana A.Kalam Azad Education Foundation, New Delhi.

7. As a Social work constructed 26 houses for the poor in a slum area raising funds privately and with the financial help of Municipal Corporation - Hyderabad - 1983-85.

8. Vice President - All India Educational Movement - New Delhi.

9. Attached to several social and Educational organisations.

10. Author of 4 books, closely related to practical aspects of Education.

(Address on First inside page)
